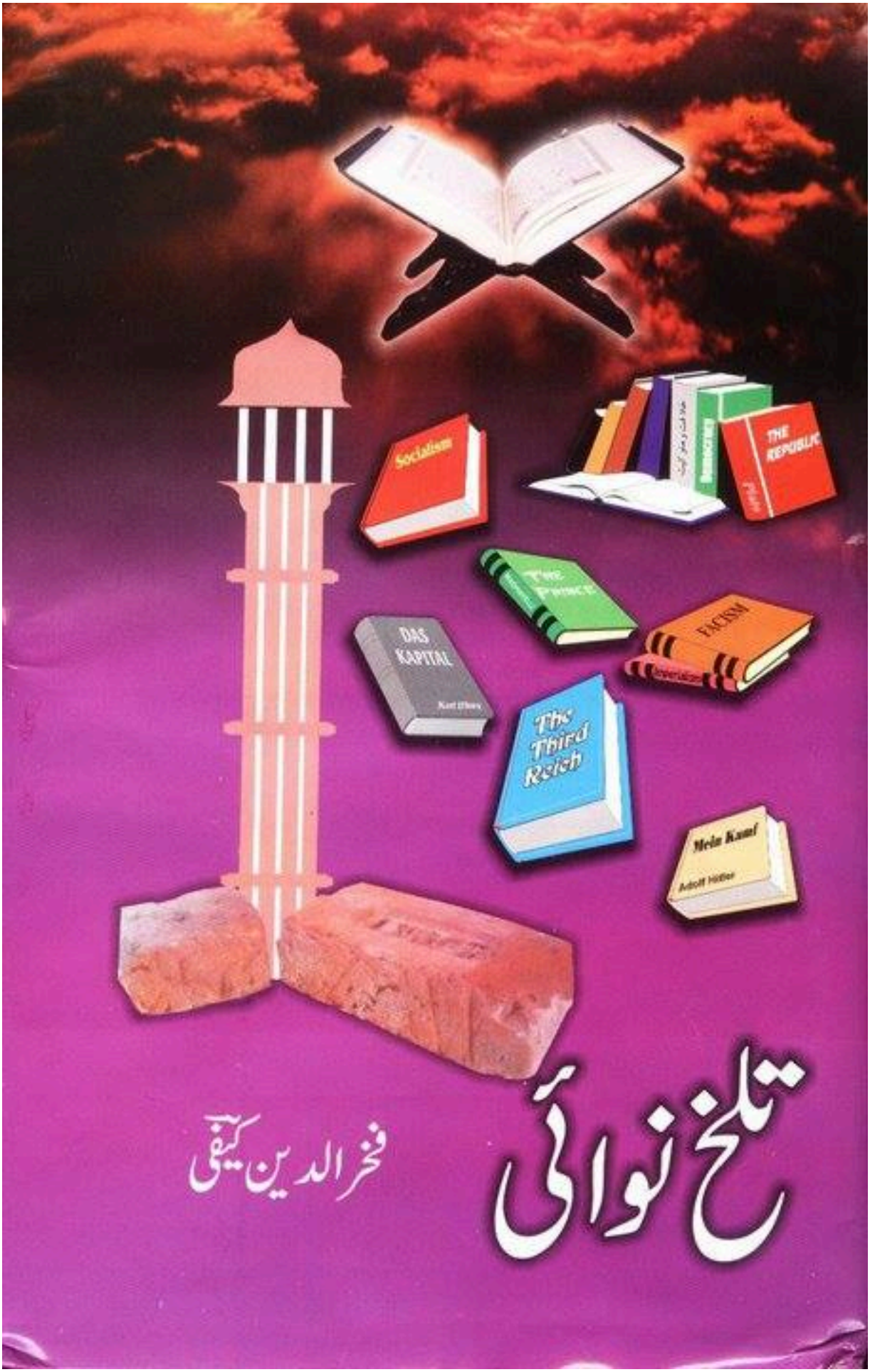


تلخ نوائی

فخر الدین کیفی

پتہ نہیں کیوں؟۔۔۔

اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ ہم کسی دن غیر شعوری طور پر کوئی ایسی حرکت یا بات کر جاتے ہیں کہ جب اسکا شعوری احساس ہوتا ہے تو شرمندہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کی تاویل پیش کرنے سے بھی قاصر ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے بھی مشاہدے میں آیا ہو کہ کبھی کبھی ہمارا ذہن کسی ایسے گانے کی گردان شروع کر دیتا ہے جس کے بول نہایت بے ہودہ ہوتے ہیں۔ یہ ہی نہیں بلکہ یہ گردان باوجود شعوری کوشش کے رکتی نہیں اور تمام دن جاری رہتی ہے۔ اگر کوئی پسندیدہ گیت یا نغمہ ہو تو بات سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن ایسا گیت جس کے بولوں سے ہی شدید نفرت ہو، وہ لاشعور میں بس جائے تو پھر اس کی کیا توجیہ پیش کی جاسکتی ہے۔ ایک دفعہ ایک ایسا ہی بے ہودہ گیت جس کے بول تھے ع۔

گھونگھٹ نکالوں یا گھونگھٹ میں ڈالوں
سیاں جی کا کہنا میں مانوں کہ ٹالوں

ہمارے ذہن پر غیر شعوری طور پر قابض ہوگیا۔ اب ہم لاکھ اس کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے رہے مگر وہ ایسا چمٹا کہ پورا دن وہی گنگناتے گذرا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ دوسری صبح ہم سو کر اٹھے تو میدان، معاف کرنا، ذہن صاف تھا۔ یہ ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی کوئی پرانی بات، شعر، جملہ، لطیفہ یا نعرہ نہ جانے کیوں ہمارے تحت الشعور سے نکل کر شعور کے پردے پر دستک دینے لگتا ہے۔ کبھی تو اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس کا محرک، کوئی حال ہی میں رونما ہونے والا واقعہ یا حادثہ ہے۔ ہاں یہ اور بات کہ اکثر اُس پرانے شعر، یا لطیفے کا اِس واقعہ سے تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لمبی چوڑی تمہید کا مقصد دراصل یہ ہے کہ حال ہی میں دو ایسے واقعات ہوئے ہیں جن کی وجہ سے ہمیں ۵۰، ۶۰ سال پرانا یا بچکانہ لطیفہ یاد تو آ گیا لیکن، پتہ نہیں کیوں؟ سمجھ نہیں آتا کہ اس لطیفے کا ان واقعات سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ بہر حال پہلے لطیفہ سنا دیتے ہیں پھر وہ واقعات جن پر یہ یاد آیا۔ پاکستان بننے کے بعد لوگوں کی عجیب ذہنی کیفیت تھی بھارتیوں اور

پاکستانیوں میں ایک دوسرے کے لیئے نفرت عروج پر تھی جس کا اظہار ہر ہر طریقے سے ہوتا تھا۔ ۱۹۵۰ کی دہائی میں مندرجہ ذیل لطیفہ ہر زبانِ زدوعام تھا۔

واقعہ ہے کہ ایک بڑی کشتی میں ساٹھ ستر مسافر سفر کر رہے تھے۔ انجن میں کچھ خرابی ہوگئی اور لانچ ہچکولے لینے لگی۔ کپتان نے اپنے عملے سے (جس میں ایک امریکن، ایک رشین، ایک پاکستانی اور ایک بھارتی تھا) کہا کہ کشتی میں وزن زیادہ ہے اس لیئے وزن کم کرنے کے لیئے آپ میں سے کوئی قربانی دے اور کود کر کشتی کو ڈوبنے سے بچالے۔ یہ سن کر امریکن اٹھا اور 'ان دا نیم آف امریکہ' (in the name of America) کہہ کر کود گیا۔ رشین بڑا خفیف ہوا لیکن جلد ہی اسے بھی موقع مل گیا جب کپتان نے مزید قربانی مانگی۔ رشین اٹھا اور 'ان دا نیم آف رشیا' کہہ کر وہ بھی کود گیا لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ کپتان نے کہا ایک اور قربانی چاہیئے یہ سن کر بھارتی اور پاکستانی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے حتیٰ کہ کپتان کو دوبارہ کہنا پڑا کہ شرم کی بات ہے آپ اپنے ملک کا نام روشن نہیں کرنا چاہتے۔ یہ سن کر پاکستانی، 'پاکستان زندہ باد' کا نعرہ لگاتے ہوئے اٹھا اور بھارتی کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔۔ اپنے ملک کا نعرہ بھی بلند ہوگیا اور جان بھی بچ گئی۔ یہ تھا وہ لطیفہ جو ہمیں اس رات پتہ نہیں کیوں یاد آیا جس رات ہم نے ٹی وی پر ڈاکٹر اے۔ کیو۔ خان صاحب کو قوم سے انگریزی میں معافی مانگتے اور چودھری شجاعت کو یہ کہتے سنا کہ ڈاکٹر صاحب نے آج معافی مانگ کر قوم پر دوسرا احسان کیا ہے۔ دوسری بار یہ لطیفہ ہمیں پھر یاد آیا جب ہم نے ٹی وی پر سنا کہ پاکستانی ٹیم کی شکست کے بعد غیر ملکی کوچ باب وولمر نے خوکشی کر لی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد تو ایسی کسی خودکشی کی اطلاع نہیں آئی تھی۔ ان واقعات کا اس لطیفے سے کوئی تعلق تو نہیں ہے لیکن یہ ہمیں دونوں بار یاد آیا۔۔

پتہ نہیں کیوں؟۔

۲۸ مارچ ۲۰۰۷ء

(نوٹ: یہ مضمون جس وقت لکھا گیا اس وقت تک خبر یہ ہی تھی کہ باب وولمر نے خودکشی کی ہے)

جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا۔۔۔

ہم اکثر فلمی عدالتوں میں دیکھتے اور سنتے آئے ہیں کہ گواہ یا ملزم کٹہرے میں آتا ہے اور پھر اس کا ہاتھ اسکی اپنی مقدس کتاب (بائیبل، گیتا، یا قرآن مجید) پر رکھ کر یہ الفاظ دہرانے کو کہا جاتا ہے۔۔'میں جو کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا' اور وہ شخص بغیر کسی تردّد کے یہ الفاظ دہرا دیتا ہے۔اس کے بعد جھوٹ کا وہ طُو مار باندھتا ہے کہ الامان والحفیظ۔۔۔۔! جھوٹی گواہیوں کے بھی بڑے قصّے ہیں۔ایک ہم سے بھی سن لیجئے۔۔۔ایک پیشہ ور (Professional) گواہ، جھوٹی گواہی دینے میں بڑی مہارت رکھتا تھا لوگ اچھے معاوضے پر اسکی خدمات حاصل کرتے۔اور وہ جھوٹی قسمیں کھا کر بھی بے مزہ نہ ہوتا۔اپنے اس کام میں اسکی مہارت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اب وہ پیشی سے پہلے مقدمے کے بارے میں سننا بھی گوارہ نہ کرتا۔یوں سمجھئے کہ عدالت میں برجستہ (Spontanious) جوابات دیتا۔اور کامیاب بھی رہتا۔ایک دفعہ ایک سائل نے اس کو گواہی کے لیئے کہا۔۔فیس طے ہوگئی۔سائل نے وقوعے کی تفصیل بتانا چاہی مگر اس نے ٹال دیا اور کہا کل عدالت میں ملاقات ہوگی، اس وقت فرصت نہیں ہے، کچھ اور سائل بھی آنے والے ہیں۔میں معاملے کو دیکھ لوں گا۔۔۔خدا حافظ۔۔دوسرے دن عدالت نے اس سے جب سوالات کیئے تو وہ سمجھا کہ کسی لڑکی کی گمشدگی کا معاملہ ہے۔مجسٹریٹ نے پوچھا 'تم نے خود دیکھی تھی'۔جواب آیا 'جی سرکار'۔۔سوال ہوا 'کیسی تھی'۔

جواب تیار تھا 'اچھی خاصی سرکار'۔۔

'بتا سکتے ہو کتنی بڑی تھی'۔پریشانی عیاں تھی۔مگر کہا 'جی کیوں نہیں'۔تو بتاؤ کتنی بڑی تھی'۔اب سٹپٹایا اور اور اپنا ایک ہاتھ زمین سے تقریباً چار ساڑھے چار فٹ پر رکھ کر مجسٹریٹ کی طرف دیکھا۔۔مجسٹریٹ نے حیرت سے کہا 'کیا؟ مرغی اتنی بڑی؟' بڑے اطمینان سے فوراً دوسرا ہاتھ پہلے ہاتھ کے نیچے لاتے ہوئے گویا ہوا 'نہیں سرکار، دوسرا ہاتھ تو لانے دیجئے' تو دیکھا آپنے کہ لوگ کیسے جھوٹا حلف اٹھا لیتے ہیں اور بظاہر ان کا کچھ نہیں

بگڑتا۔۔ بظاہر اس لیئے کہ جھوٹا حلف اٹھانے کے ایسے نقصانات بھی ہوتے ہیں جنکا ہمیں علم ہی نہیں ہوتا۔ ہم تو صرف مادّی نفع نقصان کو ہی نفع یا نقصان سمجھتے ہیں۔کوئی موزی بیماری، بگڑی ہوئی نافرمان اولاد، بد کردار شوہر، بدزبان بیوی یا کوئی اور ذہنی یا جسمانی پریشانی بھی تو ایک طرح کا عذاب ہی ہے جو کسی کی حق تلفی، جھوٹ، یا بے ایمانی کی پاداش میں ہم پر ہوتا ہے۔۔خیر یہ تو ہوئی فلموں اور لطائف کی باتیں لیکن ایک ایسا واقعہ بھی ہے جس نے ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔علی سردار جعفری روڈ، گلشن اقبال کراچی کا واقعہ ہے کہ ایک پان کی دوکان پر پیسوں کے لین دین پہ جھگڑا ہو رہا تھا۔گاہک کہہ رہا تھا کہ اس نے پچاس کا نوٹ دیا ہے اور دکاندار بضد کہ کوئی نوٹ نہیں دیا۔بات ہاتھا پائی تک پہنچنے لگی تو کسی نے حلف اٹھانے کا مشورہ دیا۔ دوکاندار فوراً راضی ہوگیا، گاہک پہلے تو ہچکچایا۔پھر راضی ہوگیا۔قرآن مجید لانے کا کہا گیا۔کسی نے کہا سامنے کتابوں کی دکان ہے وہاں سے عاریتاً لے لیتے ہیں۔مگر ایک بزرگ فرمانے لگے 'نہیں زندہ قرآن ہونا چاہئے' سب کو حیرت ہوئی 'کیا مطلب؟'۔۔فرمایا 'ایسا قرآن جو روز آنہ پڑھا جاتا ہو، جزدان میں بند طاق پر رکھا ہوا نہ ہو'۔بات سمجھ نہ آئی لیکن کسی نے مسجد سے منگوانے کا مشورہ دے دیا۔مسجد سے قرآن مجید منگوایا گیا اور اس شخص نے حلفاً کہا کہ اسنے پچاس کا نوٹ دکاندار کو دیا تھا۔یہ سن کر دکاندار نے خاموشی سے پچاس کا نوٹ اس کے حوالے کر دیا۔اور وہ شخص نوٹ لیکر وہاں سے چلدیا۔لوگ ابھی خوش ہو ہی رہے تھے کہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا گیا کہ روڈ پر بریک چرچرانے کی آواز گونجی اور سب نے دیکھا کہ وہی شخص ویگن کی زد میں آکر بری طرح زخمی ہوگیا ہے۔اسے امبولنس میں لے جایا گیا۔پھر معلوم نہیں وہ بچا یا نہیں۔تو یہ ہے وہ واقعہ جس نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا ایسا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا کہ عدالتوں میں بھی ایسے ہی زندہ قرآن مجید رکھے جائیں جنہیں کوئی پڑھتا بھی ہو۔۔بلکہ زندہ قرآن مجید ٹی وی اسٹیشنوں کو بھی دیئے جائیں اور ٹی وی ٹاک شوز میں شرکاء کے ہاتھ پر رکھ کر یہ کہلوایا جائے کہ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا۔۔۔ٹی وی پر اس لیئے کہ سنا ہے کہ پہلے شیطان عدالتوں میں جا کر گواہوں سے جھوٹ بولنے کی تربیت حاصل کرتا تھا مگر اب گھر بیٹھے ٹاک شوز میں وزرا کے بیانات سے استفادہ کر رہا ہے۔

اسکے علاوہ اسمبلیوں کے ممبرز، وزیراعظم، صدر اور دوسرے تمام اہم محکموں کے سربراہوں کے لیئے

بھی ضروری کر دیا جائے کہ وہ حلف قرآن مجید پر ہی اٹھائیں کہ وہ آئین کی پاسداری کریں گے۔اس طرح آئین کی شق نمبر 6 کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ ہر آئین سے ردگردانی کرنے والے سے اللہ تعالی خود نمٹ لیں گے۔ کیونکہ اب تک تو ہم نے اس شق پر عمل ہوتے نہیں دیکھا۔

۳۰ مارچ ۲۰۰۷ء

قومی ہیروز۔۔۔۔۔۔

بھلا ہو ہمارے جیمنی 'Gemini' ہونے کا جسکے بارے میں علم ہوا کہ یہ لوگ رومانٹک (Romantic) ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ہمارے رومینٹک ہونے میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں کیونکہ جیمنی ہونے کے ناطے ہمارے دل پھینک ہونے میں ہمارا کیا دوش۔ اب چونکہ جیمنی ہیں اس لیئے ہر خوش شکل، خوش گلو، خوش لباس ہمارے دل میں بس جاتے ہیں۔ جیمینی ہونے کی وجہ سے ہماری توجہ اس غزل نے اپنی طرف مبذول کرالی۔ ع

؎ یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بُت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے

خوبصورت الفاظ، خوبصورت آواز، خوبصورت ادائیگی ہی کافی تھی لیکن جب گلوکارہ کو دیکھا تو "singer, not the song" کے مصداق مونہہ سے بے اختیار نکلا۔ ع

؎ 'ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں '

اور ہم بقول شخصے سودائی ہو گئے۔ کہاوت ہے کہ مجنوں کو لیلیٰ کا کتا بھی عزیز تھا تو ہمیں اس گلوکارہ کا شوہر کیوں نہ بھاتا۔ ہم بھی یتیم بازاری کے پروگراموں سے محظوظ ہونے لگے یہ گلوکارہ کا اعجاز تھا کہ ٹی وی نے اس شخص کی ہمت افزائی کی اور زبردستی بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ ورنہ اس جیسے لاکھوں لوگ ٹی وی کے چکر ہی لگاتے رہ جاتے ہیں۔ ہمیں اس 'Mediocre' کی کمپیرنگ قطعی پسند نہ تھی کیونکہ اس میں پنجاب کے میراثیوں کا رنگ نمایاں ہوتا تھا، لیکن ہم بھی دل کے ہاتھوں مجبور تھے بالکل ویسے ہی جیسے ٹیوی کے اربابِ اقتدار۔۔ جنہوں نے شائد صرف گلوکارہ کی خوشنودی کے لیئے اس جیسے مسخرے کو ٹی وی پر پروگرام دینا شروع کر دیئے۔ ہمیں پورا یقین ہے اس میں اسکی بیوی کا کوئی عمل دخل نہ رہا ہوگا۔ ٹیوی والوں نے اپنے طور پر یہ کارنامہ سرانجام دیا ہوگا۔ آپ نے بھی ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اپنے پروگراموں میں یہ شخص خود کو نمایاں رکھنے کے لیئے کیا کیا جتن نہیں

کرتا تھا اور میزبان ہونے کے باوجود مہمانوں کی ہتک، بڑے ہی بھونڈے انداز میں کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ اس ہی شخص نے ہماری ایک بہت ہی معتبر اور معزز شخصیت پر جس طرح کیچڑ اچھالی ہے وہ اس ہی جیسے ضمیر فروشوں کا خاصہ ہے۔ کیا خوب کہ

؎ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

الزام لگایا کہ چیف جسٹس نے اپنے بیٹے کو نوکری دلوائی۔ گویا اسے نہیں معلوم کہ خود اس کو ٹیوی پر بیوی کی سفارش کے بغیر ہی پروگرام مل گئے تھے اور بیگم کو علم ہی نہ تھا۔ ایک اور الزام کہ آنریبل چیف جسٹس کو گاڑیوں اور سیکیوریٹی گارڈز کے جلوس میں چلنے کا بہت شوق تھا۔ اس دعوے کی قلعی تو عباس اطہر نے اپنے کالم میں اس 'so called' جلوس کی تصویر شائع کر کے کھول دی۔ تصویر میں ایک پائلٹ کار کے علاوہ دو پولس وین کی معیت میں ملک کے تیسرے پلر، یعنی جوڈیشری کے سربراہ کی کار نظر آ رہی تھی۔ ایسے جلوس تو ہم تقریباً روز آنہ ہی دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم سب نے ہی نوٹس کیا ہے کہ یہ شخص خود کو نمایاں رکھنے کا شوقین ہے۔ اور یہ شوق اسے لے ڈوبا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ چیف جسٹس کے خلاف لکھ کر وہ کوئی مقام حاصل کر لے گا۔ لیکن الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ شہرت کے بھوکے ہونے کا الزام تو چوراہے پر بیٹھنے والے ایک کالم نگار نے بھی ہمارے ایک اور قومی ہیرو پر لگایا تھا۔ بقول اس کالم نگار کے مسلمانوں میں کوئی (genuine) سائنٹسٹ پیدا نہیں ہوا اور یہ کہ ہمارا قومی ہیرو ڈاکٹر قدیر نقلی سائنسداں ہے جو شہرت کا بھوکا بھی ہے۔ قربان جایئے۔ ع

؎ 'اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا'

اگر لفظ 'جہالت'، 'سادگی' کا ہم وزن ہوتا تو ہم اس مصرع میں ترمیم کر دیتے۔ شائد اس کالم نگار نے میٹرک بھی نہیں کیا ورنہ اسے معلوم ہوتا کہ کیمسٹری الجبرا اور علم فلکیات مسلمانوں کی مرہونِ منت ہیں، یہ اور بات کہ سائنس کی کتابوں میں مسلمانوں کا نام اس طرح لکھا گیا ہے کہ وہ بھی غیر مسلم نظر آتے ہیں، وہاں تو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ بھی "Moses & Jesus" ہو جاتے ہیں۔ حکیم اجمل خاں کی بلڈ پریشر کی بنائی ہوئی دوا بھی ملٹی نیشنل کمپنی میں اجملین کی بجائے ازمیلین (Ismelin) ہو جاتی ہے۔ بہر حال ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہم جس شخصیت کو اپنا ہیرو مانتے ہیں اس پر اس قسم کے جو کر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ہم نے صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم کو اپنا

ہیرو مانا تو انٹلکچول 'Intellectuals' اور موڈرن لوگوں نے ان کو لٹیرا گردانا۔ پھر ہم نے ٹیپو سلطان اور نواب سراج الدولہ کو آزادی کا سپاہی کہا تو انہی انٹلکچول نے کہا کہ انہی حضرات کی وجہ سے آج مسلمانوں کو یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔ اگر یہ حماقت نہ کرتے اور انگریزوں سے مل جاتے تو ہندو ہمارے غلام ہوتے۔ قائدِ اعظم اور علامہ اقبالؒ کو پسند کیا تو کہا گیا کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو مسلمانوں کی طاقت تقسیم نہ ہوتی۔ گویا پاکستان بننے سے پہلے، انگریزوں کے زیرِ اقتدار مسلمان باعزت زندگی گزار رہے تھے۔ ہماری بدقسمتی کہ ہم اپنے ان قومی ہیروز میں سے کسی سے بھی نہ مل سکے۔ لیکن موجودہ دور کے ان دونوں ہیروز سے جن کے قدم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، چاہے لمحے بھر کو سہی، مگر مل چکے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے ہماری ملاقات اتفاقیہ طور پر اسلام آباد سے واپس آتے ہوئے جہاز پر ہوئی۔ ہم کراچی ائرپورٹ پر جہاز کی اکانومی کلاس سے نکل رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ہم نے اضطراری طور پر ہاتھ اٹھا کر سلام کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف سلام کا جواب دیا بلکہ آگے بڑھ کر ہاتھ بھی ملایا۔ ان کی انکساری دیکھئے کہ رعونت سے مونہہ پھیرنے کی بجائے ہم سے جھک کر مصافحہ کیا۔ دوسرے کی دلیری دیکھئے کہ جب بلوچستان کی ایک اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن نے نیشنل کالج آف ٹیکسٹائل انجینئرنگ فیصل آباد کے پرنسپل پر مقدمہ کر دیا کہ انہوں نے بلوچستان کے کوٹے پر چھ ایسے طلباء کو داخلہ کیوں دیا جو کوئیٹہ ڈومیسائلڈ تو تھے لیکن ان کی سفارش اس آرگنائزیشن نہیں کی تھی۔ اب چونکہ صوبائی و فیڈرل گورمنٹ اور سیاسی تنظیموں کا جھکاؤ بھی طلبا تنظیم کی طرف تھا اس لیئے صورتِ حال کافی دلچسپ اور پیچیدہ ہو گئی تھی۔ ہر کسی کی نظر اس مقدمہ کی طرف تھی کہ دیکھیں کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ کہیں جج صاحبان دباؤ میں تو نہیں آ جائیں گے۔ یہ ہی دیکھنے کے لیئے ہم بھی بلوچستان ہائی کورٹ میں موجود تھے۔ چیف جسٹس بلوچستان ہائی کورٹ کی سربراہی میں مقدمے کی کارروائی ہو رہی تھی۔ اسطرح ہمیں ایک بہادر منصف کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ ہر کوئی سمجھ رہا تھا کہ فیصلہ کالج کے خلاف اور طلبا تنظیم کے حق میں ہوگا لیکن جسٹس افتخار چوہدری کے فیصلے نے تاریخ رقم کر دی اور ہر قسم کا دباؤ مسترد کر دیا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ ایسے شخص پر یہ بھونڈے الزامات۔۔ ؎ ''کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتے ہیں''۔۔

؎ ۳۱ مارچ ۲۰۰۷ء

میڈیا، سائنس اور ہم

بچپن میں ایک فلم دیکھی تھی 'The Thief of Bhagdad'، جس میں فلم کے ہیرو صابو کو جو بغداد کا ایک چور تھا، سمندر کے کنارے ایک بوتل ملتی ہے جسے وہ کھولدیتا ہے۔ بوتل میں سے دھواں نکلنا شروع ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک جن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جن صابو کو قتل کرنے کے درپے ہوتا ہے لیکن صابو اسے بیوقوف بنا کر، اپنی حکمتِ عملی سے دوبارہ بوتل میں بند کر دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ صورت ہمارے الیکٹرونک میڈیا کی ہے جو جن کی طرح باہر تو آ گیا ہے لیکن اب کسی کے باپ سے بھی بند نہیں ہوگا۔ کیونکہ بوتل والا جن صابو کی وجہ سے آزاد ہوا تھا اور دوبارہ بند بھی اس ہی کی ترکیب سے ہوا تھا۔ لیکن میڈیا کے جن کی آزادی کسی کی مرہونِ منت نہیں بلکہ درحقیقت یہ وقت اور حالات کے عین مطابق (Circumstantial) ہے۔ اس لیئے اسے کوئی ختم بھی نہیں کر سکتا۔

آج اگر کیبل پر پہرے بٹھا بھی دیئے جائیں تو سیٹیلائٹ، ڈش انٹنا، موبائل فون، انٹرنیٹ کو کون روک سکے گا۔ آج 'SMS' پر ایسے ایسے بیہودہ لطیفے آتے ہیں جنہیں پڑھنے کے لیئے ہمیں کانوں میں انگلیاں ڈالنی پڑتی ہیں کہ کوئی غلط بات کانوں میں نہ پڑ جائے۔ اس سارے قصّے میں لطیفہ یہ ہے کہ ہمارے وزرا بڑے طمطراق سے میڈیا کو آزادی دینے کا دعویٰ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں، لیکن اس دعوے کی نفی ہوتے ہوئے ہم تقریباً روزانہ ہی ٹی وی کے ٹاک شوز میں دیکھتے ہیں۔ انفارمیشن کی بجائے ڈس انفارمیشن کا یہ حال ہے کہ ایک انفارمیشن منسٹر محمد علی درانی کا نام ہی 'ایم۔اے۔غلط بیانی' پڑ گیا تھا جیسا کہ ہم نے کہا کہ اب اس جن کو بند کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ کیونکہ اس جن کو قابو کرنے کی کوئی ترکیب سمجھ نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے کہ آج ابنِ صفی ہم میں نہیں رہے ورنہ ہم انکے ذریعے زیرو لینڈ کے سائینسدانوں سے 'زمین کے بادل' کے طرز پر کوئی چیز بنوا لیتے جو ہمارے ملک میں باہر سے درآنے والی خبروں کو روک دیتی۔

اس کے علاوہ ہم نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو نظر بند کر کے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہی ایک ایسی شخصیت ہیں جو کوئی ایسی چیز ایجاد کر سکتے ہیں جو سیٹیلائٹ سمیت تمام دیگر الیکٹرونک آلات کو جام کر سکے۔ اب حکومت ان سے استفادہ نہ کرنا چاہے تو کسی کا کیا دوش۔ ڈاکٹر صاحب کی قابلیت اس سے ہی عیاں ہے کہ میزائل غوری کے بعد جو بھی اڈیشن ہو رہے ہیں وہ اس ہی کی Base میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ہو رہے ہیں ڈاکٹر صاحب کے بعد ہمیں تو کوئی ایسا پاکستانی سائنسدان نظر نہیں آتا جو یہ کارنامہ کر دکھائے۔ ہمارے پاس تو ہود بھائی جیسے لیکچرر رہ گئے ہیں جو ٹی وی پر پاکستانی نیوکلیر ٹیکنولاجی اور ڈاکٹر قدیر خان کے خلاف ہرزہ سرائی ہی کر سکتے ہیں۔ اور جنہیں یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ ہمارا ایٹم بم غلط ہاتھوں میں جا سکتا ہے۔ ایسے روٹی کمانے والے لیکچررز سے کسی ایجاد کی امید نہیں کی جا سکتی ہاں ایک آسان طریقہ میڈیا کے جن کو قابو کرنے کا ہے۔ اس طریقے سے نہ صرف ہم اس جن سے بے خوف ہو سکتے ہیں بلکہ دنیا میں سربلند اور آخرت میں سرخرو بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیئے تھوڑی سی 'moral courage' کی ضرورت ہے۔ بس ہمیں آئین اور قانون کی پاسداری کرنی ہوگی۔ ایمانداری اور راست گوئی کو اپنانا ہوگا۔ جھوٹے وعدوں اور معاہدوں سے پرہیز کرنا ہوگا۔ پھر دیکھیئے یہ میڈیا ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ ہمارے یہ حکمران بھی کہہ سکیں گے 'ارے یہ میڈیا ویڈیا کچھ نہیں۔ اس سے ڈرنے ورنے کی کوئی ضرورت نہیں'۔ بالکل اس لطیفے کی طرح جس میں فاٹا کے علاقے سے گذرتے ہوئے ایک امریکن نژاد بھوت دوسرے سے کہہ رہا تھا 'بھائی ڈرنے کی ضرورت نہیں یہ طالبان والبان کچھ نہیں ہوتے'۔

۴ اپریل ۲۰۰۷ء

The last crimes

جب ہم اپنے اردگرد نظر ڈالتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ تمام بڑے جرائم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ چناچہ اب باقی ماندہ چھوٹے موٹے یا یوں کہئے کہ بچے کھچے جرائم کا قلع قمع کیا جا رہا ہے۔ بالکل اس ہی طرح جیسے گھروں میں خواتین صفائی کرتے وقت پہلے تمام بڑا گند سمیٹتی ہیں پھر چھوٹا کچرا نکالتی ہیں اور پھر جا کر کہیں کونے کھدروں کی صفائی کی باری آتی ہے۔ ہمیں یہ خیال یوں آیا کہ پنجاب کے ایک رٹائرڈ پولس افسر نے اپنی کتاب ''The Ultimate crime'' میں جن ہوشربا جرائم کی نشاندہی کی ہے ان کے خلاف کسی بھی قسم کا اقدام ہوتا نظر نہیں آیا۔ اب ہم چونکہ نہایت ہی 'Optimist' واقع ہوئے ہیں اس لیئے یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ ہماری پولس اور حکومت نے ایسے تمام جرائم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے اور اب وہ صرف باقی بچی کھچی گند کو دور کر کے پاکستان کو ایک مثالی ملک بنانے میں مشغول ہیں۔

ہمارے یہ سمجھنے کی تائید ان مناظر سے ہوتی ہے جو ہم روزانہ صبح شام دیکھتے ہیں اور یقیناً آپ بھی دیکھتے ہونگے۔ اگر نہیں تو اب غور کیجئے گا۔ ہر سگنل والے چوراہے کو کراس کرنے کے بعد تقریباً پندرہ بیس گز کے فاصلے پر آپ کو دو تین ٹریفک کانسٹبل اور ایک آدھ انسپکٹر، ہلمٹ لگائے موٹر سائکل پر الرٹ بیٹھا نظر آئے گا۔ سب کی توجہ کا مرکز چوراہا ہوگا اور جیسی ہی کوئی موٹر سائیکل والا، سگنل کے زرد سے سرخ یا سبز سے زرد ہوتے وقت آگے پیچھے ہو گیا تو ان سپاہیوں میں برقی رو دوڑتی نظر آئے گی اور یہ کمالِ تیزی سے آگے آ کر جرم کے اس مرتکب کو پکڑ لیں گے اگر کسی نے شہ زوری دکھائی تو موٹر سائیکل حرکت میں آ جائیگی اور مجرم پکڑا جائیگا۔ اس قسم کے چھوٹے موٹے جرائم پر بھرپور توجہ دینے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ شائد اب تمام بڑے بڑے جرائم ختم ہو چکے ہیں۔ مثلاً تمام بسوں اور ٹیکسیوں کے ڈرائیوروں کے سارے کاغذات مکمل ہو چکے ہیں۔ سب یونیفارم پہنتے ہیں اور بیج بھی لگاتے ہیں، ہارن کی آواز اور دھواں ناپید ہو چکا۔ تیز رفتاری اور اوورٹیکینگ معدوم۔

بسوں کی چھتیں سواریوں کے بغیر، اور اندر مسافر سیٹ بائی سیٹ بیٹھ رہے ہیں۔ پیدل حضرات زیبرا کراسنگ کے علاوہ کہیں اور سے روڈ پار کرنے کا سوچتے بھی نہیں۔ اس کے علاوہ پولس جس طرح ہماری عوام کو تکالیف سے بچانا چاہتی ہے وہ ہم پہ گزرے ہوئے اس واقعہ سے واضح ہو جائے گا۔ ہوا یہ کہ ہم شام کے وقت گھر جا رہے تھے، آئی آئی چندریگر روڈ پر شاہین کمپلکس کے سگنل کو کراس کر ہی رہے تھے کہ زرد بتی جل گئی۔ ہم چونکہ اسٹاپ لائین کراس کر چکے تھے اس لیئے رکنے کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن اتفاقاً ایک پیدل شخص ہمارے سامنے آ گیا اور ہمیں بیچ چوراہے پر رکنا پڑا اس ہی اثنا میں سگنل سرخ ہو گیا اور سپاہی بڑی سرعت سے آگے بڑھا اور ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم ابھی کار سائیڈ میں کر ہی رہے تھے کہ اسنے لپک کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور ہماری کار کے آگے لا کر موٹر سائیکل کھڑی کر دی، ہمارے پاس آیا، سلام کر کے ہاتھ ملایا اور فرمایا 'سر آپ کا لائیسنس ؟' ہم نے بحث کرنا فضول جانتے ہوئے لائیسنس دے دیا۔ اس نے چالان بک نکالی اور کہا دو سو کا چالان کٹے گا۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ اس نے پنسل بک پر رکھی پھر ہم سے مخاطب ہوا 'سر کیا ضروری ہے کہ جرمانہ بنک میں جمع کرائیں'۔ ہم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا 'پھر؟'۔ جواب ملا 'سو روپے یہیں دے دیجئے'۔ اب بات سمجھ میں آ گئی تو ہم نے پچاس کی آفر دی۔ اس کے انکار پر ہم نے کہا ٹھیک ہے آپ چالان کریں۔ مسکراتے ہوئے اس نے چالان کی رسید ہمیں دی اور لائسنس رکھ لیا۔ دوسرے دن ہم نیشنل بنک گئے۔ بڑی مشکل سے پارکنگ ملی۔ دس روپے پارکنگ فیس دی، بینک میں قطار میں لگے، تقریباً ایک گھنٹے بعد نمبر آیا۔ معلوم ہوا بارہ روپے بنک فیس بھی واجب الادا ہے، دو سو بارہ روپے دیئے پھر یہ مژدہ ملا کے ہاکی اسٹیڈیم کے پاس ٹریفک آفس ہے وہاں سے رسید دکھا کر لائیسنس حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ گئے اور لائیسنس لے کر آفس پہنچے تو معلوم ہوا ہاف ڈے لگے گا۔ بہرحال ہاف ڈے اور پیسے کے زیاں کے بعد احساس ہوا کہ پولس والا ہماری مدد کرنا چاہتا تھا اس ہی لیئے تو اس نے ہمیں چوئس دی تھی لیکن ہم سمجھ نہ سکے اور تکلیف اٹھائی۔ ٹریفک کے علاوہ دوسرے کرپشن پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ ختم ہو چکے ہیں۔ غبن، بے ایمانی، رشوت ستانی، دھاندلی، اقربا پروری، اسمگلنگ، لوٹ مار، اغوا برائے تاوان، انفرادی یا اجتماعی زیادتی، فحاشی یا عریانی، ڈکیتی، راہزنی، اسٹاک ایکسچینج یا نج کاری کے گھپلے، قبضہ مافیہ، گیس و بجلی کی چوری انکم و سیل ٹیکس میں گڑبڑ، شراب اور جوئے کے

اڈّے وغیرہ سب عنقا ہو چکے ہیں۔کوئی بینک قرضوں کا نا دہندہ بھی نہیں رہا۔ جال ساز کیفرِ کردار کو پہنچ چکے ہیں۔مہنگائی کا عفریت غائب ہو چکا ہے۔اب ان حالات میں پولس چھوٹے موٹے جرائم کی طرف توجہ نہ دے تو کیا کرے۔اب تو عدالتوں کا بھی مصرف نہیں رہا۔ظاہر ہے کہ اب اگر کسی کے خلاف کچھ کرنا ہو تو کوئی کیا کرے۔اس ہی لیئے لے دے کہ موٹر سائیکل سوار رہ گئے ہیں جو سگنل کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور چونکہ پولس کے پاس کوئی بڑا کام تو رہا نہیں اس لیئے ساری توجہ ان موٹر سائیکل والوں کی طرف ہی رہتی ہے۔ہماری حکومت بیچارے غریب صنعت کاروں کا بھی وقتاً فوقتاً خیال کرتی رہتی ہے اور باہمی تعاون سے ان کی مدد کرتی ہے۔مثلاً ایک دفعہ کسی غریب تاجر نے ہلمٹ کی ایک کھیپ درآمد کر لی یا کوئی چھوٹی موٹی ہلمٹ سازی کی فیکٹری لگالی۔اس لیئے اس غریب کی مدد کے لیئے ہلمٹ کے استعمال کو لازمی قرار دیدیا گیا اور استعمال نہ کرنے کی صورت میں بھاری جرمانے کا خوف غریب پولس والوں کی کمائی کا ایک ذریعہ بھی بن گیا۔اب چونکہ ہمارا ملک گھناؤنے جرائیم سے پاک ہو گیا ہے اس لیئے پولس والے بیچارے اب کونے کھدروں کی صفائی میں مصروف رہتی ہے۔ ویسے کچھ بدگمانوں کا خیال ہے سرکار نے بے روزگاری دور کرنے کے لیئے ایک بڑی تعداد پولس میں بھرتی کر لی ہے اور ان سے کہدیا گیا ہے، خزانے پر بوجھ بننے کی ضرورت نہیں، خود بھی کھاؤ اور افسران کو بھی کھلاؤ۔ بالکل اس ہی طرح جیسے کسی صاحب نے ملازم رکھتے ہوئے کہدیا کہ کام زیادہ نہیں ہے اس لیئے تنخواہ نہیں ملے گی، ہاں تین وقت کا کھانا پیٹ بھر کر ملے گا بلکہ دودھ وغیرہ بھی اگر ہمت کروگے تو دستیاب ہوگا۔ ملازم نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔'جناب کام کیا ہوگا'۔فرمایا' کچھ زیادہ نہیں، بس داتا دربار پر دن میں تین دفعہ حاضری دینا ہوگی اور وہاں سے اپنے اور ہمارے لیئے تبرک لانا ہوگا''۔۔

۵ اپریل ۲۰۰۷ء

قوم نے ڈھونڈلی فلاح کی راہ۔۔۔

(وزیرِ مملکت نیلوفر بختیار کی فرانسیسی انسٹرکٹر کے ساتھ تاریخی چھلانگ پر لکھا گیا)

ہماری زندگی میں ایک ایسا واقعہ بھی ہوا جس سے ہمیں اپنی کم علمی کا شدید احساس ہوا۔ہم اپنے آپ کو معلومات کا خزانہ سمجھتے تھے اور بڑی اونچی ہواؤں میں رہتے تھے، لیکن ایک پیراشوٹ، جسے ہم نے نہیں باندھا ہوا تھا ہمیں اس بلندی سے نیچے لے آیا۔ ہمارا خیال تھا کہ وزیرِ سیاحت کا کام نئے نئے تفریحی مقامات کی تلاش، ان کی ڈیولپمنٹ، اور پھر ان مقامات کو عوام کے لیئے 'accessable' بنانا، اور لوگوں کو اس طرف راغب کرنا ہے۔لیکن ہمارا علم ناقص نکلا۔ہمیں معلوم ہوا کہ وزیرِ سیاحت کا یہ کام نہیں۔۔ بلکہ عوام کو محض تفریح پہنچانا ہے۔سیاحت کی میڈم وزیر نے ایک کارنامہ کر دکھایا اور اپنے کارنامے کی چند تصاویر کے ذریعے ہم سب کے لیئے جو تفریح بہم پہنچائی ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔اس قسم کے واقعات کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ 'ایک اچھا'۔اور دوسرا 'بہت اچھا'۔لیکن اس خاص واقعہ کا تیسرا پہلو بھی ہے 'بہت ہی اچھا'۔ان پہلوؤں کی وضاحت اس لیئے ضروری ہے کہ ہمیں تو خیر اپنی کم علمی کا احساس ہو گیا ہے لیکن کہیں آنے والے دنوں میں آپ کو ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑے۔خیر پہلی اچھائی تو یہ ہے کہ موصوفہ کو تصاویر میں اتنے خوشگوار موڈ میں ہنستے ہوئے، پھر انسٹرکٹر کے بازوؤں کے سہارے کے باوجود پیراشوٹ کا احسان لیتے ہوئے بلندی سے پستی کی طرف آتے ہوئے، اور پھر زمین پر پہنچ کر اپنے انسٹرکٹر سے بغل گیر ہوتے ہوئے دیکھ کر جو تقویت آنکھوں کو اور جو آسودگی دل کو ملی وہ صرف اور صرف ایک اینلائیٹنڈ حکومت ہی کا خاصہ ہے۔

دوسرا پہلو یعنی 'بہت اچھا' یہ ہے کہ مسائل کی طرف سے قوم کی توجہ بٹانے کے لیئے ایک اچھا حربہ ہاتھ آ گیا، اور قوم جو پچھلے چند دنوں سے جن سنجیدہ مسائل میں الجھ کر رہ گئی تھی اس سے نکلنے میں شائد کامیاب ہو جائے۔۔تیسرا پہلو یعنی 'بہت ہی اچھا' یہ ہے کہ ہمارے وزراء کو اب وفاداریاں ثابت کرنے اور ہمیں بحث

ومباحثوں سے استفادہ کرنے کے مزید مواقع ملیں گے۔ بلکہ کچھ بیانات تو اس واقعہ کے بارے میں نظروں سے گذرنا شروع بھی ہو چکے ہیں حزب اختلاف نے روائتی مخالفت میں اسے بے حیائی اور اسلامی تشخص کے منافی گردانا ہے جب کہ وزیر مملکت طارق عظیم کو ان تصاویر میں کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہیں آئی۔ دیکھا آپنے۔۔تصویر ایک،لیکن نظریات، دو۔ بالکل اس ہی طرح جیسے منی اسکرٹ کے بارے میں یہ لطیفہ۔۔پچھلے وقتوں میں کسی لڑکی نے اپنی ماں سے منی اسکرٹ پہننے کی اجازت مانگی تو جھاڑ پڑی کہ شرم وحیا بھی کوئی چیز ہے وغیرہ وغیرہ۔اور لڑکی کو قطعی اجازت نہ ملی۔لیکن آج انلائٹمنٹ کی بدولت اگر کوئی لڑکی ماں سے منی اسکرٹ پہننے کی اجازت مانگے تو ماں خوشی سے کہے گی۔''ہاں ہاں بیٹی، کیوں نہیں۔۔۔کیوں نہیں۔۔۔کچھ نہ کچھ تو پہننا اچھا ہی ہے۔۔۔۔''

۷ اپریل ۲۰۰۷ء

بغیر اجازت۔۔۔۔۔۔

ہم بہ حیثیت ایک قوم کے عجیب مزاج رکھتے ہیں۔ ہر بات پر تنقید، اعتراض یا مخالفت میں ہماری مثال نہیں ملے گی لیکن کسی کے اچھے کام کی تعریف ہمارے لیئے نہائت مشکل چیز بن جاتی ہے۔خاص کر کے حکومت کا کوئی اچھا قدم ہو تو ہمارے لیئے اس کے حق میں بولنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔حکومت کے اچھے بیانات کو بھی نہیں سراہتے۔ اب دیکھئے کہ حکومت ہر دہشت گردی، تخریب کاری، حتیٰ کہ اجتمائی زیادتیوں کے بعد صاف صاف کہہ دیتی ہے کہ اس قسم کی کسی بھی گھناؤنی حرکت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اگر اس تنبیہ کے باوجود کوئی بلا پیشگی اجازت اس قسم کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو ہمارے صدر اور وزیراعظم فوراً متعلقہ تھانے کے انچارج ہی نہیں بلکہ ڈی آئی جی اور آئی جی تک کو فوری تحقیقات کا حکم صادر فرما دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ حکم نہیں دیں گے تو کارروائی کیسے ہوگی۔ بلکہ ہم نے تو وارداتوں کے بعد اعلیٰ حکام کے بیانات بھی دیکھے ہیں جن میں انہوں نے فخریہ بتایا کہ ''صدر یا وزیرِ اعظم کے حکم'' پر تحقیقات کا آغاز کر دیا ہے۔(اگر حکم نہیں ہوتا تو؟)

اس کے علاوہ جو بات تعریف (appreciate) کرنے کی ہے وہ حکومت کا یہ انتباہ ہے جس کا حکومتی ارکان بشمول صدر، وزیرِ اعظم، ہر ایسے واقعہ کے بعد اعادہ کرتے رہتے ہیں کہ ملوث مجرمان کو جلد از جلد گرفتار کر کے ان سے سختی کے ساتھ نمٹا جائے گا۔اب چونکہ سختی پلاسٹک، چمڑے، گوشت پوست سے لیکر لکڑی اور لوہے تک کی ہوسکتی ہے اس لیئے یہ بھی قابلِ تعریف ہے کہ بغیر کسی ابہام یا دھوکے کے یہ واشگاف لفظوں میں بتا دیا جاتا ہے کہ 'آہنی' ہاتھوں کے ساتھ نمٹا جائے گا۔اس سے کم از کم یہ واضع ہو جاتا ہے کہ سختی کتنی ہوسکتی ہے۔ دہشت گردی یا دیگر تخریب کاری کی اجازت نہ دینے کا ایک اور مضبوط اور مثبت پہلو بھی سامنے آتا ہے جس سے بے روزگاری میں بھی کسی حد تک کمی ہوسکتی ہے۔

آپ کے علم میں ہوگا کہ کچہری کے احاطے میں بیسیوں وینڈرز (Vendors) میز کرسی لگائے اسٹامپ، حلف

نامے اور مختلف اقسام کے اپلیکیشن فارمز (application forms) بیچ رہے ہوتے ہیں۔ اب اگر ان میں ایک اور درخواست فارم کا اضافہ ہو جائے تو وینڈر حضرات کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے اور شر پسندوں کو اجازت مانگنے کی سہولت بھی حاصل ہو جائے گی۔ اگر حکومت چاہے تو ہر درخواست کے لیئے 'fees' مقرر کر کے کچھ مالی فوائد بھی حاصل کر سکتی ہے۔ فارم میں درخواست گزار کو اجازت کے لیئے اپنے اس اقدام کے لیئے جواز پیش یا 'justify' کرنے کی سہولت بھی ہوگی۔ فارم میں درخواست گذار کے تمام کوائف درج ہوں گے جس سے حکومت کو گھر بیٹھے کافی ڈیٹا (DATA) بھی مل جائے گا۔

اب آپ عادتاً اعتراض کریں گے کہ جب اجازت نہ دینے کا طے ہو چکا ہے تو پھر درخواست کوئی کیوں دے گا اور اس سے حاصل کیا ہوگا تو عرض ہے کہ پتنگ بازی پر بھی تو پابندی ہے لیکن درخواست کرنے پر دو دن کے لیئے ہی سہی، پر اجازت مل تو جاتی ہے۔ ہاں پتنگ بازی کی اجازت مل جانے سے یہ امید بھی ہوگئی ہے کہ اب درخواست گزار ہونے سے کئی اور اقسام کی قانون شکنیاں، مثلاً آتش بازی، 'over speeding' یا سگنل کی خلاف ورزی کی بھی، وقتی طور پر اجازت مل سکتی ہے۔ مثلاً کسی کو کہیں جانے کی جلدی ہے تو ارجنٹ فیس کے ساتھ درخواست دے سکتا ہے کہ جناب برائے مہربانی دو گھنٹے کے لیئے کار تیز چلانے کی اجازت دی جائے، نیز سگنل کی خلاف ورزی کو بھی نظر انداز کر دیا جائے۔ عین نوازش ہوگی اور احقر آپ کا یہ احسان تا حیات نہیں بھولے گا۔ جناب عالی اس درخواست کی مطلوبہ فیس بھی درخواست کے ساتھ جمع کروادی ہے۔

ان پڑھ درخواست گذاروں کی درخواست لکھنے کے لیئے، ریٹائرڈ منشیوں کی بے روزگاری بھی دور کی جا سکتی ہے اور پھر درخواست رد کرنے کا اختیار تو حکومت کے پاس ہی رہے گا جس سے ہذا من فضل ربی کی گنجائش بھی نکل سکتی ہے۔ گاہے بگاہے دو چار درخواستوں کو رد کر کے حکومتی رِٹ بھی قائم رکھی جا سکتی ہے۔

۱۱ اپریل ۲۰۰۷

کالم نویس

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک قاری اپنے اخبار کو چھوڑ کر کسی دوسرے اخبار کی طرف خبروں کی وجہ سے نہیں بلکہ ایڈیٹوریل یا یہ کہیے کہ اڈیٹر اور پسندیدہ کالم نویسوں کی وجہ سے آتا ہے۔ ہم نے بھی ایک نئے اخبار کو اس ہی لیئے اپنایا۔ عبدالقادر حسن، جاوید چودھری، زاہدہ حنا، اور یا مقبول جان اور اطہر عباس کی 'کنکریاں' ہمیں نئے اخبار کی طرف لے آئیں۔ اور ہم مجیب الرحمٰن شامی، عطاالحق قاسمی اور ڈاکٹر صفدر محمود کے کالموں سے محروم ہو گئے۔ گرچہ کالم کی پسندیدگی قاری کے اپنے خیالات کی ترجمانی سے مربوط ہوتی ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کالم نویس کا علم سچا ہو اور وہ جھوٹ یا بیوقوفی کی بات نہ لکھ رہا ہو۔ یا خودستائی نہ کر رہا ہو تو اسے پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب کوئی کالم نویس اپنے مونہہ میاں مٹھو بنتے ہوئے اپنی ناقص معلومات کو اپنی کنفیوژن کا نام دے۔ اور اپنے آپ کو اینگری ینگ مین (Angry young man) کے روپ میں پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کی تہذیب، انکی عظمتِ رفتہ کا مذاق اور حال کے عظیم مسلمانوں کا قد کم کرنے کی کوشش کرے تو بہت ہی کوفت ہوتی ہے۔ ارے ہمارے دشمن ہی کیا کم ہیں جو ہم پر گند پھینک کر ہمیں رسوا کرنے میں ایسے کئی کالم نویس کوئی کثر نہیں اٹھا رکھتے۔ نئے اخبار میں ہماری آشنائی ایک ایسے ہی کالم نویس سے ہوئی جس سے پہلے پہل ہم کافی مرعوب ہوئے۔ لیکن رفتہ رفتہ قلعی کھلتی گئی اور ان کے سطحی ہونے کا بھانڈا کھلنے لگا۔ انکے کالموں سے پتہ چلنے لگا کہ حادثاتی طور پر یہ مقام مل گیا ہے۔ ہمیں تعجب تھا کہ وہ اس اخبار میں کیسے فٹ ہو گئے۔ کیوں کہ ان کے کالم تھالی کے بینگن والی پالیسی رکھنے والے اخبار ہی کے لیئے قابلِ قبول ہو سکتے ہیں۔ اور ہمارا خیال بالکل درست نکلا کہ موصوف چند ماہ ہی میں لوٹ گئے۔ ایسے کالم نویس تو اپنے آپ کو روشن خیال اور صاف گو ثابت کرنے کے چکر میں قوم کو مایوسی کے غار میں ڈھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو شائد انکی طالب علمی کے زمانے کی اپنی ناکامیاں ہوتی ہیں یا پھر انکے محبوب 'ازم' کی تباہی! اور وہ بھی اتنی جلدی۔ ہم ایسے کئی لوگوں کو جانتے ہیں جو یونیورسٹی اور کالج میں بڑے جغادری لیفٹسٹ

ہوتے تھے۔اسے اتفاق ہی کہیئے کہ انہیں عام طلبا میں بہت ہی کم پزیرائی ملی۔زیادہ تر نمبر دو ہی رہے۔جبکہ ان کی مدد کے لیئے کئی سیاسی جماعتیں،اخبارات،اور سفارت خانے سرگرم عمل رہتے تھے۔ان میں خاص طور پر قائداعظم کے ہاتھوں شکست کھائے ہوئے پیش پیش ہوتے تھے۔یہ لوگ بھارت نواز اور نظریہ پاکستان کے مخالف تھے اور کھل کر سامنے آنے کی ہمت نہ ہونے کی وجہ سے غریب گھرانوں کے محرومیوں کے شکار بچوں کو استعمال کرتے تھے۔ان بچوں کو سرمایاداروں کے خلاف کام کرنے میں بڑا چارم نظر آتا تھا۔کئی اخبارات کی سرپرستی کی وجہ سے یہ لوگ میڈیا میں جگہ بنا لیتے تھے۔اور جلد ہی دانشوری کا تاج بھی سر پر سج جاتا تھا۔مذکورہ کالم نویس بھی شائد ان ہی قسم کے لوگوں میں سے ہیں۔انہوں نے اپنے ایک کالم میں لکھا کہ ان کے بنگلے میں چار چارکاریں ہونے کے باوجود ان کے بیٹے کی شادی بڑی سادگی سے انجام پذیر ہوئی تھی اور یہ بھی لکھا کہ ان کے اپنے گھر کے باغ میں انواع واقسام کے پھلوں کی موجودگی کا احساس انہیں گلہریوں کی آمدورفت سے ہوتا ہے۔موصوف اپنے کالموں میں اتنے تلخ ہو جاتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے انگارے چبائے ہوئے ہیں۔ کہاوت ہے کہ ساون کے اندھے کو ہر چیز ہری نظر آتی ہے لیکن نہ جانے کیوں انہیں تو مسلمانوں میں عام طور پر اور پاکستانیوں میں خاص طور پر صرف کیڑے ہی نظر آتے ہیں۔ان کی علمیت کا یہ حال ہے کہ انہیں علم ہی نہیں کہ یہ مسلمانوں کی تحقیقات و ایجادات ہی ہیں جو تمام موجودہ سائینسی علوم کو بنیاد فراہم کرتی ہیں۔الجبرا، ٹرگنومیٹری کے بغیر سائینسداں ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔علمِ کیمیا اور علم الاجسام میں مسلمانوں کے کنٹریبوشن پر ہی آج کی جدید سائینس کی عمارت کھڑی ہے۔انہیں تو ہمارا سائنسداں بھی جعلی نظر آتا ہے۔ شائد انہیں علم نہیں کہ ایٹمی لیباٹری کا معمولی کارکن بھی ان سے کہیں زیادہ پڑھا لکھا ہے۔ ہاں ہم اس بات پر ان سے متفق ہو سکتے ہیں کہ ہم مسلمان جب بھی لٹے ہیں تو اپنوں ہی کی بدولت لٹے ہیں ورنہ باہر کا کوئی شخص ہم کو تباہ نہیں کر سکتا۔یہ ہماری بدقسمتی ہی تو ہے کہ ہمارے دانشور کبھی واہگہ پر موم بتیاں جلانے کے لیئے بے چین ہو جاتے ہیں تو کبھی بھارتی فلموں اور فنکاروں کے استقبال کے لیئے مرے جاتے ہیں۔پاکستان کی تخلیق کے وقت ننانوے فی صد (۹۹٪) ہندو، تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے۔لیکن مسلمان مختلف حیلے بہانوں سے آپس میں بٹے ہوئے تھے۔کسی کو مسلمانوں کے کمزور پڑ جانے کا خدشہ تھا۔تو کسی کو فکر تھی کہ پاکستان بننے

کے بعد شاہی مسجد میں کون آئے گا۔کسی کو قائداعظم کے سوٹ بوٹ پر اعتراض تھا تو کسی کو وہم کہ مسلم لیگ ٹوڈیوں کی جماعت ہے۔اور کچھ کا خیال تھا ہندو مسلم بھائی بھائی ہیں۔افسوس انہیں اسٹیشنوں پر مسلم ٹی اسٹال اور ہندو چائے کے بورڈ نظر نہیں آتے تھے۔ان کے لیئے بنارس میں گائے کی ذبیح پر مسلمانوں کا قتل عام کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔کاش اسوقت مسلمان بھی ہندوؤں کی طرح ایک ہوتے۔پاکستان بننے سے مسلمانوں کی طاقت میں کمی کا خوف رکھنے والے عقل کے اندھوں کو مسلمانوں کی کسمپرسی کا کیا احساس ہوتا جنہیں یہ ہی نہیں معلوم کہ کرکٹ اور ہاکی جیسے معمولی کھیلوں میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔پاکستان بننے کے بعد پاکستانیوں پر مشتمل ٹیموں نے بھارتیوں کو ان کی اپنی سرزمین پر شکست دیکر ثابت کر دیا کہ پاکستان بننے سے مسلمان کمزور نہیں ہوئے بلکہ مضبوط ہو گئے ہیں۔آج کے دور میں عجیب بات تو یہ ہے کہ تمام تر سہولتوں کے باوجود عوام کو سچ جھوٹ اور پروپگینڈا کا فرق نہیں معلوم ہوتا۔اس دور میں جس طرح سے واقعات جنم لیتے ہیں ان سے حقائق معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ایک ذاتی واقعہ بطور مثال پیشِ خدمت ہے۔ہمارے طالب علمی کے زمانے میں جب ہم خود سندھ یونیورسٹی کی یونین میں تھے تو کمشنر ہمیں اور ڈپٹی کمشنر ہمارے مخالف گروپ کو لائن دیتے تھے اور ان دونوں کو گورنر مغربی پاکستان کی تائید حاصل تھی اور جب دونوں گروپوں میں جھگڑے بڑھ گئے تو صلح کے لیئے دو وزراء کو بلوایا گیا۔رات کے پچھلے پہر اس وقت کے وزیر ریلوے اور بعد کے وزیرِ اعظم جناب محمد خان جونیجو اور وزیر قانون جناب اللہ بچایو آخوند تشریف لائے۔ ان کے علاوہ کمشنر، دادو اور حیدرآباد کے ڈپٹی کمشنر، وائس چانسلر بھی موجود تھے۔دونوں گروپوں کو نصیحتیں ہوئیں اور پھر گلے ملوایا گیا۔اس سے پہلے ایوب خان کے نمائندے کی حیثیت سے آج کے رٹائرڈ جنرل اور اس وقت کے کرنل رحیم الدین بھی تحقیقات کے لیئے تشریف لا چکے تھے چلئے جھگڑا ختم۔اوپر رپورٹ پہنچی ہوگی۔'سر سب کام خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔دونوں گروپ آپ کے ہاتھ مظبوط کرنے پر راضی ہیں'۔گمان ہے کہ اس سلسلے میں خرچے کے مد میں کچھ نہ کچھ لے بھی مرے ہوں۔چہ خوب!ایشو بھی خود پیدا کیا۔اور 'resolve' بھی خود ہی کیا۔ہمیں جب ساری حقیقت کا علم ہوا تو ہم نے اس لیڈری سے توبہ کر لی۔اور پھر مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ہاں اس دور کے کچھ اور بھی قصے ہیں جو انشاللہ پھر کبھی گوش گذار کریں گے۔دودھ کا جلا چھاج بھی

پھونک پھونک کر پیتا ہے اور ہر معاملے کو سطحی بنیادوں پر نہیں پرکھتا۔ ہم چونکہ ان اقسام کا تھوڑا بہت تجربہ رکھتے ہیں۔ اس لیئے جب جامعہء حفصہ کا ایشو کھڑا ہوا تو ہمیں دال میں کالا نظر آنے لگا۔ پھر مذکورہ کالم نویس کا اس ایشو پر کالم پڑھا تو اسلام آباد کی بدنامِ زمانہ 'آنٹی' کا انٹرویو یاد آ گیا، جس میں اس عفیفہ نے سارے معاملے کو نیا رنگ دینے کے لیئے 'شیعہ کافر' والی تہمت کالے برقعے والیوں سے منسوب کر دی اور ٹی وی نے ٹیلی کاسٹ بھی کر دی کوئی بے وقوف ہی اس پر اعتبار کر سکتا ہے کیونکہ شیعہ و سنی آج جتنے متحد ہیں پہلے کبھی نہ تھے۔ جب کہ دونوں کو لڑانے کی جتنی سازشیں آج ہو رہی ہیں شائد پہلے کبھی نہیں ہوئیں۔ عراق کی جنگ شروع تو خطرناک ہتھیاروں (Weapon of Mass destruction) کی مبینہ موجودگی سے ہوئی اور جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو شیعہ سنّی کی بنیادوں پر تقسیمِ بغداد کی کوششیں شروع ہوگئی۔ دونوں کو علیحدہ نہ کر سکے تو اب دیوار ہی سہی۔ دیواریں اتنی ہی اچھی ہیں تو دیوارِ برلن میں کیا خرابی تھی۔ ہم خود جامعہ حفصہ کے طرزِ عمل کے خلاف ہیں لیکن کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سوچنا ضروری تھا کہ کہیں یہ 'TRAP' تو نہیں۔ کیوں کہ کوئی اقدام کرتے یا نہ کرتے ہر دو صورتوں میں نقصان مسلمانوں کا ہی ہونا تھا اس بات سے ہی دشمن کی سازش کا پتہ چلتا ہے۔ کسے خبر کے منتظمینِ جامعہء حفصہ بھی اس سازش کا شکار ہوئے ہوں۔ ورنہ اس اقدام یعنی نفاذ شریعت کے لیئے یہ ہی وقت کیوں؟ اور اچانک ہی کیوں؟ ورنہ ایسے اقدام کے لیئے مہینوں راہ ہموار کی جاتی ہے۔ کیا ایک لائبریری پر قبضہ اور ایک فاحشہ عورت کو پکڑ کر زبردستی اپنے حق میں بیان دلوانے سے اسلام نافظ ہو سکتا تھا۔ اور کیا ہم اس عورت کے بعد میں دیئے گئے انٹرویو سے بھی نہیں سمجھ سکتے کہ در پردہ کھیل تھا کیا؟ اس 'آنٹی' نے تو اس اشو کو شیعہ سنی کا رنگ دے دیا تھا۔ کیا ہمیں نہیں معلوم کہ آج وہ کون ہے جو شیعہ سنی کو متحد نہیں دیکھنا چاہتا۔ ہم جیسے ایک عام شہری کو اس سارے معاملے میں خطرے کی بو آ رہی تھی اور اس ہی لیئے کئی کالم نویسوں نے اپنے کالموں میں اس اشو پر بڑا محتاط تبصرہ فرمایا تھا۔ لیکن اسلام اور پاکستانیوں سے بدظن یہ کالم نویس نہ جانے کیوں اتنے چراغ پا ہوئے تھے کہ محسوس ہوتا تھا جیسے کہ برائی اور بے حیائی کے اڈے بند ہونے سے انکا کوئی ذاتی نقصان ہو جائیگا۔

۲۵ اپریل ۲۰۰۷ء

منطق

منطق یا لوجک 'Logic' اگر پڑھے لکھے لوگ استعمال کریں تو مفید لیکن پڑھے لکھے جاہل کے ہتھے چڑھ جائے تو سوائے نقصان کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ بالکل اس ہی طرح جیسے نشتر سرجن کے ہاتھوں لگے تو مفید لیکن کسی 'unskilled' کے ہاتھوں نقصان کا اندیشہ ہی رہتا ہے کہا جاتا ہے کہ منطقی دلائل کے ذریعے نتائج اخذ کرنے کے لیئے کامن سینس کا ہونا شرط ہے۔ ایک دفعہ شیخ سعدی کے پاس ایک شخص اپنے بیٹے کو لیکر حاضر ہوا تا کہ اسے شیخ اپنی شاگردی میں لے لیں۔ شیخ سعدی نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ لڑکے میں کامن سینس کا فقدان ہے، معذرت کرنا چاہی لیکن وہ شخص بضد ہوا تو شیخ سعدی نے بادلِ ناخواستہ اسے شاگردی میں لے لیا۔ مگر ساتھ ہی خدشہ بھی ظاہر کر دیا کہ ان کی دی ہوئی تعلیم کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ خیر تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور جب تعلیم مکمل ہوئی تو لڑکے کا امتحان مقصود ہوا۔ لڑکے کے والد کو بھی دعوت دی گئی اور سب کی موجودگی میں شیخ نے اپنی مٹھی میں ایک انگشتری چھپالی اور شاگرد سے کہا 'حساب لگا کر بتاؤ کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے' شاگرد نے حاصل کی ہوئی تعلیم کو بروئے کار لاتے ہوئے حساب لگایا اور بتلایا کہ ہتھیلی میں چھپی ہوئی چیز دھات کی ہے۔ گول ہے۔ اور بیچ میں سوراخ ہے شیخ نے کہا یہ سب بالکل ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ کہ ہے کیا؟ شاگرد نے کچھ دیر سوچا اور کہا 'چکّی کا پاٹ'۔ شیخ سعدی نے لڑکے کے باپ سے کہا 'دیکھا میری دی ہوئی تعلیم بالکل ٹھیک ہے لیکن کامن سینس کی کمی، ہتھیلی سے چکی کا پاٹ ہی نکال سکتی ہے۔ اس ہی طرح جب ہم حکومتی ارکان کو منطقی دلائل کے ذریعے خود کو حق بجانب ثابت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو وہ سردار جی یاد آ جاتے ہیں جن کے ہاتھوں منطق کی مٹی پلید ہوئی تھی۔ قصّہ ہے کوئی شخص گاؤں میں منطق میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے لوٹا تو مخالف چودھری کو تشویش ہوئی اور اس نے اپنے ایک سردار دوست کو یہ معلوم کرنے کے لیئے کہ منطق ہوتی کیا ہے، ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجا۔ ڈاکٹر نے سکھ کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ بات سے بات نکال کر کسی نتیجے پر پہنچنے کے علم کو منطق کہتے ہیں۔ سردار جی کے کچھ پلے نہ پڑا تو ڈاکٹر نے کہا کہ دیکھو میں تم

سے کچھ سوالات کرونگا اور پھر کوئی منطقی نتیجہ اخذ کرلونگا۔ ڈاکٹر نے سردار جی سی پوچھا کیا تمہارے گھر میں کتا ہے۔ جواب اثبات میں سن کر کہا اس کا مطلب گھر بڑا ہے اور رکھوالی کے لیئے کتا پالا گیا ہے۔ جواب ملا جی ہاں۔ فرمایا اس کا مطلب ٹھیک ٹھاک آمدنی اور خوشحالی ہے۔ پھر پوچھا کیا والدہ حیات ہیں۔ سکھ نے کہا جی ہاں۔۔ تو کہا وہ تمہارے لیئے دعا کرتی ہیں؟ جواب ملا جی بالکل۔ ڈاکٹر نے کہا سردار جی اس کا مطلب ہوا کہ تمہاری ماں ایک نیک عورت ہے۔ دیکھو منطق کی رو سے میں نے معلوم کرلیا کہ تمہاری ماں نیک ہے اور اسکی دعاؤں سے تمہارے گھر میں خوشحالی ہے۔ اب سکھ کی سمجھ میں آ گیا کہ کتے کی موجودگی سے کیسے نتیجہ اخذ کیا گیا۔ سکھ چودھری کے پاس لوٹا۔ چودھری نے پوچھا کیا معلوم ہوگیا کہ منطق کیا ہے۔ سردار جی نے جواب دیا ہاں بات سے بات نکال کر کسی نتیجے پہ پہنچنا منطق ہے۔ چودھری کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو سردار جی نے پوچھا 'یار تیرے گھر میں کتا ہے'۔ چودھری نے کہا نہیں، کیوں؟ سردار نے سر کھجاتے ہوئے کہا یار منطق کی رو سے تمہاری ماں نیک عورت نہیں ہے۔۔ ہمارے وزراء بھی اب ایسے ہی دلائل دیتے سنائی دیتے ہیں۔ ان کی دلیلوں کے بموجب۔۔۔ **الف**۔ حزبِ اختلاف کو چیف جسٹس کی طرف داری نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ پچھلے دور میں نواز شریف کی پارٹی نے سپریم کورٹ پر حملہ کیا تھا۔۔ (حالانکہ اب وہ سارے ممبرز حکومتی بنچوں کا حصہ ہیں) **ب**۔ سیاسی پارٹیوں کو وردی کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ یہ سب پارٹیاں فوجی حکومتوں کے بطن سے ہیں۔ (اب اسے کیا کیا جائے کہ خواجہ ناظم الدین کو برطرف کرنے سے لیکر آج تک عملاً فوج ہی کی عملداری ہے۔ اس لیئے اس دوران پیدا ہونے والا ہر لیڈر فوج ہی کا مرہونِ منت ہوگا) **ج**۔ ریفرنس کو سیاسی پارٹیاں پولیٹیسائز (politicise) کررہی ہیں (اب اس کا کیا حل کہ ریفرنس کا پیش کیا جانا خود ہی ایک پولیٹیکل اشو ہے تو جوابی غزل تو سیاسی ہی ہوگی نا) جمہوریت فوجی آمر کے زیرِ سایہ ہی پنپ سکتی ہے اس لیئے یہ آئین کے عین مطابق ہے۔ بہرحال یہ اور ایسے ہی دوسرے بیانات سے پتہ چلتا ہے سکھ اب بھی یہیں موجود ہیں،۔۔

۳ مئی ۲۰۰۷ء

غلط بیانی۔۔۔

سنا ہے کہ اچھے زمانوں میں جب کوئی جھوٹ بولتا تھا تو مر جاتا تھا لیکن آجکل غلط بیانی کرنے والے کو بخار تک نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ سیاست میں بغیر جھوٹ یا غلط بیانی کے گذارا نہیں۔ حالانکہ مثال ہے کہ قائدِ اعظم نے کبھی دروغ گوئی یا غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ جب کہ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ آج کل کے علماء تک جھوٹ کا سہارا لینے سے گریز نہیں کرتے۔ جھوٹے تو بہت دیکھے ہیں اور انگنت واقعات میں سے یہ واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ یہ شائد ۱۹۶۲ء کی بات ہے ہم فرسٹ ایئر یا انٹرنس میں تھے۔ الیکشن میں محترمہ فاطمہ جناح، ڈکٹیٹر ایوب خان کے مقابل صدارتی امیدوار تھیں۔ ڈکٹیٹر کے ساتھیوں میں امریکی پٹھو شعیب اور جمہوریت کے چمپین بھٹو بھی تھے۔ جبکہ مادرِ ملت کے ساتھی خواجہ ناظم الدین، باقی بلوچ، مولوی فرید اور جعفر خان جمالی جیسے لیڈران تھے۔ حیدرآباد میں مادرِ ملت کا جلسہ عیدگاہ میدان میں تھا۔

حکومت اپنے اوچھے ہتھکنڈوں کے ذریعے جلسے کو ناکام ثابت کرنا چاہتی تھی لیکن جلسہ نہایت کامیاب رہا۔ ہمیں یاد ہے کہ نومبر کی سرد رات میں جب ہم جوش میں جلسے کے عین درمیان پہنچ گئے تو سانس لینا دوبھر ہوگیا اور ہم گھبرا کر پیچھے آ گئے تھے۔ ہجوم کا یہ عالم کہ اگر کوئی تھالی پھینک دیتا تو سروں پر سے پھسلتی ہوئی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی۔ بشرطِ یہ کہ سب لوگ ایک ہی قد کے ہوتے۔ مہاورۃً تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ اس جلسے کے کچھ ہی دن بعد آمر ایوب خان کا جلسہ اس ہی میدان میں ہوا۔ جس کے لیئے بڑے پاپڑ بیلے گئے۔ پبلک ٹرانسپورٹ پر قبضہ کیا گیا، اور گاؤں اور گوٹھوں سے عوام کو بھیڑ بکریوں کی طرح جلسہ گاہ میں زبردستی لایا گیا مگر مادرِ ملت کے جلسے کے حاضرین کے دسویں حصے کے برابر بھی لوگ جمع نہ کیئے جا سکے۔ تل تو کیا تلوں کی بوریاں آسانی سے رکھی جاسکتی تھیں۔

ایوب خان کی کنونشن لیگ کے ایک لیڈر حافظ مبارک علی شاہ نابینا تھے اور ڈکٹیٹر کی مدح سرائی میں کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ نابینا حافظ صاحب نے اپنی تقریر میں اپنا جوشِ خطابت استعمال کرتے ہوئے یہ تاریخی جملہ کہہ کر ہم جیسے، دونوں جلسوں کے چشم دید گواہوں، کو حیرت زدہ کر دیا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اس سے بڑا مجمع نہیں 'دیکھا'۔ اس سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ بھی وقوع پذیر ہوا ہے۔

مسلم لیگ [ق] کے زیرِ انتظام ایک جلسہ تھر میں منعقد کیا گیا جو بالکل اس ہی طرز کا تھا جیسا ۱۹۶۲ میں مسلم لیگ کنونشن کے زیرِ انتظام، ایوب خان کے لیئے کیا گیا تھا۔ اس میں ایک اندازے کے مطابق پچیس تیس ہزار افراد پکڑ دھکڑ کے لائے گئے تھے۔ اس تعداد کو پرویز مشرف نے ایک لاکھ جانا۔ لیکن وزیرِ اعلیٰ نے اس کو دس سے ضرب دیکر سچائی کو کاری ضرب لگا کر ہماری اس بات کی تائید کر دی کہ اب جھوٹ بولنے والوں کو بخار بھی نہیں چڑھتا۔ کہا جاتا ہے کہ ساون کے اندھوں کو ہر چیز ہری نظر آتی ہے لیکن عقل کے اندھوں کو ہر چیز الٹی نظر آتی ہے بس یوں سمجھئے کہ ع۔

؎ مجنوں نظر آتی ہے ، لیلیٰ نظر آتا ہے

کیونکہ جنہیں اپنا جلسہ دس پندرہ گنا بڑا دکھائی دے رہا تھا، انہیں چیف جسٹس کا جلوس کئی گنا چھوٹا تو نظر آنا ہی تھا۔ ورنہ جھوٹ بولنے سے بخار تو کیا چڑھتا۔ سچ دیکھنے سے دل کا دورہ ضرور پڑ سکتا تھا۔ دل کے ذکر سے یاد آیا کہ اس وقت کے وزیرِ قانون کے دل میں واقعی درد اٹھا تھا اور انہیں ہسپتال جا کر انجیو پلاسٹی کرانا پڑی اور یہ بھی عین اس دن جب چیف جسٹس اسلام آباد سے لاہور کے لیئے محوِ سفر تھے۔ خیر دل کا درد تو کسی کو کسی بھی وقت ہو سکتا ہے اور اس کے لیئے اہلِ دل ہونا بھی ضروری نہیں، ورنہ حکومتی ارکان درد سے مستثنیٰ ہی رہتے۔ ویسے بھی بقول شاعر۔ ع

؎ '' درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ''

اور حکومتی ارکان کا انسانیت سے کیا ناطہ!! لیکن اس تمام معاملے میں ایک نئی چیز مشاہدے میں آئی تھی کہ دردِ دل سے دماغ بھی ماؤف ہو سکتا ہے کیونکہ وزیرِ قانون نے جس طرح کے جوابات ہسپتال میں جیو کے نمائندے کو دیئے وہ اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ موصوف ذہنی طور پر بھی ٹھیک نہیں تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس ہی لیئے کہا

گیا ہو کہ کبھی کبھی دل اور دماغ کو الگ الگ بھی رکھنا چاہئے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزے کے رنگ پکڑنے کے مصداق دل اور دماغ ایک دوسرے کی خرابی کا اثر نہ لے سکیں۔

ہمارے خیال میں مندرجہ ذیل شعر ہمارے خیال کی صحیح ترجمانی کر سکتا ہے۔۔ع

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

۸ مئی ۲۰۰۷

پریس اڈوائیس

پریس اور پبلیکیشن کے بارے میں ہر حکومت چاہتی ہے کہ یہ حکومتی کنٹرول میں رہے۔ جبکہ حزب اختلاف آزادیِ صحافت کے لیئے صرف اس قت تک کوشاں رہتی ہے جب تک اسے اقتدار نہیں مل جاتا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت خبروں کو روکنا یا اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا اب مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا ہے اور اس مجبوری کو حکومت آزادیِ صحافت کا نام دیتی ہے۔ ع

؎ عجزِ گناہ کے دم تک ہیں عصمتِ کامل کے جلوے

ہمارے خیال میں آزادیِ صحافت کا خواب صرف اس صورت میں پورا ہوسکتا ہے جب حکومت صرف سچ بولے اور قوم کو پوری طرح حقائق سے آگاہ رکھے ورنہ نہیں۔ سینکڑوں ٹیوی چینلز، ڈش اینٹنا، انٹرنیٹ اور موبائل فونز کے باجود حکومت صحافت کو مشکل میں ڈالے رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک نجی چینل پر مختلف چینلز کے میزبان اور اخبارات کے نمائندوں کے درمیان ایک مذاکرے سے معلوم ہوا کہ آج ہمارے ملک میں صحافت پہلے سے کہیں زیادہ مشکلات میں ہے۔ ہم تو پہلے ہی سے اس خیال کے حامی ہیں لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میڈیا جتنا آج آزاد ہے پہلے کبھی نہ تھا۔ میڈیا کے ان نمائندوں نے گویا ہماری تائید یہ کہہ کر کردی کہ بینظیر و نواز شریف کے ادوار میں بھی مشکلات کا سامنا رہتا تھا مگر اتنی پابندیاں جیسی اب ہیں کبھی نہ تھیں۔ ایک صاحب نے بتلایا کہ اگر ۶۰۰ الفاظ کا کالم لکھنا ہو تو Advice ملتی ہے کہ اس میں ۳۰۰ الفاظ میں حکومتی ارکان کا ذکر ہونا چاہئے ہم جانتے ہیں کہ پرائیویٹ چینلز کی وجہ سے حکومت اس ہی پر اکتفا کیے ہوئے ہے ورنہ ان سے کچھ بھی بعید نہیں۔ یہ بھی پہلی بار معلوم ہوا کہ Talk shows میں مہمانوں کی شرکت حکومت کی منشاء سے ہوتی ہے۔ حکومت بتاتی ہے کہ ان کی نمائندگی کون کرے گا اور حزبِ اختلاف میں سے کس کس کو بلانا ہے۔ ان حضرات نے یہ بھی بتایا کہ کئی بار ایک آدھ کرسی مہمان سے بے نیاز بھی رہی ہے۔ کرسی کی محرومی کیا ہم

نے تو دورِ ضیاء میں اخبار کے صفحے کے صفحے الفاظ سے محروم دیکھے ہیں۔ یہ سعادت ہمیں اسٹوڈنٹ پالیٹکس کی وجہ سے نصیب ہوئی اور اس ہی لیئے اندر کا حال جانتے ہیں۔ دورِ ایوبی سے دورِ پرویزی تک کے چشم دید گواہ ہونے کے ناطے ہم نے دیکھا ہے کہ ملٹری ڈکٹیٹرشپ کے بطن سے کیا کیا خوف اور کیسے کیسے لطائف جنم لیتے ہیں۔

آج ہم آپ کو ان ادوار کے دو دلچسپ واقعات سناتے ہیں۔ ہم یہ بتاتے چلیں کہ اگر کوئی ہمیں یہ سناتا تو شاید ہمیں یقین کرنے میں تامل ہوتا لیکن اپنی آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا کیسے رد کریں۔ ایوب خان کا مارشل لاء تھا، لوگوں میں خوف و ہراس تھا، تمام سیاستدانوں پر ایبڈو کے تحت پابندی تھی، میڈیا (اخبار اور ریڈیو) پر حکومت کا کنٹرول تھا، ایوب خان ہر ماہ کی پہلی کو قوم سے خطاب کرتے اور اپنا راگ الاپ کر چلے جاتے۔ ہاں شائد یہ رسم بھی ان ہی کی ڈالی ہوئی ہے کہ صدر کی ہر تقریر سے پہلے اور بعد میں قومی ترانہ سنوایا جائے۔ قوم اس کی اتنی عادی ہوگئی تھی کہ ترانہ اور صدر کی تقریر لازم وملزوم ٹھہرے۔ ہم اس زمانے میں گورمنٹ کالج حیدرآباد میں پڑھ رہے تھے۔ ہمارے ایک کلاس فیلو عبدالسلام ریڈیو پاکستان حیدرآباد پہ اردو کی مقامی خبریں پڑھتے تھے۔ یہ وہی عبدالسلام تھے جو بعد میں ٹیوی کے مشہور نیوز ریڈر ہوئے۔ ہم اکثر ان کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن جاتے رہتے تھے۔ ایک شام ہم لوگ وہاں لان پر پروگرام مینیجر کے ساتھ بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ ایک چپراسی گھبرایا ہوا آیا۔ اسکا سانس پھولا ہوا تھا۔ آتے ہی پروگرام مینیجر سے گویا ہوا 'سائیں صدر صاب کا فون تھا ڈائرکٹر صاب کا پوچھ رہے تھے'۔ مینیجر صاحب نے جواب دیا کہ دماغ خراب ہے، صدر صاحب یہاں فون کریں گے کیا؟ کہنے لگا ہاں سائیں انہوں نے خود کہا تھا کہ میں ایوب خان بول رہا ہوں۔ ہم سب ہنس پڑے کہ کوئی اور ایوب خان ہوگا تو خفیف ہوکر بولا سائیں مرضی ہے آپ کی، مت یقین کرو مگر وہ صدر صاب ہی تھے۔ سب نے اسے سمجھایا کہ صدر کو یہاں کیا کام ہوسکتا ہے لیکن وہ ماننے کو تیار نہ تھا اور بضد تھا کہ صدر صاحب ہی تھے۔ جب کوئی نہ مانا تو کہنے لگا سائیں آپ لوگوں کی مرضی ہے پر وہ صدر ایوب خان ہی تھے کیونکہ ان کے بولنے سے پہلے ترانہ بھی بجا تھا اگر کوئی دوسرا ایوب ہوتا تو ترانہ کیوں بجتا ؟

دوسرا واقعہ ضیاء دور کا ہے۔ ہمارا اس زمانے میں پریس کلب میں اٹھنا بیٹھنا کچھ زیادہ تھا۔ ہمارے ایک دوست

امجد جعفری 'Indus Times' میں رہ چکے تھے جن کے توسط سے ہماری دوستی ڈان کے ملک صاحب سے ہوگئی اور پھر ہماری شامیں زیادہ تر پریس کلب میں ہی گزرنے لگیں اور ہمارے حلقہ ء احباب میں "Pakistan Times" کے سلیم قریشی، "Indus Times" کے ایف ایم قریشی، "Business Recorder" کے عبدالحفیظ، نوائے وقت کے عثمان اجمیری کے علاوہ دوسرے نامور اخبار نویس شامل ہوگئے۔ ان حضرات کے طفیل حکومت کی اندرونی کہانیاں جاننے کا کافی موقع ملا۔ پریس پر کس طرح کی پابندیاں تھیں۔ کس طرح ایڈوائس ملتی تھیں اور خبریں کیسے سنسر یا 'kill' کر دی جاتی تھیں، کیسے اچھے کو برا اور برے کو اچھا کیا جاتا ہے۔ وہیں یہ معلوم ہوا کے عوام کے مراسلوں پر یہ کیوں لکھا جاتا ہے کہ اڈیٹر کا مراسلہ نگار سے متفق ہونا ضروری نہیں کیونکہ اگر ایسا کوئی مراسلہ جو حکومت کے خلاف ہو اور سہواً چھپ جائے تو قانونی گرفت سے بچا جا سکے۔ اس زمانے میں اکثر اخبارات کے کئی کئی کالم سادہ ہوتے تھے کیونکہ کئی بار عین چھپائی کے وقت اڈوائس آجاتی اور خبر کو کل کرنا پڑتا اور وقت کی کمی کے باعث دوسری خبر کی کتابت کا موقع نہیں ملتا۔ کئی دفعہ اخبار اڈیٹوریل کے بغیر شائع ہوئے۔ آخری وقت پر اداریہ منسوخ ہوا اور دوسرا اداریہ لکھا نہ جا سکا۔

ایک رات ایک لطیفہ ہوگیا۔ ایک مقامی اخبار کی کاپیاں پریس میں جا چکی تھیں اڈیٹر صاحب اڈیٹوریل لکھ کر جا چکے تھے کہ اڈیٹوریل روکنے کی اڈوائیس آگئی۔ سارا اسٹاف پریشان ہوگیا کیونکہ کوئی ذمہ دار شخص وہاں موجود نہ تھا۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ ایسے ہی چھپنے دو بس آخر میں لکھ دو کہ اڈیٹر کا اڈیٹوریل سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس پر شائد عمل ہو بھی جاتا مگر اتفاق سے اڈیٹر صاحب کسی کام سے آگئے اور اخبار بغیر اڈیٹوریل کے شائع ہوا اور نہ دوسرے دن 'Declaration' منسوخ ہو جاتا اور ادیٹر بمع مالکان اندر ہوتے۔

اب ایک لطیفہ سن لیجئے جو صریحاً ہمارے ذہن کی اختراع ہے اور حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ شائد یہ لطیفہ اس وقت اتنا مزہ نہ دے لیکن اس رات کا تصوّر کیجئے جب یحییٰ خان کی حرکتوں کے نتیجے میں سقوطِ ڈھاکہ ہوا، ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر شخص غم زدہ تھا۔ تمام سیاستداں زہر لگ رہے تھے۔ بار بار ریڈیو پر چیف مارشل لاء اڈمنسٹر کی تقریر کے بارے میں بتایا جا رہا تھا لیکن تاخیر کی وجہ نہیں بتائی جا رہی تھی۔ ہر شخص بے چین تھا۔ ہر ایک یہ سمجھ رہا تھا کہ ابھی کوئی اچھی خبر آئے گی۔ لیکن۔ بسا آرزو کہ خاک شد۔ اللہ اللہ کر کے تقریر شروع ہوئی اور

ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ دوسرے دن لوگوں نے ہم سے تقریر میں تاخیر کی وجہ جاننا چاہی ہم پہلے ہی جلے بیٹھے تھے اس لیئے یہ ہوائی چھوڑ دی کہ صدر، نورالامین کو نائب صدر بنانا چاہ رہے تھے لیکن وہ مل نہیں رہے تھے اس لیے تقریر میں تاخیر ہو رہی تھی بعد میں فون پر ملے۔ ملٹری سیکریٹری نے صدر کو بتایا کہ نورالامین لائین پر ہیں۔ ابھی صدر صاحب ریسیور اٹھانے بھی نہ پائے تھے کہ دو سیکریٹریوں میں جھگڑا ہوگیا۔ ایک بضد تھا کہ پہلے ترانہ بجایا جائے جب کہ دوسرے کا خیال تھا کہ فون پر بات کرنے سے پہلے اس کی ضرورت نہیں۔ اسی بحث میں مزید تاخیر ہوگئی۔۔۔

۲۱ جون ۲۰۰۷ء

حقوقِ نسواں

الحمدللہ بالآخر پرویز مشرف اور انکی کابینہ کی کوششوں کے طفیل امریکہ کا ایک دیرینہ مطالبہ پورا ہوا اور حقوقِ نسواں کا بل پاس ہو ہی گیا۔ قوم کو یہ مژدۂ جانفزا بھی مل گیا کہ اب ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا ہے ۔نہایت خوشی کا مقام ہے کہ ترقی کی راہ کی آخری رکاوٹ بھی دور ہو گئی اور اب یقیناً (فیض احمد فیض سے معذرت کے ساتھ)۔

ے ہم بھی دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
جب رقص کرے گی خلقِ خدا
اور راج کرے گا 'صوفی ازم'
ہم دیکھیں گے۔۔۔

عرض ہے کہ یہ بلِ تُکّے میں نہیں پاس ہوا بلکہ 'نہ جانے کتنی کشاکش اور کتنی کاوشوں کے بعد یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ درجنوں مذاکرات، بحث مباحثے، تقاریر اور مناظرے اس کے محرک بنے۔ ہم نے گھنٹوں اس علمی بحث میں لگا دیئے ۔سمیرا ملک اور کشمالہ کے فکر انگیز خیالات سننے کے لیئے، حافظ حسین احمد اور قاضی حسین احمد کو بھی برداشت کیا۔ سمیرا اور کشمالہ کے علاوہ نیلوفر بختتار کی بصیرت افروز معلومات، قران وسنّت واحادیث سے آگاہی اور مولویوں کی کم علمی اور دین سے ناواقفیت کا علم، اور اپنی کم مائیگی کا احساس بھی ہمیں، ٹی وی کے پروگرامز (کیپیٹل ٹاک، ویوز آن نیوز، الف، آغاز، اور ۵۰ منٹ) دیکھنے سے ہوا۔ ان تمام باتوں کا کریڈٹ پرویز مشرف کو جاتا ہے جو بقول انکے سینٹ پیٹرکس کے پڑھے ہوئے ہیں۔ خود ہم ایک مشنری 'Missionary' اسکول، سینٹ بونا وینچر کے پڑھے ہوئے ہیں اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ جنرل پرویز مشرف کے پرنسپل، فادر ٹوڈ (FatherTodd) ہمارے "vice Principal" رہ چکے تھے مگر یہ ہماری

بدقسمتی ہے کہ وہ ہیڈ آف اسٹیٹ (Head of State) اور ہم فقط ایک کمپنی کے بزنس یونٹ ہیڈ (B.U.Head) ہی بن سکے۔ یہ ان پروگراموں کا ہی ثمر ہے کہ آج ہم ان خواتین کی بدولت بالجبر اور بالرضا کا تقابلی جائزہ لینے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ان پروگراموں سے ہماری دلچسپی اور ہمارا انہماک دیکھتے ہوئے ہمارے بچوں کو بھی ان مناظروں سے دلچسپی ہو گی جو ہمارے لیئے انتہائی خوشی کا باعث بنی کیوں کہ ایک دن ہمارے بھتیجے نے ہم سے پوچھ ہی لیا۔ ''تایا ابو یہ 'بالرضا' ٹیوی آرٹسٹ (T.V Artist) شہزاد رضا کا رشتہ دار ہے یا رضا شاہ پہلوی کا۔'' ہمارے ایک شاگرد نے تو حد ہی کر دی۔ اپنی غزل پر اصلاح لیتے ہوئے پوچھا ...''سر! کیا بالجبر بھی جانِ جگر۔ وقتِ سحر۔ زیرِ شجر کا ہم قافیہ ہو سکتا ہے'۔ خیر!۔۔ ابھی نسواں بل پہ صدر کے دستخط کی سیاہی خشک بھی نہیں ہوئی ہو گی کہ اس کے ثمرات نظر آنے شروع ہو گئے۔ اطلاع ملی کہ پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے مابین کھیلے جانے والے میچ میں خواتین کے علیحدہ انکلوژر کو ختم کر کے خواتین کو مرد حضرات کے شانہ بہ شانہ چلنے کا ہی نہیں بلکہ شانے سے شانہ ملا کر بیٹھنے اور میچ دیکھنے کا حق بھی مل گیا ہے۔ ہمیں قوی امید ہے کہ جلد ہی خواتین کے ساتھ روا، دوسرے امتیازی سلوک ختم کرنے کی طرف بھی توجہ دی جائے گی۔ قوم جلد ہی مژدہ سنے گی کہ بسوں، ویگنوں اور ٹرینوں میں خواتین کی علیحدہ نشستوں کا امتیازی سلسلہ ختم کر کے خواتین کو مزید حقوق دے دیئے گئے ہیں۔ ہم یہ بھی امید رکھتے ہیں کہ خواتین کی طرح مردوں کو بھی مختصر ترین لباس پہننے کا پابند کر دیا جائے گا تا کہ خواتین کو ان کی کم مائیگی یا کم لباسی کے طعنوں سے ہمیشہ کے لیئے نجات مل جائے اور ان کا احساسِ محرومی ختم کر دیا جائے۔ ہم یہ بھی امید کرتے ہیں کہ اب لیڈیز فرسٹ یا خواتین کے احترام میں کھڑے ہونے والی دقیانوسی روایات کا بھی سدِ باب جلد ہی کر دیا جائے گا۔ ع۔

پیوستہ رہ شجر سے، امیدِ بہار رکھ۔

ثمراتِ اینلائٹمنٹ (Enlightenment)

ابھی ہم، نسواں بل کی کامیابی پر پوری طرح خوش بھی نہ ہو پائے تھے کہ ایک اور خوش خبری ملی۔ جس سے یہ کنفرم (Confirm) ہو گیا کہ اب ترقی کی سب ہی رکاوٹیں دور ہو چکی ہیں۔ اب دقیانوسیت کا قلع قمع

ہونے میں کوئی شک ہی نہیں رہا۔خبر ہے کہ شاہ فیصل مسجد اسلام آباد میں عصر کی اذان ونماز بوجہ آمدِ ٹونی بلیئر نہ ہو سکی۔ چلئے اب کوئی بادشاہِ وقت یہ تو نہ کہہ سکے گا کہ مرنے والے نے مرتے مرتے میرا راز افشا کر دیا۔ جب کوئی راز ہی نہ ہوگا تو افشا کیا ہوگا۔تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ایک بزرگ نے وصیّت کی کہ میری نمازِ جنازہ وہ شخص پڑھائے جس نے کبھی عصر کی نماز قضا نہ کی ہو(ایک اور روایت ہے کہ جس نے عصر کی سنّتیں بھی کبھی نہ چھوڑی ہوں۔واللہ اعلم) یہ سن کر جب کوئی ایسا شخص سامنے نہیں آیا تو بادشاہِ وقت مجبوراً آگے بڑھا اور نمازِ جنازہ پڑھانے سے پہلے یہ تاریخی جملہ کہا۔**'مرنے والے نے مرتے مرتے میرا راز فاش کر دیا'۔**

اب انشا اللہ اسلام آباد کی حد تک تو کوئی ایسا شخص ملے گا نہیں، جسے اپنے راز کے افشا ہونے کا ڈر ہو۔کیونکہ ٹونی بلیئر کی آمد نے کم از کم فیصل مسجد کے نمازیوں کی ایک نمازِ عصر تو قضا کروا ہی دی۔۔یہ بھی امیّد ہے کہ اب کوئی ایسی وصیّت کرنے والا بھی نہیں ملے گا۔۔۔

۱۸ دسمبر ۲۰۰۷ء

B.B ، B.M. اور B.C

بینظیر بھٹو ، بیت اللہ محسود اور بریگیڈیر چیمہ۔۔۔

ہم اکثر سوچتے تھے کہ یہ لطیفے کیسے وجود میں آتے ہیں اور کیا ان کا ہماری حقیقی زندگی سے کوئی تعلق بھی ہوتا ہے۔کیا ان سے ہم کچھ سیکھتے بھی ہیں یا بس یوں ہی ہنسنے ہنسانے کے لیئے ہوتے ہیں۔!ان سوالوں کا جواب اب ہمیں مل گیا ہے،شائد آپ کی تشفی بھی ہو جائے اس لیئے کچھ سطریں اس ضمن میں لکھ رہے ہیں۔ماضی میں کچھ لطیفے سنے تھے جن سے ہم قطعی محظوظ نہیں ہوئے تھے لیکن حال کے واقعات سے یہ یاد بھی آئے اور ہمیں ہنسی بھی آئی اور یہ بھی سمجھ گئے کہ ہماری زندگیوں پر ان کا اثر ہی نہیں ہوتا بلکہ ان میں سے چند ایک تو بڑی بڑی منصوبہ بندیوں میں بھی کام آتے ہیں۔ بہر حال واقعہ ہے کہ کسی نے ایک لال بھجکڑ سے شکائت کی کہ آجکل مچھر مارنے کے اسپرے بالکل ناقص ہو گئے ہیں اور مچھروں پر انکا کوئی اثر نہیں ہوتا،رات بھر خون چوستے ہیں۔فرمانے لگے کہ یہ کیا بات ہوئی۔آپ ہمارا نسخہ آزمائیں تیر بہدف ہے۔پوچھا گیا۔وہ کیا؟ کہا کہ راکھ اور کوئیلہ پیس کر رکھلو، مچھر کو پکڑو اور اس کے مونہہ میں پسا ہوا آمیزہ ڈال دو، مچھر بیہوش ہو جائے تو اطمینان سے جوتا نکالو اور اسے (مچھر کو) کچل دو۔ظاہر ہے اس پر ہمیں ہنسی کیا آنی تھی لیکن بیت اللہ محسود کی بی بی کو قتل کرنے کی پلاننگ کا سن کر یہ لطیفہ بھی یاد آیا۔ہنسی بھی آئی اور یہ بھی ادراک ہوا کہ لطیفوں کا اثر بھی ہوتا ہے۔اب یہ اس لطیفے کا ہی تو اثر ہے کہ بیت اللہ نے لینڈ کروزر بنانے والوں کے ڈزائینر سے ۲۰۰۷ء میں ایسی گاڑی ڈزائین کروائی،جس کی سَن روف "sun roof" میں ۱۹۳۷ء کی کار کے دروازوں میں استعمال ہونے والا لیورفٹ کروا دیا۔پھر چند ایسے نوجوان تیار کیئے جنہوں نے بی بی کی گاڑی کے آگے آکر ایسے جوشیلے انداز میں نعرے بازی کی کہ بی بی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں اور سن روف کھول کر کھڑی ہو گئیں اور نعروں میں شامل ہو گئیں۔اب پلاننگ کی داد دیجئے کہ عین اس وقت ایک جوان نے پستول نکالا اور ہاتھ اتنا بلند کیا کہ گولیاں بی بی کو چھوئے بغیر سر اور آنکھوں کے اتنے قریب سے گذریں کہ بی بی گھبرا کر پیچھے ہٹیں اور اس ہی لمحے ایک

دوسرے جوان نے ایسا دھما کا کیا کہ خود ہی نہیں اڑا بلکہ گاڑی کو بھی پیچھے سے آگے کی طرف ایک شدید جھٹکا لگوا دیا۔اب غور فرمایئے بی بی کے پیچھے کی طرف ہٹنے اور گاڑی کے آگے کی طرف جھٹکا کھانے سے لیور کتنی شدّت سے لگا ہوگا کہ موت اسپتال پہنچنے سے پہلے آ گئی ۔اب بات چل نکلی ہے تو یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہمارے معاشرے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو،جگت استاد،خلیفہ اور ہرفن مولا کہلاتے ہیں۔جس کی وجہء تسمیہ ان کا ہر معاملے پر عبور رکھنے کا دعویٰ ہے۔

ایسے ہی ایک خلیفے کا آج ہی یاد آنا بھی بی بی کی شہادت کا مرہونِ منّت ہے واقعہ ہے ایک علاقعہ میں ایک خلیفہ اپنی علمیت کی بڑی دھاک رکھتا تھا اور وہاں کی عوام اس سے بہت متاثر تھی۔ایک دن اس علاقے میں کہیں سے ایک مینڈک آ گیا۔لوگوں نے چونکہ اس سے پہلے ایسا کوئی جانور نہیں دیکھا تھا اس لیئے فوراً اس عقلِ کل کو بلوایا گیا۔اتفاق سے خلیفہ صاحب نے بھی ایسا جانور پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن کمالِ ہوشیاری سے حکم دیا' باجرہ ڈالدو،اگر چگ لے تو سمجھو بٹیر ہے'۔باجرہ پھینکا گیا۔مینڈک ٹس سے مس نہ ہوا تو بلا جھجھک فرمایا' کوئی بات نہیں،گنا پھینکو،اگر چُوب لے تو جانو ہاتھی ہے'۔خیر گنّا پھینکا تو مینڈک نے جست لگائی اور یہ جا اور وہ جا۔یہ وار بھی خالی جاتے دیکھا تو کہا'لو جی مسئلہ ہی حل ہوگیا' اور فوراً ہی (پریس کانفرنس کا انتظام کیئے بغیر) حکومتی ترجمان کی طرح تاریخی فیصلہ صادر فرمادیا'اوہ !اوہ !یہ تو چھلانگیں لگاتا ہے۔اس لیئے یہ ہرن ہی ہوسکتا ہے'۔بعد میں سنا ہے (دروغ برگردنِ راوی) کہ انہوں نے چند تصاویر بھی پیش کیں جن میں مینڈک کو چھلانگ مارتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ہاں ایک بات اور!! مچھر والے لطیفے کے یاد آنے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ ہماری سمجھ سے بالا ہے کہ یہ خلیفہ ہمیں آج ہی کیوں یاد آیا،جبکہ ہم نے آج ٹیوی پر صرف وزارتِ داخلہ کے ترجمان برگیڈیر چیمہ کی پریس کانفرنس دیکھنے اور سننے کے علاوہ کچھ نہیں کیا اور پریس کانفرنس بھی کیسی جس سے ہماری ناقص معلومات میں یہ گراں قدر اضافہ ہوا کہ ڈاکٹر قدیر خان کی غیر موجودگی کے باوجود پاکستان نے سائینس میں حیرت انگیز ترقی کر لی ہے اور ایسا آلہ ایجاد کر لیا ہے جس نے بیت اللہ محسود کی کسی مولوی سے ہونے والی گفتگو ریکارڈ کر لی اور وہ بھی اتنی صاف اور واضع کہ ایک ایک لفظ سمجھ میں آجاتا اگر پشتو میں نہ ہوتی۔یہ ترجمان کی مہربانی تھی کہ ساتھ ہی ترجمہ بھی سنوادیا ورنہ ہم جیسے پشتو سے نابلد

محروم ہی رہتے اور یہ سمجھتے رہتے کہ شائد پشتو سیکھے ہوئے اشخاص نے یہ گفتگو رکارڈ کروائی ہے لیکن متین نے ثابت کر دیا کہ واقعی یہ بیت اللہ محسود ہی کی گفتگو ہے،کیونکہ اس بھولپن کی توقع پہاڑوں میں رہنے والے کسی پشتون سے ہی کی جاسکتی ہے۔یہ بھولپن یا معصومیت ہی تو ہے کہ حملے کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہوئے ایک نے دوسرے کو حملہ آوروں کے نام بھی بتا دیئے اور انکے جاں بحق ہونے کی اطلاع فی الحال انکے گھر والوں کو دینے سے منع بھی کر دیا۔ملاحظہ فرمایا بھولپن کہ مبارکباد لینے اور دینے والوں میں سے ایک کو ناموں کا پتہ نہیں اور دوسرا اس بات کی اہمیت سے ناواقف کہ ابھی گھر والوں کو اطلاع نہیں دی جانی چاہیئے۔دیکھئے ثابت ہوگیا کہ یہ کام بیت اللہ محسود ہی کا تھا۔اول یہ کہ پشتو بول رہے تھے دوئم انکی دائمی معصومیت !!ہمیں تو لگتا ہے کہ یہ گفتگو رکارڈ کرنے والے کا تعلق بھی اس ہی قبیلے سے ہے کیونکہ اس نے صرف مبارکباد والی ہی گفتگو رکارڈ کی اور تمام دن یہ کام نہیں کیا۔اس کی دو ہی وجوہ ہوسکتی ہیں

الف: بیت اللہ نے یہ فون اس ہی وقت آن کیا ورنہ قتل کی پوری پلاننگ بھی رکارڈ ہوسکتی تھی۔

ب: ہوسکتا ہے رکارڈ کرنے والے نے عین اسوقت رکارڈر آن کیا جب بیت اللہ اور مولوی صاحب نے فون پر مبارکباد لینے اور دینے کے لئے گفتگو شروع کی۔اس صورت میں رکارڈ کرنے والا قابلِ داد ہے کیوں کہ اس کی ٹائمنگ اس بلا کی تھی کہ ابتدائیہ کلمات،حتیٰ کہ سلام دعا تک رکارڈ پر آ گئے۔چونکہ گفتگو کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگئی ہے اس لیئے ایک گھسا پٹا لطیفہ اور سہی:۔ایک خان صاحب نے ایک چور پکڑا اور اسکے صرف پیر باندھ کر تھانے پہنچ گئے تھانیدار کو جب علم ہوا کہ صرف پیر باندھ کر یہ تھانے آئے ہیں تو اس نے کہا خان صاحب آپ نے اسکے ہاتھ تو باندھے نہیں وہ پیر کھول کر اب تک تو فرار ہو چکا ہوگا۔خان صاحب چند لمحے کو سٹپٹائے۔مگر فوراً ہی خیال آیا کہ چور بھی تو انکے ہی علاقے کا ہے اور جب یہ بات ان کو نہ سوجھی تو چور کو کیسے سوجھ سکتی ہے۔بہرحال تھانیدار کو قائل کیا اور ساتھ لیکر گھر پہنچے۔تھانیدار حیرت زدہ رہ گیا کیوں کہ چور واقعی موجود تھا۔آخر میں اس دعا کیساتھ اجازت کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس سائنسدان کو جس نے یہ آلہ ایجاد کیا ڈاکٹر قدیر خان جیسے انجام سے محفوظ رکھے۔۔آمین۔

۳۰ دسمبر ۲۰۰۷ء

شرلاک ہومز اور اسکاٹ لینڈ یارڈ۔۔۔

ہمارے ملک کی دیہی آبادی میں ایک ایسا کردار بھی ہوا کرتا تھا، شائد اب بھی ہو، جسے کُھرا نکالنے میں بڑی مہارت ہوتی تھی۔ یہ کردار کھوجی کہلاتا تھا اور جرائم، خاص کر مویشیوں کی چوری کی تفتیش میں مددگار ثابت ہوتا تھا۔ ان کھوجیوں کے بارے میں ہمارا علم سطحی نوعیت کا ہے۔ اور صرف سنے سنائے واقعات پر مبنی ہے۔ کئی سال پہلے ایک قصہ کہیں پڑھا یا سنا تھا۔ اب یاد نہیں، شائد اس کی وجہ ہماری نظروں میں اس کی اہمیت کا نہ ہونا ہو۔ یہ قصہ ہمارے تحت الشعور میں شائد کہیں دبا رہ گیا تھا اس لیئے اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کی مہربانی سے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔ جو کچھ یاد آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ ایک کھوجی نے پگڈنڈی کے ایک طرف چیونٹیوں اور دوسری طرف چڑیوں کو مشغول دیکھ کر پتہ لگا لیا کہ چوروں نے اونٹ پر ایک طرف چینی کی اور دوسری جانب گندم کی بوری لادی تھی اور بوریوں میں چھید ہونے کی وجہ سے کچھ چینی اور گندم کے دانے گرتے رہے تھے۔ اونٹ کی موجودگی کا علم ایسے ہوا کہ آس پاس کی جھاڑیوں سے صرف اونچی جھاڑیوں کے پتے کھائے گئے تھے جو صرف لمبی گردن والا ہی کھا سکتا ہے۔ اب زرافہ تو ہو نہیں سکتا اس لیئے لامحالہ یہ کام اونٹ ہی کا ٹھہرا۔ دوسرا انکشاف یہ کیا کہ یہ اونٹ بائیں آنکھ سے اور ایک دانت سے محروم تھا۔ توجیہ تھی کہ بائیں جانب کی جھاڑیوں کے پتّے اونٹ کی دسترس سے محفوظ تھے اور صرف دائیں جانب کے پتّے کام آئے تھے وہ بھی اس طرح کہ کھائے ہوئے پتوں کے درمیان ایک مخصوص فاصلے سے ایک دانت کے سائز کے کچھ خلا موجود تھے۔ یہ گیپس (gaps) اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ پتے چبانے والے کے دانتوں کے درمیان کا ایک دانت نہیں ہے۔ اب آپ ان کھوجیوں کی قابلیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایسے ہی واقعات، سر آرتھر کانن ڈائل (Sir Arther Conan Dyle) نے اپنے ایک مشہور کیریکٹر شرلاک ہومز کے ذریعے بیان کیئے ہیں۔ شرلاک ہومز کی بھی یہ خوبی تھی کہ ہوا کو سونگھ کر، پھولوں کو یا کسی سگریٹ کے ٹوٹے...پنسل کے

ٹکڑے.. یا کسی نقش یا نقشِ پا کو دیکھ کر مجرم تک رسائی حاصل کر لیتا تھا۔ اس میں اور ہمارے کھوجی میں یہ فرق تھا کہ شرلاک ہومز کسی بھی حتمی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اپنے اسسٹنٹ ڈاکٹر واٹسن سے ایک سیر حاصل بحث ضرور کرتا تھا۔ اب ہمارے روائیتی کھوجی کو تو یہ سہولت میسر نہیں تھا اس لیئے وہ ایسے انکشافات از خود ہی کر دیتا تھا۔ اب یہ ایک عجیب اتفاقی امر ہے کہ آج کل پھر ہمیں ایک ایسا کھوجی بصورت ترجمانِ حکومت، بریگیڈیر چیمہ مل گیا ہے جو بذریعے پریس کانفرنس ایسے ایسے انکشافات کرتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پچھلے دنوں اس نے ایسا ہی ایک انکشاف کر کے دنیا کو حیرت اور حکومت کو مشکل میں ڈالدیا تھا۔ اور... عقل محوِ تماشہ تھی' لب بام ابھی.. کہ حکومت کو مجبوراً اسکاٹ لینڈ یارڈ کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔ تاکہ قوم کو ترجمان کی بات کا درست ہونے کا یقین دلایا جا سکے کہ بی بی کی شہادت لیور لگنے سے ہوئی تھی اسکاٹ لینڈ کے ماہرین نے تو ہمارے کھوجی اور سر آرتھر کونن ڈائل کے شرلاک ہومز جیسے سکہ بند جاسوسوں کو بھی مات کر دیا۔ **وہ آئے**.... (فضا کو سونگھا)...**انہوں نے دیکھا**.(..ڈھیر ساری تصویریں اتاریں۔ دیواروں کی..جائے حادثہ کی۔ ہر اینگل سے...زمین سے...چھتوں سے)۔ اور **وہ چلے گئے**۔ چند دن بعد تصدیق کر دی کہ بینظیر کی ہلاکت گولی سے نہیں ہوئی۔ بلکہ کسی قسم کا لوہا لگنے سے ہوئی۔ کوئی لیور بھی ہو سکتا ہے۔ لیجئے ثابت ہو گیا کہ ہماری حکومت کا ترجمان صحیح تھا۔ یہ ہے جادو جو سر چڑھ کر بولے۔ نہ لاش دیکھی نہ زخم دیکھا۔ ہاں ٹی وی نے دکھایا کہ تصویریں کھینچتے پھر رہے تھے۔ اور وہ بھی اس جگہ کی جہاں کی صفائی حادثہ کے فوراً بعد ہی کر دی گئی تھی۔ جس طرح سے اس ٹیم نے تفتیش کی۔ اور جس طرح بالکل ٹھیک نتیجے پر پہنچی، اس کی سند کھوجیوں اور شرلاک ہومز کے علاوہ فیصل آباد کے عام آدمی سے بھی ملتی ہے جو ہوا کو سونگھ کر، دیکھ کر یا کسی چیز کو ہاتھ لگا کر، بالکل صحیح وقت بتا دیتا ہے۔ بہت مشہور ہے ایک شخص نے یہ سن کر آزمانے کے لیئے ایک فٹ پاتھ کے کنارے اپنے تانگے کے سائے میں لیٹے ہوئے کوچوان سے وقت پوچھا۔ کوچوان نے بلا تردد، گھوڑے کی دُم کو ہاتھ لگایا اور وقت بتا دیا جو کہ بالکل صحیح تھا۔ اس شخص کو حیرت ہوئی اس لیئے کچھ دیر بعد لوٹا اور دوبارہ معلوم کیا۔ کوچوان نے پھر وہی عمل دہرایا اور بالکل ٹھیک وقت بتا دیا۔ حیرت زدہ شخص نے فوراً سو روپے کی پیشکش کرتے ہوئے التجا کی کہ یہ فن اسے بھی سکھا دیا جائے۔ تانگے والے نے اطمینان سے نوٹ جیب میں رکھا اور اس سے کہا' بابو جی یہاں

میرے قریب بیٹھ جاؤ۔اور گھوڑے کی دم اٹھاؤ'۔اس شخص نے فوراً تعمیل کی،تو دوسرا سبق آیا'بابو جی اب سامنے دیکھو،گھنٹہ گھر صاف نظر آئے گا،اس کی گھڑی میں دیکھو کیا بجا ہے۔اس شخص نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اتفاق سے اس وقت گھنٹہ گھر بارہ بجا رہا تھا۔سبق سو روپے میں مہنگا نہیں تھا۔اسکاٹ لینڈ یارڈ نے تو ہماری قوم کے بارہ بجانے کا معاوضہ ٹھیک ٹھاک وصول کیا ہوگا۔۔اللہ بہتر جانتا ہے

۱۰رفروری ۲۰۰۸ء

خرد کا نام جنوں رکھدیا

برصغیر ہندو پاک کے مشہور جاسوسی ناول نگار ابن صفی نے اپنے ایک ناول' جہنم کی رقاصہ' میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ انسان خوف اور دہشت میں اضطراری طور پر اپنی مادری زبان ہی بولتا ہے چاہے عام حالت میں وہ اسے مخفی رکھنا ہی کیوں نہ چاہتا ہو۔مصنف نے لکھا کہ ایک غیر ملکی جاسوسہ اطالوی طائفہ کے ساتھ اپنے رقص کا مظاہرہ کرنے کے بہانے آتی ہے۔مقامی جاسوس کو اسکی قومیت پر شک ہوتا ہے۔حقیقت جاننے کے لیئے وہ دورانِ رقص ایک چمگادڑ رقاصہ کے مونہہ پر پھنکواتا ہے۔رقاصہ بوکھلاہٹ اور خوف میں بیساختہ جرمن زبان میں چیختی ہے' خدا غارت کرے' اور ثابت ہوتا ہے کہ وہ اطالوی نہیں۔

یہ بات کہاں تک درست ہے یہ تو کوئی ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے۔لیکن ناول نگار نے کہانی کی حد تک اس کو ثابت کر دیا۔یہ نفسیاتی نکتہ تو ایک کہانی کا حصہ تھا لیکن حقیقی دنیا میں پیش آنے والے واقعات نے بہت سی تھیوریوں کو الٹ پلٹ کر دیا ہے۔ان واقعات میں ۱۱/۹ کا واقعہ سرِ فہرست ہے۔ایسے ایسے انکشافات ہوئے کہ عقل دنگ رہ گئی۔۔

گیارہ ستمبر کو امریکیوں نے برسہا برس سے مروجہ سائنسی،اخلاقی،فنی و دیگر اصول و نظریات کو غلط ہی نہیں ثابت کیا بلکہ نئے نظریات کو بھی متعارف کروا دیا۔ہمارا تجربہ ہے کہ جب کبھی کوئی بچہ (لڑکا یا لڑکی) اپنے والدین کو عام حالات میں فون پر کوئی اطلاع دیتا ہے تو کہتا ہے' ممی، میں لاہور پہنچ گیا ہوں' یا' امی جہاز لیٹ ہے شائد کوئی فنی خرابی ہے۔ہم ابھی ایئر پورٹ پر ہی ہیں'۔۔یا' ماما۔جہاز اڑنے والا ہے اس لیئے موبائل بند کر رہا ہوں۔اترتے ہی جب سگنل بحال ہونگے تو اطلاع دونگا'

یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ کوئی بیٹا یا بیٹی اپنی والدہ سے بات کرتے ہوئے اپنا نام بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔۱۱ستمبر کو یہ ثابت ہوا کہ خوف اور گھبراہٹ،خاص کر دہشت کے عالم میں بچہ اپنی ماں کو جہاز کے اغوا ہونے کی اطلاع دینے سے پہلے اپنا مکمل تعارف کروانا ضروری سمجھتا ہے۔وہ اپنا فرسٹ نیم۔مڈل نیم اور سرنیم بتانے کے

بعد ہی اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔ مثلاً اگر خدانخواستہ کوئی جہاز اغوا ہو جائے تو اس پر سوار کوئی لڑکا اپنی ماں سے کہے گا۔' امی ۔ میں عبدالحمید قریشی بول رہا ہوں ، میں کراچی سے لاہور جا رہا ہوں لیکن دہشت گردوں نے ہمارا جہاز اغوا کر لیا ہے'۔ ملاحظہ کیجئے کہ خوف میں لڑکا کتنی ہوشیاری سے کام لیتا ہے اور اپنا پورا نام ہی نہیں، یہ بھی بتا دیتا ہے کہ وہ کہاں سے کہاں تک جا رہا ہے۔ مبادا اس کی ماں اسے باتھ روم وغیرہ میں ڈھونڈھ رہی ہو جبکہ برخوردار جہاز پر سوار ہو۔ گیارہ ستمبر کے بعد ایک ٹیپ شدہ ٹیلیفونک کال کے مطابق ایک لڑکے نے اپنی ماں کو اس ہی طریقے سے اطلاع دی تھی اس نے اپنا پورا نام بمع سرنیم بتانے کے بعد یہ بھی بتایا کہ وہ نیویارک سے کہاں جا رہا تھا کہ جہاز اغوا ہو گیا۔ ہم امید کرتے ہیں ماہر نفسیات اس ٹیپ اور اس نظریہ کو (کہ خوف کی حالت میں بچے اپنا پورا نام بتاتے ہیں) آئیندہ نفسیات کی درسی کتابوں میں ضرور شامل کر لیں گے)۔

کہاوت ہے کہ گیٹ دا بیسٹ آؤٹ آف داورسٹ (Get the Best out of the Worst) یعنی بقول شاعر ؎ نقابِ شب میں جمالِ سحر تلاش کریں

اس محاورے کی روشنی میں امریکیوں نے گیارہ ستمبر کے حوالے سے نفسیات ہی نہیں دیگر علوم پر بھی بڑے احسانات کیئے ہیں۔ انہوں نے ایرونا ٹیکل انجینیرنگ کے اس دعوے کی نفی کر دی کہ حادثات کی صورت میں جہاز کے' پر۔ دم اور بلیک باکس' محفوظ رہتے ہیں لیکن جو جہاز پینٹا گون کی عمارت سے ٹکرایا تھا اس کیساتھ یہ سب کچھ بھی فنا ہو گئے ۔۔۔۔ ہر چیز فانی ہے ۔۔ رہے نام اللہ کا ۔۔ ایک اور خیال کہ جہاز کے پرواز کرتے ہی موبائل فون بے کار ہو جاتے ہیں، غلط ثابت ہو گیا۔ کہ متذکرہ بالا لڑکے نے فون پر دورانِ پرواز ہی اپنی ماں کو اطلاع دی تھی۔ موبائل کمپنیوں کو تحقیق کرنی چاہیئے ۔ ہوسکتا ہے کہ اغوا کی صورت میں سگنل از خود کام کرنے لگتے ہوں ۔۔ سول انجینیرز کے لیئے بھی ایک سبق ہے۔ بلڈنگ مٹیریل کے ماہرین سمجھتے تھے کہ زلزلہ پروف عمارات اس طرح زمیں بوس نہیں ہوسکتی جیسے گارے اور مٹی کی کچی دیوار بارش میں ڈھے جاتی ہے۔ آپ خود ہی دیکھئے۔ جہاز اوپر کی منزلوں سے ٹکرایا اور عمارت کا پورا کا پورا اسٹرکچر نیچے بیٹھ گیا۔ اب کسی بلند بالا عمارت کے لیئے ڈائینامائٹ وغیرہ کی ضرورت نہیں بس اوپری منزل پر پٹرول ڈال کر آگ لگا دو۔ انشااللہ پوری عمارت روئی کے گالے کی طرح بیٹھ جائے گی۔ کیسا لوہا اور کیسا زلزلہ پروف مٹیریل !! ۔ مگر شرط ہے بلڈنگ کسی پاکستانی

انجینیر نے نہ بنائی ہو۔ کیونکہ پاکستانی معماروں کی بنائی ہوئی پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن کی بلڈنگ کی اوپری منزل پر تین بار لگی ہوئی آگ بھی اسے نہ گرا سکی۔ امریکیوں کو چاہیئے کہ اب بلند و بالا عمارتوں کے لیئے پاکستانی معماروں کی خدمات حاصل کریں۔ فائر بریگیڈ کے لیئے بھی فقیر کی جھولی میں بہت کچھ ہے۔ اغوا کنند گان کے پاسپورٹ جس میٹیریل کے بنے ہوئے تھے اگر ان کو فائر فائٹرز کے لباس میں استعمال کیا جائے تو ان کا کام آسان ہو جائے گا۔ وہ عشق کی پیروی کرتے ہوئے بے خطر آتشِ نمرود میں بھی کود سکیں گے اور محفوظ بھی رہیں گے۔

عقل خبط ہونے کی ایک مثال بھی گیارہ ستمبر کے واقعہ میں ملتی ہے۔ اتنی بڑی پلاننگ کرنے والوں نے جس چابکدستی سے امریکیوں کی سی۔آئی۔اے؛ ایف ۔بی۔آئی اور دوسری تمام ایجنسیوں کو چکمہ دے کر بیک وقت متعدد جہازوں کے اغوا کو کامیابی سے ہم کنار کیا، وہ اتنی بنیادی چیز کو کیوں نظر انداز کر بیٹھے کہ ایسی مہمات میں آسانی سے شناخت ظاہر کرنے والی چیزوں کو ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ جن کی مدد سے تھوڑی دیر میں ہی اغوا کنندگان کا تعلق القائدہ سے ثابت ہو گیا۔ دوسری حماقت دیکھئے کہ اس کام کے لئے دن بھی وہ منتخب کیا جب یہودیوں کی چھٹی تھی اور وہ اس عمارت میں موجود ہی نہ تھے ہوسکتا ہے یہ دن انہوں نے دانستہ چنا ہو۔ انہیں یہ خوف دامن گیر ہو کہ یہودیوں کے نقصان پر امریکی حکومت کا ردِعمل زیادہ شدید ہوگا۔ یہودیوں سے امریکیوں کی محبت تو اس قانون سے ہی عیاں ہے جس کی رو سے یہودیوں کے ہولوکاسٹ (Holocaust) پر یقین نہ کرنے والا قابلِ گرفت ہوگا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قانون واقعی اندھا ہوتا ہے۔ جلانے والے جرمن عیسائی۔ مرنے والے یہودی۔ پکڑا جائے گا وہ جو اس پر یقین نہیں کرے گا۔ یہ تو ہوئی اظہارِ رائے پر پابندی۔ آپ اپنی رائے دینے میں آزاد نہیں۔ لیکن مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے والوں کو آزادیء رائے کے قانون کے تحت تحفظ حاصل ہے اور وہ جب چاہیں کوئی دل آزار کارٹون، کوئی مضمون، کوئی کتاب جو مسلمانوں کے لیئے تکلیف دہ ہو شائع کر سکتے ہیں اور اگر آپ مسلمانوں جیسا نام رکھتے ہوں تو نوبل پرائز کے بھی حقدار ہو سکتے ہیں ورنہ 'سر' کا خطاب تو ہے ہی۔ سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسے ملعون تو تھے ہی کہ حال میں' B.B.C' نے پاکستان کے بیہودہ پاپ سنگر سلمان احمد اور ایک فاحشہ عورت سیما کا پروگرام ٹیلی کاسٹ

کر دیا جس میں یہ دونوں ملعون بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی سے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قران کا مذاق اڑا رہے تھے اب اگر مسلمان اس پر کوئی ردعمل ظاہر کریں تو دہشت گرد ٹھہریں گے۔ ظاہر ہے جرمِ ضعیفی کی سزا تو پھر ایسی ہی ہوتی ہے۔ برطانیہ اور امریکیوں کو انصاف کا علمبردار سمجھنے والے ہمارے دانشور شائد اس بات کی وضاحت کر سکیں کہ ان ممالک میں جہاں مسلمانوں کی دل آزاری والے مضامین، خاکے اور تبصرے روکنے میں تو ان کا قانون بے بس ہے لیکن وہیں پرنس ہیری کی افغانستان میں موجودگی کی خبر کو کیسے دبا دیا جاتا ہے اور وہاں کس قانون کے تحت ہولوکاسٹ کے خلاف اپنی رائے دینا جرم ہے۔

۲۰۰۸ء/۲/۲۵

آئینہ اور آئین

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ بچوں سے ایک آئینہ ٹوٹ گیا۔ ملازم نے پہلے تو دہلا دیا کہ غضب ہو گیا یہ خاندانی آئینہ تھا اور نسل در نسل خاندان میں منتقل ہو رہا تھا۔ بچے گھبرائے تو دلاسہ دیا کہ کوئی بات نہیں ابھی بازار سے لا کر رکھ دیتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ کئی بار ٹوٹا لیکن ہر بار نیا رکھ دیا گیا۔ شکر ہے کہ یہ خاندانی آئینہ محفوظ ہے۔ ایسا ہی کچھ حال ہمارے آئین کا بھی ہے۔ اسے توڑا جاتا ہے۔ معطل کر دیا جاتا ہے یا اس میں ترمیمات کر دی جاتی ہیں۔ لیکن یہ محفوظ رہتا ہے۔

۱۹۵۷ میں آئین توڑا گیا۔ ۱۹۶۲ میں نیا آئین دیا گیا۔ بنانے والے نے ۱۹۷۹ میں خود اسے پامال کیا اور حکومت دوسرے جنرل کو پکڑا دی جیسے ملک ان کے باپ دادا کا ہے۔ نئے ڈکٹیٹر نے آئین ہی نہیں ملک بھی توڑ دیا۔ ہم نے اسکول میں سوکس (civics) کے پیریڈ میں پڑھا تھا کہ اگر کسی وجہ سے اسمبلی کی اکثریت نکل جائے تو پوری اسمبلی تحلیل ہو جاتی ہے اور نئے سرے سے الیکشن کروانے ہوتے ہیں۔ یہاں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ملک ٹوٹا۔ آئین ٹوٹا تو پھر کیسی آئین کی حکمرانی۔ کیسا نیا الیکشن۔ بچی کھچی اسمبلی نے بچے کھچے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ ظاہر ہے، نیا پاکستان تو پھر آئین بھی نیا ہونا چاہیئے۔ لیجئے ۱۹۷۳ کا آئین وجود میں آ گیا۔ اب ہر چیز نئی ہو گئی۔ نیا پاکستان۔ پہلا منتخب وزیر اعظم۔ پہلا متفقہ آئین۔ ۵۶٪ پاکستانی بنگلہ دیشی ہو گئے مگر شکر ہے پاکستان بچ گیا۔ یوں سمجھئے نظریہء پاکستان بچ گیا۔ عوام کو نوید ہو۔ اللہ اللہ خیر صلّا!!! اگر مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان کا نام بنگلہ دیش کی بجائے پاکستان رکھ لیتا تو ہمارا کیا ہوتا۔ اس کے بعد کئی بار ۷۳ کا آئین بھی ٹوٹا۔ کئی بار اس میں ردو بدل ہوا۔ کبھی ۵۸ ٹو بی کا اضافہ ہو۔ کبھی سترھویں ترمیم ہوئی۔ کبھی کچھ ہوا کبھی کچھ۔ نہیں ہوا تو، آئین توڑنے والے پر مقدمہ۔ لیکن شکر ہے ۷۳ کا آئین محفوظ رہا، بالکل شفیق الرحمٰن کے خاندانی آئینہ کی طرح۔۔ چھوٹی چھوٹی کمپنیوں میں بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ضابطے ہوتے ہیں۔ بائی لاز

(Bye laws) ہوتے ہیں۔رولز اینڈ ریگولیشن ہوتے ہیں جن کے تحت کام ہوتا ہے۔لیکن ہمارے ملک کی بدقسمتی کہ ہر کام آئین سے ماورا۔ہم نے ضیا الحق کے جاں بحق ہونے کے بعد سینٹ کے چیرمین کے صدر بنانے کے علاوہ کبھی بھی آئینی طور پر حکومت تبدیل ہوتے نہیں دیکھی اور تو اور اگر صاحبِ اقتدار کو کچھ کرنا ہو جس کی آئین کے تحت ممانعت ہو تو آئین میں ردو بدل کر دیا اور شکر کیا گیا کہ ہر کام آئین کے تحت ہوا۔اس کے علاوہ پی۔سی۔او، ۔ایل۔ایف۔او، اور نظریہء ضرورت کی بیساکھیاں بھی آئین کو تحفظ فراہم کرنے کے لیئے موجود ہیں۔مثلاً ۲۰۰۲ میں حکومت سازی کے لیئے لوٹوں کی ضرورت پڑی تو آئین کی وہ شق جس کے تحت فلور کراسنگ ممنوع ہے کچھ دنوں کے لیئے معطل کر دی گئی اور کام ہو جانے کے بعد وہ شق بحال۔ع

؎ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ آنکھ میں کچھ شرم تھی اس لیئے پہلے آئین میں ترمیم کی پھر آئین کے مطابق کام ۔ورنہ کہہ سکتے تھے' میں نے یہ غیر آئینی قدم اٹھایا ہے، جو کرنا ہے کر لو'۔جس کی نظیر تین نومبر کو نافظ ہونے والی ایمرجنسی سے ملتی ہے۔عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہے کہ یہ آئین کا ڈھکوسلہ کیوں ضروری ہے جب کہ اس پر عمل تو ہوتا نہیں۔اگر کبھی کوئی پرابلم ہوئی بھی تو ماہر قانون داں تشریح کے نام پر اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں، بالکل اس ہی طرح جیسے کسی پرائیویٹ کمپنی میں کوئی بدعنوان مینیجر اپنے پسندیدہ امیدوار کو ملازمت یا پروموشن دینے کے لیئے سارا کرائیٹیریا (Criteria) ہی بدل دیتا ہے۔اگر امیدوار رولز کے فریم میں فٹ نہیں آتا تو کیا ہوا رولز کو پسندیدہ امیدوار کے مطابق تو بنایا جاسکتا ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ آئین اس لیئے ضروری ہوتا ہے کہ کوئی اپنی من مانی نہ کر سکے اور ہر کام آئین اور قانون کے دائرے میں رہ کر ہی ہو سکے۔آئین میں تبدیلی کے لیئے کوئی بہت اہم جواز ہونا چاہیئے ۔یہ نہیں کہ جب جی چاہا ترمیم کر ڈالی۔لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم آئین توڑتے ہیں اور اسکی شق جس کے تحت آئین توڑنے والے کو غدار قرار دیا جاسکے، کسی کام کی نہیں رہتی۔بالکل اس پستول کی طرح جو ہم خریدتے تو ہیں اپنے تحفظ کے لیئے لیکن ڈاکو سب سے پہلے وہ ہی ہتھیا لیتا ہے۔ہمارے ملک کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوتا رہا ہے۔لیکن ہر آٹھ دس سال بعد ہم خوش ہو جاتے ہیں کہ شکر ہے آئینہ، (معاف کرنا) آئین محفوظ ہے جس کے تحت نئے

الیکشن ہونگے۔الیکشن کے بعد بھی کبھی کبھی عجیب صورت حال ہو جاتی ہے جب کوئی اینلائٹنڈ دانشور سوال اٹھاتا ہے کہ نئے ممبران پی۔سی۔او۔کے تحت حلف اٹھائیں گے یا ۲۷۳ کے آئین کے تحت !! اب ۲۷۳ کے بھی دو آئین ہیں۔ایک اوریجنل اور دوسرا ترامیم والا اور ممبران مخمصے میں پڑ جاتے ہیں۔یہ کوئی نہیں کہتا کہ چلو اللہ کو گواہ بنا کر اللہ کی کتاب پر ہاتھ رکھ کر آئین کی پاسداری کی قسم کھاتے ہیں۔تاکہ خلاف ورزی کرنے والا دنیا میں نہیں تو آخرت میں ضرور خوار ہو۔قران پر قسم کھانے میں ایک فائدہ یہ ہے کہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ کی ہے۔آئین کی نہیں۔آئین تو اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتا۔ہم نے ایک فلم 'نواب سراجالدولہ' میں دیکھا تھا کہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے ہوئے غدارِ ذلیل' میر جعفر' کا ہاتھ کانپ جاتا ہے۔اس کا جو حشر بعد میں ہوا اور جو رسوائی اسے ملی وہ اس سزا کا عشرِ عشیر بھی نہ ہوگی جو انشااللہ اسے آخرت میں ملے گی۔جھوٹی قسم کھانے پر اس کا انجام ایک طرف لیکن اللہ کا نظام کچھ اور بھی ہے۔میر جعفر کا نواسہ پاکستان کا صدر بنا، ۱۹۵۸ میں بے توقیر اور رسوا ہوا اور دیار غیر میں دفن ہوا۔جو باتیں رسوائی کی مد میں آتی ہیں، بے توقیر اشخاص اسے عزت افزائی سمجھتے ہیں۔اس صدر کی بیگم کو ایک اسمگلر نے نولکھا ہار دیا جسے وہ دونوں عزت افزائی سمجھتے رہے، اور بیگم فخریہ وہ طوق زیبِ گلو کرتی رہی۔قرآن پر قسم اٹھوانا عوام کی خواہش تو ہو سکتی ہے لیکن شائد ہمارے سیاستدان یہ پسند نہ فرمائیں کہ ان میں سے کئی ایک کے ہاتھ کانپ جانے کا خدشہ رہے گا۔بشرط یہ کہ قرآن، زندہ قرآن ہو (زندہ قرآن کی اصطلاح کے لیئے ہمارا مضمون' جو کچھ کہوں گا سچ کہونگا' ملاحظہ فرمائیے۔

عادتاً چلتے چلتے ایک بات۔۔کہ تقریباً ہر مضمون کے بعد ہم کوئی لطیفہ، کوئی حکایت، یا تاریخ کا کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں۔اس لیئے برسبیلِ تذکرہ۔۔قائداعظم نے اپنی سیاسی زندگی میں سینکڑوں تقریریں کیں لیکن کبھی بھی سیکیولرزم کا لفظ استعمال نہیں کیا۔لیکن ہمارے دانشور یہ ثابت کرنے پر تلے ہیں کہ وہ سیکیولرزم چاہتے تھے۔اس ضمن میں ایک تقریر کا حوالہ بڑی شدومد سے دیا جاتا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اب پاکستان میں مسلمان ہندو سکھ عیسائی سب کو یکساں حقوق حاصل ہونگے۔دانشور یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کے شائد دو یا تین دن بعد ہی تقریبِ حلف برداری میں ماؤنٹ بیٹن کے اس مشورے پر کہ اب پاکستان کو چاہیئے کہ اکبرِ

اعظم کا طرزِحکومت اپنائے۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا' آپ کو اس کی 'چنتا' کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے نبی ﷺ نے تیرہ سو سال پہلے ہمیں بتا دیا تھا کہ ہمارا آئین کیسا ہوگا۔''

(ہم نے چنتا کا لفظ جان بوجھ کر لکھا ہے کہ نئی نسل کو بھارتی فلموں کے طفیل' تردّد' سے زیادہ چنتا سمجھنا آسان لگے گا)۔ دانشور شاید عقل کے اندھے ہیں کہ انہیں یہ تقریر سجھائی نہیں دیتی۔ جس میں واضح اشارہ تھا کہ پاکستان کا آئین کیسا ہوگا۔

۶ جون ۲۰۰۸ء

عوام کے مطابق

پاکستان اور بانیء پاکستان پر کتابیں لکھی تو گئیں مگر بہت ہی کم تعداد میں۔ اور شائد وہ بھی بے دلی سے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کا ذکر کیا۔ پاکستان کے ائرپورٹس کے بک اسٹالوں پر بھی گاندھی اور نہرو پر لکھی گئی کتابوں کی موجودگی اور قائداعظم پر لکھی گئی کتابوں کی عام طور پر عدم دستیابی ہماری قوم، بالخصوص ہماری حکومت کی بے حسی کا مونہہ بولتا ثبوت ہے۔ پاکستان اور قائدؒ پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں تشنگی کے احساس کے ساتھ ساتھ غیر دلچسپی کا دکھ بھی ہوتا ہے۔ پہلے تو ۱۴ اگست، ۱۱ ستمبر اور ۲۵ دسمبر کو اخبارات کی خصوصی اشاعت کے ذریعے کچھ نہ کچھ پڑھنے کو مل جاتا تھا لیکن آج یہ سلسلہ بھی مفقود ہو گیا ہے۔ نصاب سے بھی پاکستانیت، اسلام اور اخلاقیات کو دیس نکالا مل رہا ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ نئی پاکستانی نسل شائد قائد اور دو نظریئے کے بارے میں بالکل ہی مفقود الخبر ہو جائیگی۔ قائد کی قدآور شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے سے موجودہ حکمرانوں کے قد کاٹھ میں کمی واضع ہونے کے خطرے کے پیشِ نظر ان پر لکھنے والوں کی ہمت افزائی نہ کرنے کی تو سمجھ آتی ہے لیکن پاکستان کا مطالبہ کرنے کی وجوہات کے ذکر سے پہلوتہی کی وجہ سوائے اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ بدقسمتی سے سیاست و صحافت پر کانگریسی مسلمانوں اور سیکیولرزم کے داعیوں کا غلبہ ہو گیا ہے۔ چند ایک صحافیوں، سیاستدانوں اور فلاحی تنظیموں کے علاوہ ہر ایک بھارت کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے۔ ایسے میں یہ کب چاہیں گے کہ نئی نسل کو دو قومی نظریئے کے بارے میں آگاہی ہو۔

پاکستان کے بارے میں لکھی گئی کتابوں میں سید حسن ریاض کی کتاب ایسی ہے، جس کا نام ہی کافی ہے۔ اس کے عنوان سے ہی اصل داستان کا پتہ چل جاتا ہے۔ یعنی کتاب کے نام '' **پاکستان ناگزیر تھا** '' سے ہی پاکستان کی اہمیت اجاگر ہو جاتی ہے۔ ہند کیوں تقسیم ہوا ؟ یہ جاننے کے لیئے اگر ہم **نام نہاد طبقے** (سیاستدانوں، مولویوں، صحافیوں اور دانشوروں) کی بجائے **بے چارے عوام** کی نظر سے دیکھیں تو بغیر کسی سیاسی، مذہبی یا

فلسفیانہ بحث میں الجھے، سیدھے سادھے طریقے سے جان لیں گے کہ پاکستان کیوں ناگزیر تھا۔ایک سیدھے سادھے عام آدمی کی نظر میں انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان پر مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کے خاتمے کے بعد فطرت کے عین مطابق تھا کہ ہندو، مسلمانوں کی بہ نسبت انگریز کے زیادہ قریب ہوں۔مسلمان حکمرانوں نے تو ساری اقوام کو یکجا رکھا ہوا تھا۔جبکہ انگریز پہلے ہی دن سے 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کے اصول پر عمل پیرا تھے۔گرچہ ان ہزار برسوں میں کبھی بھی مسلمانوں کی (بشمول اکبر اور عالمگیر) صحیح (اسلامی) حکومت نہیں رہی (اسلامی نقطہءنظر سے عالمگیری دور بھی اسلامی نہیں تھا۔اسلام میں بادشاہت کا کیا کام۔بقول ابن انشا کے عالمگیر نے نہ کبھی کوئی نماز چھوڑی نہ ہی کوئی بھائی چھوڑا۔کیا اسلام میں بھائیوں کا قتل جائز ہے یا باپ کو زندان میں ڈالنا)۔لیکن پھر بھی ہندوؤں کو مسلمانوں سے پرخاش ہونا فطرت کے متقاضی تھا۔ہندوؤں نے انگریزوں کو قبول کرتے ہوئے ان کے طور طریقے اپنانے شروع کر دیئے۔جبکہ مسلمان ان سے برگشتہ ہی رہے۔اس لیئے تعلیم سمیت ہر میدان میں پیچھے رہ گئے۔چند مسلمانوں نے مراعات (خان بہادری، نوابی، جاگیرداری، وڈیرہ شاہی اور سرداری) کے عیوض انگریزوں کا ساتھ دینا شروع تو کر دیا لیکن عام مسلمانوں کو ہر طرح سے محکوم ہی رکھا۔رہی سہی کسر مولویوں کے فتووں نے پوری کر دی کہ یہ کرنا حرام ہے اور وہ کرنا کفر۔انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو راغب کرنے کے جرم میں سرسید احمد خان کافر ٹھہرے۔لاؤڈ اسپیکر اور انگریزی لباس استعمال کرنا حرام ہوا۔قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ بھی کفر کے الزام سے نہ بچے (اللہ کا کرم دیکھئے کہ ان دونوں کے مزار پر رات دن قران اور فاتحہ خوانی ہوتی ہے جبکہ ان کو کافر کہنے والے مولوی اور مفتی اپنی اپنی قبروں سے بجا طور پر دہائی دے سکتے ہیں کہ۔ع

بر مزارِ ما غریباں ،نے چراغاں ، نے گلے

آج بھی ایسے مولویوں کی کمی نہیں جو کالروں والی قمیض کو غیر اسلامی سمجھتے ہوئے بغیر کالر کی قمیض پہنتے وقت بھول جاتے ہیں کہ پادریوں کا مذہبی چوغہ بھی بغیر کالر ہی کا ہوتا ہے۔انگریزوں نے ان مولویوں کو خوب استعمال کیا اور ان کو آپس میں تقسیم کر دیا۔نئے نئے فرقے وجود میں آ گئے۔قادیانیت کی تخلیق ہی نہیں ہوئی بلکہ مسلمانوں کو مدرسوں تک میں بانٹ دیا ہندوؤں کی مسلمانوں سے جو نفرت مسلمانوں کے دور میں دبی

ہوئی تھی، انگریزوں کی عملداری میں ظاہر ہونا شروع ہوئی لیکن عبوری حکومت میں کانگریس کی اکثریت میں یہ چنگاری بنارس میں قتلِ عام کی صورت میں بھڑک اٹھی۔پھر تو مسلمان ملیچھ ٹھہرے اور ہندو ٹی اسٹال اور ہندو پانی نے ہندوؤں کی قلعی اتار دی۔گاندھی خاموش، کانگریس متحرک۔مولانا حسین احمد مدنی کو انگریز دشمنی میں ہندو مسلم ایک نظر آ رہے تھے۔مولانا آزاد اور دیگر کانگریسی مسلمان سیاستدانوں کو اکھنڈ بھارت میں مسلمانوں کی بھلائی نظر آ رہی تھی۔تنہا مسلم لیگی ڈٹے ہوئے تھے کہ پاکستان کی صورت میں ہی نجات ہے۔مولانا آزاد کو غم تھا کہ پاکستان بننے کے بعد شاہی مسجد میں کون نماز پڑھنے آئے گا۔مسلمان کمزور ہو جائیں گے۔(جیسے اس وقت بہت مضبوط تھے)۔مذہبی رہنما بٹ گئے تھے مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا تھانوی جیسے جید علماء قائدؒ کے ساتھ تھے۔مسلمان پریشان تھے کہ کس کی سنیں۔اگلے پچھلے حالات کی روشنی میں مسلم لیگ کا موقف درست لگ رہا تھا۔مسلم لیگی رہنما چاہتے تھے کہ جس طرح ہندو کانگریس میں یک جا تھے مسلمان بھی ایک ہی سوچ کے حامل ہو جائیں۔لیکن ۔ع

اے بسا آرزو کہ خاک شد۔۔۔۔۔

گرچہ شروع میں قائد نے بھی چاہا کہ ہندو مسلمان متحد ہو جائیں اور اس کے لیئے اتنی کوششیں کیں کہ سروجنی نائیڈو جیسی کانگریسی رہنما نے قائد کو ایمبیسیڈر آف یونیٹی (Ambasador of Unity) کا خطاب مرحمت فرما دیا۔لیکن نہرو کے ہندو اکثریت کے زعم میں جمہوریت کے بارے میں خیالات سن کر مسلمانوں کے لیئے علیحدہ وطن ناگزیر ہو گیا۔اور قائد اور مسلم لیگ نے الگ وطن کا مطالبہ کر دیا۔نام نہاد مسلمان سیاستدان اور نام نہاد مذہبی رہنما مخالفت پر کمربستہ رہے اور بھونڈی بھونڈی تاویلوں سے مسلمانوں کو گمراہ کرتے رہے۔مثلاً

ا۔تقسیم کے بعد مسلمان کمزور پڑ جائیں گے

تو پہلے کونسے مضبوط تھے۔کم از کم پاکستان کے پلیٹ فارم سے بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیئے آواز تو اٹھاتے ہیں اور واقعی صرف پاکستان ہی آواز اٹھاتا ہے اور بھارت کو نکیل ڈالے ہوئے ہے۔اگر اندرونی سازشیں نہ ہوتیں تو کیا بنگلہ دیش کبھی وجود میں آ سکتا تھا

۲۔۔دنیا میں تقریباً ۵۰ مسلمان حکومتیں ہیں تو ایک اور کیوں؟

بتایا گیا کہ یہ مملکت دوسروں کی قیادت کرے گی۔ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ ایک پاکستان دوسری تمام مسلمان حکومتوں پر بھاری ہے۔کیا تمام تر دولت کے باوجود کسی اور نے ایٹمی صلاحیت حاصل کی۔کیا پاکستان کی ٹیکنالوجی بھارت سے بہتر نہیں۔

۳۔۔پاکستان بنانے کے جرم میں وہاں رہ جانے والے مسلمانوں پر ہندو ظلم کریں گے۔

گویا دل میں مانتے تھے کہ ہندو کی فطرت کیا ہے۔ چلئے مسلمانوں کے خلاف نفرت ٹھیک لیکن عیسائیوں اور سکھوں نے تو کوئی علیحدہ مملکت نہیں قائم کی پھر ان کا اکثر و بیشتر قتل عام کیوں؟ حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ اور مولنا آزاد تو طرفدارِ کانگریس تھے۔انہوں نے وہاں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیئے کیا کیا؟ اگر یہ مسلمان سیاستدان اور مذہبی رہنما اپنی دفلی اپنا راگ کی بجائے قائد اور مسلم لیگ کا ساتھ دیتے تو ہمیں تمام مسلمانوں کے تناصب سے بڑا حصہ ملتا۔کانگریسی مسلمانوں کی وجہ سے انگریز اور ہندوؤں نے بے ایمانی سے تقسیم میں بندر بانٹ سے کام لیتے ہوئے طے شدہ اصولوں سے انحراف کیا اور کشمیر ہی نہیں، حیدر آباد دکن، جونا گڈھ اسٹیٹ کے علاوہ پنجاب اور بنگال میں بھی زیادتی کی۔ ہندوؤں سے کیا گلہ لیکن انصاف کے چیمپین برطانیہ کو ہمارے دانشور کس بنیاد پر منصف مزاج گردانتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ انگریزوں اور کانگریس کو شکست دینے والے قائد کے ساتھی مسلم لیگی رہنما، غلام محمد، گورمانی، اسکندر مرزا اور ایوب خان کی سازشوں کا شکار ہو گئے اور محبّ وطن لیاقت علی خان۔خواجہ ناظم الدین۔محمد علی بوگرہ۔ چودھری محمد علی۔حسین شہید سہروردی ۔آئی آئی چندیگر۔سردار عبدالرب نشتر۔اور مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح جیسے رہنما جنہوں نے کانگریس اور انگریزوں کو زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا اپنوں کے ہاتھوں بیدخل ہوئے۔ع

؎ مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیئے

اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ اس ملک کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کے ذمے دار عوام نہیں بلکہ وہ مراعات یافتہ طبقہ ہے جسے ہم دانشور، مذہبی رہنما، سیاستداں اور این جی اوز کہتے ہیں (ان کے ساتھ 'نام نہاد' کا لاحقہ

استعمال کرنا ضروری ہے)۔ان کی ایک پہچان یہ ہے کہ ان سب کا قبلہ بھارت اور امریکہ ہیں۔انکی خواہش ہے کہ ہم بھارت کی برتری (supermacy) قبول کرلیں یا واہگہ بارڈر پر دیئے روشن کر کے اپنائیت کا مظاہرہ کریں۔امن کے نام پر عیاشی کریں۔بس یہ ضمانت چاہیے کہ جنگ کی صورت میں کوئی پتھران کی لوٹی ہوئی دولت سے تعمیر شدہ شیش محل کو چکنا چور نہ کر دے۔ان کا تو ایمان ہے کہ جان ہے تو جہان ہے۔یہ تو چاہتے ہیں کشمیر دے دو، کارگل دے دو، سیاچن دیدو۔دریا دے دو (ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے بیچ دو)۔بس جنگ نہ کرو۔ہماری ھیومن رائٹس تنظیمیں بھی خوب ہیں۔انہیں حقوق یاد آتے ہیں تو قیدیوں کے۔مجرموں کے۔کشمیر یا فلسطین کے لیئے ان کے پاس وقت کہاں؟ بے چارے عوام کو الزام دیا جاتا ہے کہ یہ ووٹ کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔عوام پوچھتے ہیں کون کہتا ہے ہم صحیح ووٹ نہیں دیتے۔ہم ووٹ تو صحیح دیتے ہیں لیکن نتائج جوان نام نہاد لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں، رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ارے کوئی طریقہ ڈھونڈو کہ عوام خود دیکھ سکیں کہ نتائج کیسے مرتب ہوتے ہیں۔پھر ہم بتائیں گے ہم "بیچارے عوام" کتنے باشعور ہیں۔اگر ایک بار بھی عوام کی رائے کا احترام ہو گیا تو دنیا دیکھے گی کہ پاکستان G 8- کو G-9 کیسے بناتا ہے۔دور کی کوڑی لانے کی ضرورت نہیں اگر ۱۹۷۰ء میں عوام کی رائے کا احترام ہو جاتا تو کیا بنگلہ دیش بن سکتا تھا۔عوام یہ بھی جانتے ہیں کہ نام نہاد طبقہ سمجھتا ہے کہ خبر وہ نہیں ہوتی جب کتا آدمی کو کاٹ لے۔ہاں اصل خبر وہ ہوگی جب آدمی کتے کو کاٹے گا۔اس ہی لیئے اس پر صدق دل سے عمل کر رہے ہیں۔ایک مثال پیشِ خدمت ہے۔ہمارے چند ایک بزرگ اور نوجوان صحافی اور دانشور حضرات میڈیا میں 'ان' رہنے کے لیئے سمجھتے ہیں قائد اور پاکستان کی مخالفت ضروری ہے۔(سمجھتے ہیں کہ موافقت میں میڈیا میں پذیرائی نہیں ہوگی) اس ہی لیئے کبھی پاکستان تو کبھی قائدِ اعظم پر رکیک حملے کرنے کی جسارت کرتے ہیں تو کبھی ڈاکٹر قدیر اور ایٹم بم ان کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔اور پھر ایک دو تو یوٹرن (U-Turn) لینے کے بھی ماہر ہیں۔ان میں سے وہ جو کمیونزم کے ڈھیر ہو جانے پر زخم خوردہ ہیں وہ تو پاکستان کی ہر اس چیز کے مخالف ہیں جس میں پاکستان کے لیئے بہتری کی امید نظر آتی ہو، حتیٰ کہ اب انہیں چیف جسٹس افتخار چودھری کی بحالی میں بھی برائی نظر آنے لگی ہے یہ بھی المیہ ہے کہ ایسے صحافی حقانی ہوں یا ناجی سینئر ہونے کے ناطے جب

چاہتے ہیں اپنا قبلہ بدل لیتے ہیں۔ان میں سے ایک تو وہ ہیں جنکے صاحبزادے کو ٹی وی پر ملازمت مل جاتی ہے۔اس لیئے کیا کریں حکومت وقت کا ساتھ نہ دیں تو کیا کریں۔قائد کو سیکیولر ثابت نہ کریں تو کیا کریں۔حکومت جسٹس افتخار کو بحال نہیں کرنا چاہتی تو یہ بھی کب چاہتے ہیں۔کل تک چاہتے تھے تو اس کی وجہ بھی کچھ اور تھی کل تک نواز شریف کی تقاریر لکھنے والوں کو نواز شریف میں کیڑے نظر آنے لگے ہیں۔ارے بابا جو چاہو کرو۔مگر قائد اور نظریہ پاکستان پر رحم کرو۔تمہارا علم اتنا نہیں کہ قائد کی تقاریر کا تجزیہ کرسکو۔عوام کو ساری تقاریر سنوادو وہ خود فیصلہ کرلیں گے کہ قائد کیا چاہتے تھے۔ہمیں کسی ناجی ، حقانی، پروفیسر مہدی حسن یا (ڈاکٹر) مبارک علی کی ضرورت نہیں۔ہمیں ان دانشوروں کی بھی ضرورت نہیں جنہیں ٹیوی نے دانشور بنادیا۔
بے چارے عوام کتنا صحیح سوچتے ہیں

۲۷ جنوری ۲۰۰۹

جعلی ڈاکٹریٹ

ہمیں ٹی وی کے اینکر پرسنز سے یہ شکایت ہے کہ یہ کبھی کسی قضیے کو اسکے اختتام تک نہیں پہنچاتے۔تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کافی عرصہ پہلے ایک آن لائن 'عالم' کی ڈاکٹریٹ کے بارے میں شور اٹھا تھا کہ وہ جعلی ڈگری ہے۔کچھ دن تک مخالفت اور موافقت کا سلسلہ چلتا رہا۔اسپین کی اس یونیورسٹی کا بھی ذکر ہوا جس نے یہ ڈگری دی تھی۔بتایا گیا ایسی کسی یونیورسٹی کا وجود ہی مشکوک ہے۔کچھ ثبوت بھی پیش ہوئے کہ ایم۔اے اور ڈاکٹریٹ کے حصول کے درمیانی وقفے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دورانیہ ناکافی تھا۔کچھ دن یہ سلسلہ چلا۔اس کے بعد بغیر کسی نتیجے کے یہ معاملہ داخل دفتر ہوا۔کچھ عرصے بعد ایک نام نہاد مورخ کی ڈاکٹریٹ کا ذکر بھی اخبارات کی زینت بنا۔لیکن نتیجہ وہی رہا اور وہ (ڈاکٹر) مورخ سے زیادہ دانشور کی حیثیت سے ٹاک شوز میں جلوہ گر ہوکر نظریہء پاکستان کی مخالفت کرتا رہا۔ایک ٹاک شو میں تو اس نے کھلے لفظوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ وہ ۴۷ء میں ہوتا تو پاکستان کے خلاف ووٹ دیتا۔

یہ بھی المیہ ہے کہ یونیورسٹی میں بار بار ایک ہی کورس ہر سال پڑھانے والے لیکچررز بھی اپنے تئیں ایکسپرٹ بن بیٹھتے ہیں۔اس میں سائنس یا آرٹس کی کوئی قید نہیں۔یونیورسٹی میں فزکس پڑھاتے پڑھاتے ایک لیکچرر تو سائیٹسٹ بن کر ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور پاکستانی ایٹم کے خلاف زہر افشانی کرتے رہتے ہیں۔انہیں اور کچھ نہیں تو یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کوئی بھی ہمارے ایٹم بم کو استعمال کرسکتا ہے کیوں کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں نہیں ہے۔فزکس کے اس لیکچرار کو یہ نہیں معلوم کہ ایٹم بم باورچی خانے میں استعمال ہونے والی چھری نہیں کہ کوئی بھی اسے اٹھا کر کسی کو بھی زخمی کردے۔افسوس ہوتا ہے کہ میڈیا ان سے یہ نہیں پوچھتا کہ جناب آپ نے خود کوئی تیر مارا ہو تو وہ سامنے کیوں نہیں لاتے۔دس بیس سال تک ایک ہی کورس پڑھاتے پڑھاتے تو کوئی بھی

مضمون از بر ہوسکتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ اس مشکوک ڈاکٹریٹ والے تاریخ داں سے کوئی نہیں پوچھتا کہ بھائی صاحب تاریخ کے حوالے سے آپنے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ کیا تاریخ پڑھانے والا ہر لیکچرار مورخ کہلانے کا حقدار ہوسکتا ہے۔ کوئی اس آن لائن عالم سے بھی یہ نہیں پوچھتا کہ اسپین میں کیا یہ ہی پڑھایا گیا تھا کہ ٹی وی پر تو صحابہ کو رضی اللہ تعلیٰ عنہ کہو لیکن نجی محفل میں اچھل اچھل کر اور پہلو بدل بدل کر ان کو خوب برا بھلا کہو۔ پہلے تو ہم لوگ جعلی میڈیکل پریکٹشنروں (Quakes) سے ہی تنگ تھے جو عوام کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں لیکن اب ہمارا پالا جعلی 'Ph.D' ڈاکٹروں سے پڑنے لگا ہے۔ جو ہماری صحت سے تو نہیں لیکن ہمارے عقیدے اور ہمارے نظریات کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے ایک اور جعلی ڈاکٹر کا انکشاف ہوا۔ جس نے ہمیں پریشان کر دیا ہے کیونکہ ہم ان (ڈاکٹر) صاحب کا وہ پروگرام بڑے شوق سے دیکھتے تھے جس میں ڈاکٹر صاحب قران اور موجودہ قوانین کے بارے میں بڑا مدبرانہ موازنہ کرتے ہیں۔ 'دیکھتے تھے' ہم نے اسلئے لکھا کہ اب نہیں دیکھتے۔ وجہ یہ ہوئی کہ ایک دن خبر ملی کہ موصوف کی ڈگری جعلی ہے۔ اس انکشاف کے بعد جب ہم وہ پروگرام دیکھنے لگے تو ایسا لگا کہ موصوف جھوٹ بول رہے ہیں۔ اب آپ خود غور فرمایئے کہ قران کے حوالے سے کوئی کچھ کہہ رہا ہو اور ہمیں معلوم ہو کہ یہ شخص جھوٹا ہے تو پھر اس کے مونہہ سے نکلی سچ بات بھی غلط لگے گی اور پھر ذکر قران کا ہو تو پریشان ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ اب ان کی ہر بات جھوٹی لگتی ہے۔ اور پھر بات قرآن کے حوالے سے ہو تو خواہمخواہ گناہگار ہونے کی کیا ضرورت۔ ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ہمیں اینکر پرسنز سے شکایت ہے اور بجا ہے کیونکہ اب تک انہوں نے یہ ثابت نہیں کیا کہ الزام درست تھا یا غلط۔ ڈاکٹر موصوف چونکہ سیاستدان بھی ہیں اور تعلق بھی اس پارٹی سے ہے جس نے جھوٹ اور وعدہ خلافی میں ڈاکٹریٹ لی ہوئی ہے۔ اس لیئے ہمیں یقین ہے کہ الزام درست ہی ہوگا۔ اس کی سند اس سے بھی ملتی ہے کہ ایک ٹاک شو میں جب برسبیل تذکرہ ان کی ڈگری کا ذکر ہوا تو موصوف نے بجائے صفائی میں کچھ کہنے کے بڑی بے اعتنائی سے کہدیا کہ میں اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتا اور یہ ٹھیک ہی کیا، کیونکہ ہوسکتا ہے 'نماز بخشوانے گئے تو روزے گلے پڑ گئے

مصداق' کہیں بی اے اور قانون کی ڈگریاں بھی گلے نہ پڑ جائیں۔ آخر میں ہم میڈیا سے عرض کریں گے کہ وہ اس قسم کے ہر الزام کو اس کے انجام تک پہنچائے یا پھر ذکر ہی نہ کرے۔ اب تو تحقیقاتی صحافت (Investigating Journalism) کا زمانہ ہے اس لیئے نیوز بریک کرنے سے پہلے پوری تحقیقات کرنے میں کیا چیز مانع ہوسکتی ہے۔ کیا معلوم ہم بلاوجہ ٹی وی کے اس پروگرام سے محروم کر دیئے گئے ہوں جس میں ڈاکٹر صاحب قران کے حوالے سے پروگرام کرتے ہیں۔۔ واللہ اعلم۔۔۔ ویسے کم از کم پرنٹ میڈیا کو چاہیئے کہ جب تک ثابت نہ ہو کہ ان تینوں حضرات کی ڈگری اصلی ہے ان کو بریکٹ میں (ڈاکٹر) لکھنا چاہیئے، پھر مسئلہ صرف الیکٹرونک میڈیا کے لیئے رہ جائے گا کہ کیا انہیں نام نہاد ڈاکٹر کہہ کر مخاطب کیا جائے۔۔

۱۰/مارچ ۲۰۰۹ء

ف سے کوا

جی ہاں۔کوا'ف' سے ہی ہوتا ہے۔اور یہ ثابت کرنے کے لیئے ہمیں زیادہ تگ ودو بھی نہیں کرنی پڑیگی۔لیکن اس سے پہلے ہم یاد دلانا چاہیں گے کہ پچھلی حکومت کے نامی گرامی وزرا کس طرح دھڑلے سے ٹی وی پر ثابت کر دیتے تھے کہ کوا سفید ہوتا ہے اور جب بولتے تھے تو اینکر پرسن سمیت تمام شرکاء کی بولتی بند ہو جاتی تھی اور ہم جیسے بیچارے عوام یہ سوچتے رہ جاتے تھے کہ یا اللہ کیا ان سے زیادہ جھوٹ بولنے والا بھی کوئی ہو سکتا ہے۔اس وقت ہمیں شائد کفن چور والی یہ حکایت معلوم نہ تھی کہ کس طرح ایک کفن چور نے مرتے ہوئے وصیت کی تھی کہ بیٹا تم ایسے کام کرنا کہ لوگ مجھے اچھے لفظوں میں یاد کریں۔ بیٹے نے بھی کفن چرانا تو شروع کر دیا لیکن یہ اہتمام کیا کہ کفن اتارنے کے بعد باپ کی طرح لاش کو دوبارہ دفن کرنے سے گریز کرنے لگا۔نتیجتاً لوگ اس کے باپ کو اچھے لفظوں میں یاد کرنے لگے کہ مرحوم لاش کو دفنا تو دیتا تھا اس کی طرح بے کفن کرنے کے بعد بے گور تو نہیں چھوڑتا تھا۔پھر مرحوم کے پوتے نے تو کمال ہی کر دیا۔وہ بے گور وکفن ہی نہیں کرتا تھا بلکہ لاش کے کان یا ناک بھی کاٹ دیتا تھا تا کہ لوگ اس کے دادا ہی نہیں باپ کی بھی تعریف کر سکیں۔میڈیا کی آزادی بلکہ کہنا چاہیئے میڈیا کی سہولت سے پہلے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے لیڈروں کو پرکھ نہ سکے تھے۔اس ہی لیئے محمد علی درانی (المعروف غلط بیانی)، ڈاکٹر شیر افگن (ماہرِ ہائین) اور وصی ظفر (وزیرِ قنون اور بدزبانی) ہمارے لیئے عجوبہءروزگار ہی رہے۔ان کے علاوہ بھی چند ایک اور تھے مثلاً محمد علی سیف لیکن وہ نہ تین میں تھے نہ تیرہ (۱۳) میں اس لیئے انہیں اس لسٹ میں شامل نہیں کر رہے۔ہاں ملک قیوم کا ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ کہانی میں ایک آدھ مزاحیہ کردار کا ہونا بھی اچھا ہی ہے۔ان کے علاوہ بھی کچھ اور تھے لیکن مضمون کی طوالت کے خوف سے اختصار سے کام لے رہے ہیں۔

بہرحال یہ چند حضرات تن من دھن سے (دیسے دھن تو کمانے کے لیئے ہوتا ہے لٹانے کے لیئے نہیں) مشرف

اور شوکت عزیز کے ہر سیاہ کارنامے کو سفید بتانے کے چکر میں تقریباً ہر روز ہی کوے کو سفید بناتے رہے اور آخر تک شرمندہ بھی نہیں ہوئے (آخر سے مراد آخرت نہیں)۔اور جاتے جاتے اپنی جگہ ایسوں کو دے گئے جن کے بیانات سے یہ ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جانے والے اتنے بھی جھوٹے نہ تھے۔اب آپ جن لوگوں سے استفادہ کر سکتے ہیں ان میں فوزیہ۔فرزانہ اور فردوس سرِفہرست ہیں جو ثابت کر سکتی ہیں کہ کوا'ف' سے ہوتا ہے لیکن ٹھہریئے۔سیاہ اور سفید اور دھن سے یاد آیا کہ لوگ کالے دھن کو سفید کیسے کرتے ہیں۔ایک صاحب کا ہر دوسرے تیسرے مہینے انعامی بانڈ نکل آتا تھا۔کبھی پچیس ہزار کا تو کبھی لاکھ کا۔جب کہ ہمارا کبھی سو کا بھی نہیں نکلا۔ہمیں ان کی قسمت پر رشک آتا تھا۔جو ہوسکتا ہے حسد میں بدل جاتا لیکن ایک صاحب نے راز کھول دیا کہ موصوف بلیک منی کو وہائٹ کرنے کے لیئے انعام یافتہ بانڈز انعام کی رقم سے کچھ زیادہ قیمت پر خرید لیتے ہیں اور اپنی ناجائز کمائی کو جائز کر لیتے ہیں۔ایک سیاستداں سے بھی واقفیت ہے جو اپنی کچھ کتابوں کو چھپوا کر انکی تعداد سینکڑوں کی بجائے لاکھوں میں بتلاتے تھے اور پھر رائیلٹی کی آمدنی ظاہر کر کے کالا دھن سفید کر لیتے تھے۔اس ہی طرح ایک سابق صدر دورانِ صدارت لوٹے ہوئے ڈالرز کو جائز کرنے کے لیئے بین اقوامی اداروں میں لیکچرز دیتے پھر رہے ہیں جن کے عیوض انہیں لاکھوں کے حساب سے معاوضہ ملتا ہے جسکا ہمیں یقین ہے کہ موصوف یہ معاوضہ اپنی جیب سے خود کو دیتے ہیں کیوں کہ غیر ملکی اتنے بھی بیوقوف نہیں کہ دولت اس طرح لٹائیں۔یہاں بھی کوئی نہیں پوچھتا کہ ان کے لیکچرز میں ایسی کونسی دانش کی باتیں ہوتی ہیں جو صرف ان ہی کو معلوم ہیں۔موصوف نے ایک کتاب بھی لکھدی جو ردی میں بھی نہیں بک رہی لیکن اس کی رائلٹی شاید لاکھوں میں وصول کی جا چکی ہے۔ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ کوا'ف' سے ہوتا ہے۔اس کو سمجھنے کے لیئے آسان ہوگا اگر آپ ٹی وی پر فوزیہ وہاب یا فرزانہ راجہ یا فردوس عاشق کو دیکھتے رہے ہوں۔ان کو ایسی باتوں کو ثابت کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔اپنی بات ثابت کرنے میں اتنی ماہر ہیں کہ اینکر پرسن بھی لاجواب ہو جاتے ہیں۔مثلاً جب ایک اینکر نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیئے ان میں سے ایک خاتون کو محترمہ بھٹو کی کلپ دکھائی جس میں وہ چیف جسٹس کے گھر کے باہر کہہ رہی تھیں کہ ہم چیف کے گھر پر دوبارہ پاکستان کا جھنڈا لگائیں گے اور انہیں بحال کریں گے۔تو یہ سننے اور دیکھنے کے باوجود نہیں مانیں اور فرمایا کہ

محترمہ نے افتخار چودھری کا کب نام لیا تھا۔اس ہی طرح شیری رحمٰن کے استعفے کی خبر کو جھٹلا دیا لیکن دوسرے دن جب استعفیٰ منظور بھی ہو گیا تو فرمایا کہ اس خاتون (شیری رحمٰن) سے تو پندرہ دن پہلے ہی استعفیٰ مانگ لیا گیا تھا۔مثالیں تو اور بھی ہیں لیکن اس پر ہی اکتفا کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں یہ خواتین جس طرح کے دلائل دیتی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بعید نہیں کہ کہدیں کہ جب ہمارا نام 'ف' سے ہوتا ہے اور فخر الدین کیفی بھی 'ف' سے ہوتا ہے۔تو ثابت ہوا کہ کوا بھی 'ف' سے ہی ہوتا ہے۔

آخر میں ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ حکومت نے چیف جسٹس کو بحال کر کے حزب اختلاف، وکلاء اور سول سوسائٹی پر ہی احسان نہیں کیا بلکہ ان وزرا کی بھی جان بخش دی جو حکومت کا دفاع کرنے کے لیئے جھوٹ کے وہ وہ طومار باندھ رہے تھے کہ بیچارے خود بھی انگشت بدنداں تھے۔۔۔لیکن نہیں!! کیسی جان بخشی !! اگر دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو لگتا ہے حکومت خود نہیں چاہتی کہ اس کے وزرا سچ بولیں اس ہی لیئے چیف کی بحالی کے بعد انہیں اپنا زور خطابت یہ ثابت کرنے پر لگا دیا ہے کہ ''ہم تو شروع سے ہی چیف کو بحال کرنے کے حامی تھے''

۱۶/مارچ ۲۰۰۹ء

نام نہاد دانشور اور نظریہء پاکستان

چند دنوں سے اخبارات میں قائد اعظم اور علامہ اقبال کے حوالے سے چند سیکیولر ذہنیت کے حامل ہرزہ سرائی کر رہے ہیں۔جس کے جواب میں ڈاکٹر صفدر محمود کے علاوہ دوسرے کالم نگار بشمول رانا عبدالباقی اور فضل حسین اعوان پوری تندہی سے دلائل کے ذریعے ان عناصر کو قائل کرنے کی سعئ کر رہے ہیں۔لیکن ع

مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہماری قوم نام نہاد دانشوروں، مبصروں اور مورخوں کے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی ہے۔کبھی حقانی، کبھی پروفیسر مہدی حسن تو کبھی حسن نثار اور (ڈاکٹر) مبارک یا ڈاکٹر ہود بھائی جیسے لوگ بڑی خوبصورتی سے قائدِ اعظم کو سیکیولر ثابت کرنے کی کوشش میں جت جاتے ہیں۔یہ لوگ کھینچ تان کر قائد کے بیانات سے وہ بات نکال لاتے ہیں جس کا قائد نے کبھی اظہار ہی نہیں کیا۔بس ''وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا'' والی بات ہوتی ہے۔مزے کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ دلیل سے بھی قائل نہیں ہوتے۔بس میں نہ مانوں والا طرزِ عمل ہوتا ہے۔بیچارے ڈاکٹر صفدر محمود یا فضل حسین اعوان اور رانا عبدالباقی جیسے نظریہء پاکستان کے حامل کہاں تک دلیلیں دیتے رہیں۔

ہمارے ان نام نہاد دانشوروں پر تو وہ لطیفہ صادق آتا ہے جس میں ایک صاحب کسی لڑکے سے اس کی تعلیم پوچھتے ہیں جواب میں یہ سن کر کہ لڑکا خیر سے بی۔اے۔ہے تو کہتے ہیں 'ماشااللہ!۔لیکن صاحبزادے میٹرک بھی کر لیتے تو زیادہ اچھا ہوتا'۔اور واقعی یہ نام نہاد دانشور ایسے ہی ہیں۔انہیں بھی قائد کی ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کی تقریر یا تقریب حلف برداری میں ماؤنٹ بیٹن کو دیا گیا دندان شکن جواب یاد نہیں آتا جس میں واضع طور پر

قائد نے کہا تھا کہ آپ کو ہمارے آئین کے لیئے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں کہ ہمیں یہ ۱۴۰۰ برس پہلے ہی مل گیا تھا جو اکبری آئین سے کہیں زیادہ مساوات کا درس دیتا ہے۔ان انشوروں کو صرف گیارہ اگست کی تقریر میں اپنے مطلب کی بات نظر آتی ہے حالانکہ اس تقریر میں بھی قائد نے جو کہا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اب پاکستان میں ہندو، مسلم و دیگر اقلیتیں ساتھ ساتھ رہیں گی۔کیا یہ دانشور یہ چاہتے ہیں کہ قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل کہتے۔''بھائیو اب پاکستان بن گیا ہے اس لیئے تمام اقلیتوں کو ختم کردو''۔ان دانشوروں کو گیارہ اگست ۱۹۴۷ کی تقریر (غلط مفہوم کے ساتھ) تو یاد ہے لیکن ۱۴ مارچ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کی تقاریر یاد ہی نہیں آتیں، جو کہ پاکستان بننے سے پہلے اور بعد میں کی گئیں تھیں۔اس کے علاوہ بھی کئی تقاریر ہیں جن میں قائد نے بغیر کسی لگی لپٹی کے اسلامی نظریات کا اشارہ دیدیا تھا۔مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں خبروں میں 'ان' رہنے کے لیئے قائد کے یا پاکستان کے خلاف کچھ کہنا ضروری ہے بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ دین کے خلاف کہنے اور لکھنے والوں کو زیادہ پزیرائی ملتی ہے۔جس طرح بین الاقوامی سطح پر یہودی لابی صحافت پر چھائی ہوئی ہے

اس ہی طرح ہمارے ملک میں بھارت نواز لابی سرگرمِ عمل ہے۔اب آپ خود غور فرمائیں کہ اگر قائد کا پائلیٹ قائد کے خلاف ہرزہ سرائی نہ کرتا تو کیا اسے اتنی اہمیت ملتی کہ اس کا تذکرہ اخباری کالموں میں ہوتا۔کیا اس کا لگایا ہوا الزام اتنا اہم ہے کہ اس پر ایک بحث کا آغاز ہوگیا ہے اس پائلٹ کے بیہودہ بیان کو اہمیت دینے والے سینئر صحافی کا علم اتنا محدود ہے کہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ماضی میں کیئے گئے فیصلوں کو ماضی کے تناظر میں ہی دیکھنا چاہیئے۔غلام محمد کو کابینہ میں شامل کرنا اسوقت کی ضرورت تھی۔کیا قائد کو الہام ہو جاتا کہ غلام محمد یا ایوب خان آگے چل کر کیا گل کھلانے والے ہیں۔اگر انہیں غیب کا علم ہوتا تو کیا ربانی جیسی ذہنیت کا حامل ان کا پائلٹ ہوسکتا تھا۔اگر مستقبل کا پتہ ہوتا تو کیا یحیٰی خان، ضیاالحق اور پرویز مشرف جنرل بن سکتے تھے۔ہماری ذاتی رائے ہے کہ ایسے نام نہاد دانشوروں کو قطعئی اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔انشااللہ یہ اپنی موت آپ مرجائیں گے۔چلتے چلتے ایک بات اور ان نام نہاد سینئر صحافیوں کے بارے میں کہ جن کا کوئی مستقل کعبہ نہیں وہ تو 'چلیئے ادھر کو جدھر کی ہوا چلے کے 'مصداق' اپنا رخ مرغ بادنما کی مانند بدلتے رہتے ہیں۔ان کے کالم نکال کر دیکھ

لیجیئے۔بےنظیر بھٹو کی حکومت میں انکے خیالات کیا تھے۔نواز شریف کے دور میں کیا تھے۔بھٹو کے بارے میں ضیاالحق کے دور میں انکے خیالات پڑھنے کے بعد آج کے زمانے میں بھی پڑھ لیجیئے۔آپ خود کہہ اٹھیں گے ۔ع

کون کہتا ہے کہ حالات بدل جاتے ہیں
وقت کے ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں

۱۸ مارچ ۲۰۰۹

یو ٹرن

ٹی وی پروگرام کے ایک میزبان نے بہت خوب کہا تھا کہ جناب چیف جسٹس افتخار محمد چودھری وہ شخصیت بن گئے ہیں کہ اب جو کوئی ان کی مخالفت کرے گا وہ رسوا ہوگا اور جو ان کی عزت اور تکریم کرے گا اس کی عزت میں 'مزید' اضافہ ہوگا۔ کالم نگار کے بیان میں 'مزید' کا اضافہ ہم نے کیا ہے کیونکہ ایک عزت دار ہی چیف کی عزت کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے پرویز مشرف تو نہیں کرسکتا جس نے اپنے اقتدار کے زمانے میں ایک ٹی وی انٹرویو میں جسٹس کے بارے میں کہا تھا۔ 'وہ ایک تھرڈ کلاس آدمی ہے'۔ اب آپ خود اندازہ کرلیں کہ ایک ایسے شخص سے کیا توقع کی جاسکتی ہے جس نے اپنی کتاب میں خود اپنی والدہ کے ڈانس کی تعریف کی ہو۔ ہم ٹی وی میزبان سے سو فی صد متفق ہیں اور اس ہی لیئے یہ مثال بھی پیش کردی ہے کہ آج مشرف کس طرح رسوا ہورہا ہے۔ آج اگر اسے آرمی ہاؤس سے بیدخل کر کے تمام دی گئی ناجائز مراعات واپس لے لی جائیں تو اسے لگ پتہ جائے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اگر وہ اتنا ہی مقبول اور عزت دار ہے تو بغیر پروٹوکول کے ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور افتخار محمد چودھری کے ساتھ کسی بھی پبلک مقام پر جا کر دکھادے معلوم ہوجائے گا کہ کس کے گلے میں پھولوں کے ہار پڑتے ہیں اور کس کے جوتوں کے۔ کون پاکستانی عوام کی نظر میں تھرڈ کلاس ہے کون فرسٹ کلاس۔ یقین جانیئے ڈاکٹر صاحب اور چیف صاحب کا دشمن کوئی کافر اور ملک دشمن ہی ہوسکتا ہے لیکن مشرف کا دشمن ہر محبِّ وطن پاکستانی ہوگا۔ خیر اس ایک مثال کے علاوہ بھی جب ہم نے غور کیا تو کالم نگار کی بات میں وزن پایا۔ اور مزید انکشافات ہوئے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، ۱۵ مارچ ۲۰۰۹ء کی رات تک جن وزرا اور دوسرے لیڈران نے چیف کے خلاف ہرزہ سرائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، انہیں ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر خوار ہونا پڑا۔ اگر کراہیت کا پہلو مدِ نظر نہ ہوتا تو ہم کہتے کہ انہیں تھوک کر چاٹنا پڑ گیا۔ اور پھر ستم بالائے ستم یہ تھا کہ ٹی وی والوں نے بھاگنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اور ساری فرعونیت و تکبر دھرا کا دھرا رہ گیا اور ایسے تمام لوگ 'پائے رفتن نہ جائے ماندن' کی تفسیر بن کر رہ گئے کیونکہ اپنے کہے کی رکارڈنگ کو کیسے

جھٹلاتے۔ مگر ہٹ دھرمی اور بے حیائی بھی تو کوئی چیز ہے۔ وہ جو کہتے تھے کہ بحالی کا سوال ہی نہیں اب یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ہم نے بی بی کی وصیت پوری کردی اور ہم تو پہلے دن سے ہی کہہ رہے تھے کہ ہم افتخار محمد چودھری کو بحال کریں گے۔ اور دیکھ لو ہم نے کردیا۔ یہ بڑی زیادتی ہوگی اگر ہم یہاں شیخ رشید کا ذکر نہیں کریں۔ موصوف پچھلی حکومت میں وزیر بنے رہے اور الیکشن ہارنے کے بعد اپنی پارٹی بنالی۔ قدرت کا فیصلہ دیکھئے کہ جو شخص بڑی رعونت سے پاکستان کی چھوٹی پارٹیوں کو تانگہ پارٹی کہتا تھا آج وہ اس پارٹی کا سربراہ ہے جو تانگے کی بجائے بغیر کیریئر کی سائیکل میں بھی سما سکتی ہے۔ نہ جانے ٹی وی چینلز کی کیا مجبوری ہے کہ وہ موصوف کو گاہِ بگاہِ بلواتے رہتے ہیں۔ اس سے خدا جانے کوئی فائدہ ہورہا ہے یا نہیں، لیکن ایک نقصان ضرور ہورہا ہے کہ موصوف خود کو ایک مدبر سیاستداں اور دانشور ہی نہیں علم الغیب کا ماہر بھی سمجھنے لگے ہیں۔ اس لیئے مونہہ اٹھا کر تبصرے ہی نہیں، پیشن گوئیاں بھی فرماتے رہتے ہیں۔ ان کی ایک پیشن گوئی تو ہمارے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہی ہے جو انہوں نے چند دن پہلے بڑی رعونت سے فرمائی تھی کہ افتخار چودھری ایک گھین ٹے (گھنٹے) کے لیئے بھی بحال نہیں ہوگا۔ ابھی ہمارا یہ زخم بھرنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک اور بیان داغ دیا اور لطف کی یہ بات ہوئی کہ موصوف نے یہ بیان بالکل کسی جلے تن فلمی بوڑھی ساس کی طرح دیا جو اپنی بہو کو کوستے ہوئے کہتی ہے 'ماٹی ملی آتے ہی اپنے سسر کو کھا گئی اب کیا مجھے کھائے گی'۔ فرمایا 'افتخار چودھری ہماری حکومت کو کھا گیا تھا اب اس حکومت کو بھی کھائے گا'۔ ملاحظہ فرمائی زبان کی شیرینی۔۔ لیکن ایک گھٹیا آدمی سے اس سے زیادہ کی توقع بھی فضول ہے۔ لیکن چیف جسٹس کی بحالی اور کالم نگار کے فرمان کے بعد ہم منتظر ہیں کے موصوف کس طرح رسوا ہوتے ہیں کیونکہ پچھلے دو تین دنوں سے وہ کسی پروگرام میں کسی اینکر پرسن کے ہتھے نہیں چڑھے۔۔ لیکن وہ دن دور نہیں۔ چلتے چلتے شیخ کا ایک اور بیان بھی پیشِ خدمت ہے جس میں لانگ مارچ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ان سیاستدانوں کو ملک سے محبت نہیں یہ تو اپنے بچوں کے لیئے راہ ہموار کررہے ہیں۔ نواز شریف کو حسن نواز کی فکر ہے تو زرداری کو بلاول کی اور پرویز الٰہی کو مونس الٰہی کی۔ برا ہو کہ عمران خان نے یہ پول کھول دی کہ موصوف کی اپنی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے جناب یہ کارِ خیر اپنے بھتیجے کے لیئے سرانجام دے رہے ہیں۔ واللہ اعلم۔ یاد آیا کہ ان کے علاوہ ایک مولانا (نام نہاد ہی سہی) نے بھی

نوائے وقت مورخہ ۳۰ جولائی ۲۰۰۹

دو تقاریب

کسی شاعر نے اپنے محبوب کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی زندگی میں دو لمحے بڑے کٹھن گذرے ہیں۔ایک محبوب کے آنے سے پہلے اور دوسرا اس کے جانے کے بعد۔ع

دو ہی لمحے زندگی میں مجھ پر گذرے ہیں کٹھن
ایک ترے آنے سے پہلے ایک تیرے جانے کے بعد

یہ تو تھا شاعر کا اور اس کے محبوب کا معاملہ۔جس میں ہر دو لمحوں کا محور ایک ہی شخص تھا۔لیکن دونوں لمحات میں شاعر کی دلی کیفیت ایک ہی سی تھی۔۔یعنی بے چینی اور غمِ فراق۔۔لیکن ہمارا بلکہ ہماری قوم کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہاں شاعری ہے نہ فرقت کے لمحات۔یہاں تو زندگی کے حقائق ہیں اور ایسی ہی ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ ہم پر اور ہماری قوم پر دو تقاریب عجیب طرح سے اثر انداز ہوئیں۔ع

ایک اُس کے جانے سے پہلے، دوجی اِس کے آنے کے بعد

دونوں تقاریب سے متاثر ہونے والی ہماری قوم ہی رہی لیکن تقاریب کی محور دو مختلف شخصیتیں تھیں۔ایک برائی کا سمبل اور دوسری اچھائی کی نوید۔ایک تقریب برائی کے جانے سے پہلے منعقد ہوئی اور دوسری اچھائی کے آنے کے بعد۔پہلی تقریب نے برائی کی رخصتی پر قوم کو ملنے والی خوشی کو گہنا دیا تھا۔لیکن دوسری تقریب نے اچھائی کی آمد پر ملنے والی خوشی کو دوبالا کر دیا۔اس سے پہلے کہ ہم ان دونوں تقاریب کا احوال بیان کریں کچھ پس منظر کا جائزہ بھی لے لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ یہاں زیادہ دیر تک غاصبوں کی حکومت رہی ہے اور پھر کچھ وقت کے لیئے اگر جمہوریت رہی بھی تو وہ کنٹرولڈ ڈموکریسی (Controlled Democracy) رہی۔اور کنٹرول بھی تھرڈ پارٹی کا۔گرچہ آئین میں صاف صاف لکھا ہے کہ غاصب کی سزا موت ہے لیکن اس شق پر آج تک عمل درآمد نہ ہو سکا۔طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ قتل کے کیس میں تو موشگافیوں کی گنجائش ہوتی ہے کہ قتل عمد تھا یا اتفاقاً ہو گیا۔سیلف ڈفینس میں تھا یا غیر ارادی۔پھر کوئی گواہ بھی تھا یا نہیں۔لیکن آئین توڑنے والے کے لیئے بچنے کی ایسی کوئی گنجائش نہیں۔نہ ہی گواہ کی ضرورت نہ مدعی

چیف صاحب کے خلاف بیان بازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور آخر میں تو عصبیت کو ہوا دینے کے لیئے نواز شریف کو پنجاب تک محدود کرنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن اس پر بھی مونہہ کی کھانی پڑی کہ شریف برادران نے پوری کیمپین (Campaign) میں سوائے چیف کی بحالی کے کوئی اور مطالبہ ہی نہیں کیا۔بہر حال کالم نگار کی بات ٹھیک ہی لگتی ہے کہ جن جن لوگوں نے چیف کی بحالی کی تحریک میں حصہ لیا ان کے قد میں سو فی صد اضافہ ہی ہوا۔۔جبکہ دوسرے، بونوں سے بھی کم تر ہو گئے۔۔

۱۹/مارچ ۲۰۰۹

کی۔سیدھی سیدھی سزا ہونی چاہیئے۔شائد اس ہی لیئے سزا سے بچنے کے لیئے ہر ڈکٹیٹر اپنے جانے سے پہلے ایک ایسی حکومت تشکیل دے جاتا ہے جو اس کو بچانے میں معاون ثابت ہو۔ایوب خان حکومت یحیٰی خان کو دیکر بچ گیا اور یحیٰی بھٹو کو دیکر۔ضیا الحق کو وقت نہیں ملا لیکن درمیانی مددگار کے طور پر اسحٰق خان موجود تھا۔اس کے بعد جمہوریت کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک الگ المیہ ہے جو صرف اس لیئے بار بار وقوع پذیر ہوتا رہا کہ آئین کی شق نمبر ۶ کو کبھی استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ہر غاصب کے جانے پر کبھی نئی پارلیمنٹ آڑے آئی تو کبھی پی ۔سی ۔او (p.c.o)۔شارٹ بریک (غیر جمہوری حکومتوں کے درمیانی مدت) میں آنے والی جمہوریتوں نے اپنے سے پہلے والے غاصب کا ٹرائل نہیں کیا۔جب مطالبہ ہوا تو کہا گیا اس کے ٹرائل سے پہلے فلاں کا ٹرائل ہونا چاہیئے۔بس پھر نہ نو من تیل ہوا نہ رادھا کا ناچ۔موجودہ حکومت سے بھی جب پرویز مشرف پر مقدمے کے لیئے کہا گیا تو جواب آیا کہ پہلے ضیا الحق!۔دوسرے بھی تیار تھے کہ اس سے پہلے یحیٰی!! پھر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اس سے پہلے ایوب!!! اب اگر کوئی ایوب کے لیئے راضی ہو بھی گیا تو کیا معلوم ایوب خان سے بات اسکندر مرزا سے ہوتی ہوئی غلام محمد تک پہنچے اور پھر کوئی ستم ظریف دور کی کوڑی بھی تو لا سکتا ہے کہ جنرل اکبر کو کیا واقعی راولپنڈی سازش میں سزا ہوئی تھی؟۔بس غداری کا مقدمہ نہ ہوا قیامت کا ذکر ہوا۔ع

ذکر چھڑ گیا جب قیامت کا۔۔۔ بات پہنچی تیری جوانی تک

اس پس منظر کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں کہ کسطرح ایک تقریب نے قوم کی خوشیوں کو روند ڈالا تھا جب قوم ایک غاصب کے جانے پر خوشیاں منا رہی تھی تو غاصب کے لیئے الوداعی تقریب کا اہتمام ہی نہیں کیا گیا بلکہ اسے گارڈ آف آنر بھی پیش کیا گیا۔دوسری تقریب بہر حال قوم کے لیئے خوشی کا باعث بنی کہ دو سال کی تگ و دو کے بعد جب چیف جسٹس کی بحالی کے بعد ان کے گھر پر پرچم لہرانے کی تقریب منعقد کی گئی۔تقریب تھی اور خوشی کی تھی۔کیا ہوا جو غیر سرکاری تھی۔قوم کو یاد تو دلائے گی کہ کسی کے جانے سے پہلے والی تقریب نے قوم کے جس سر کو شرم سے جھکا دیا تھا اس جھکے ہوئے سر کو کسی کی بحالی کے بعد منعقد ہونے والی تقریب نے فخر سے بلند کر دیا تھا۔ع رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یاد گار بنا دیا

۲۳/مارچ ۲۰۰۹ء

ہمارا المیہ

موجودہ قانون ،لنگڑا لولا ، جیسا بھی ہے ۔مگر ہے ۔۔اور اس دنیا کے کام آرہا ہے۔یہ لارڈ میکیاوَلے کا مرہونِ منت ہے۔میکیاوَلے کے نام سے ملتا جلتا ایک اور نام 'میکیاولی' ہے جس نے ایک پتلی دبلی، منحنی سی کتاب دا پرنس (The Prince) جو معنوی اعتبار سے نہایت بھاری بھرکم ہے، اس دنیا کو دی اور جس سے ہر صاحبِ اقتدار بالعموم اور ہر آمر بالخصوص مستفید ہوتا ہے۔بڑے بڑے ڈکٹیٹر اس کو ایک دو بار نہیں بلکہ بار بار پڑھتے ہیں۔مسولینی اور ہٹلر کا کیا ذکر بھٹو نے بھی اسے پڑھا بلکہ زیرِ استعمال رکھا۔قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ ایک ممتاز اور بہت ہی سینئر قانون داں ہیں، جو ایوب خان کی کابینہ میں وزیر قانون اور حکومتی مسلم لیگ (کنونشن) کے ممبر رہے ہیں اور جو کل تک حکومتی مسلم لیگ (ق) کے ممبر تھے ان کا خاصہ یہ ہے کہ ہمیشہ ہی کسی نہ کسی ڈکٹیٹر کی کابینہ میں رہتے ہیں۔انہوں نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

اس کتاب کے ذریعے میکیاولی کہتا ہے اقتدار میں رہنے کے لیئے جھوٹ بولنا ناگزیر ہے اور جھوٹ بولو اور اتنا بولو کہ تمہیں خود لگنے لگے کہ سچ یہ ہی ہے۔اس نے اقتدار پر گرفت رکھنے کے گُر بھی بتلائے ہیں لیکن ہم اسے یہیں چھوڑتے ہیں کیونکہ نہ ہم ، نہ آپ پالیٹکس کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ہاں تجربہ بتاتا ہے کہ اس جھوٹ کے سہارے اچھا خاصہ وقت گزر جاتا ہے۔اور چونکہ عوام کا حافظہ کمزور بلکہ ہوتا ہی نہیں اس لیئے یہ لوگ بار بار نئے نئے وعدوں کے ساتھ اور نئے نئے بھیس میں عوام کو بے وقوف بنانے آجاتے ہیں۔میکیاولی کے زمانے میں آجکل والا میڈیا تو تھا نہیں اس لیئے جھوٹ بولنے والے کو اپنے بیانات اور وعدوں سے پھرنے کی پوری پوری سہولت تھی۔اس لیئے ہمارے حکمرانوں نے خوب خوب مزے اڑائے۔اب اسے بدقسمتی کہیئے کہ پچھلے نو دس سالہ دور میں میڈیا نے اتنی ترقی کر لی کہ جھوٹوں کو آئینہ دکھانا آسان ہو گیا۔اور میڈیا نے مشرف دور کے وزرا اور حکومتی ترجمانوں کو سرِ عام برہنہ کرنا شروع کر دیا۔انہیں انکے اپنے پچھلے بیانات کی وڈیو کلپس دکھا

کر جھوٹا ثابت کیا۔لیکن واہ رے اقتدار۔صاحب اقتداروں نے اس کا حل ڈھونڈھ لیا اور بے غیرتی کی چادر اوڑھ لی۔اب انہیں سرعام برہنہ کرو یا پسِ پردہ انہیں کوئی پرواہ ہی نہ تھی۔ڈھٹائی کا یہ عالم کہ سورج کو چاند اور رات کو دن کہنے کے بعد بے مزہ بھی نہیں ہوتے تھے اور ہم جیسے سیدھے سادھے لوگ یہ سوچتے ہی رہ جاتے تھے کہ اس سفید جھوٹ کے بعد یہ لوگ اپنے بیوی بچوں کا سامنا کیسے کرتے ہونگے۔اگر میکیاولی کو دا پرنس دوبارہ لکھنے کا موقع مل جائے تو وہ بے غیرتی اور ڈھٹائی کا ایک نیا باب اس میں شامل کرنے کے لیئے مشرف کی کابینہ سے استفادہ کرسکتا ہے۔'The Prince' کے اردو ورژن کے مصنف اور ایوب کابینہ کے وزیر قانون کی کامیابیاں اس بات سے عیاں ہے کہ (اگر ہمارا حافظہ صحیح ہے) موصوف شائد ہر ڈکٹیٹر کی حکومت میں شامل رہے اور آخری ڈکٹیٹر کے دور میں عزت بھی کمائی کہ اب ہر اینکر پرسن موصوف کا تعارف کراتے ہوئے انہیں بزرگ سیاستداں کہتا رہا۔یہ اور بات کہ ہمیں یہ خطاب سوائے نوابزادہ نصراللہ خاں کے کسی اور پر نہیں جچا۔ہر ڈکٹیٹر کا ساتھ دینے والے نے،اقتدار کے آخری دنوں میں اب مشرف کی کابینہ کا حصہ ہوتے ہوئے حق بات کہنا شروع کردی تھی۔لال مسجد ہو یا چیف جسٹس کی برطرفی کا مسئلہ موصوف نے حق بات کہہ کر لوگوں کا دل جیتنا شروع کردیا۔اور تماشہ یہ رہا کہ کسی نے یہ نہیں کہا کہ اگر ان پالیسیوں کے خلاف ہیں تو احتجاجاً آپ مستعفی کیوں نہیں ہوجاتے۔خیر اس ہی کا کیا ذکر ایک عام آدمی کی حیثیت سے ایسے اور بھی کئی سوالات ہیں جو ہمارے ذہن میں تو آتے ہیں لیکن اینکر پرسنز کے نہیں آتے۔اور اگر کوئی مجبوراً چبھتا سوال پوچھ بھی لیتا ہے تو تشفی بخش جواب لیئے بغیر دوسرے سوال پر چلا جاتا ہے یا بریک پر۔غاصب کی کابینہ کا رونا تو ہم روتے ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ منتخب جمہوری حکومت کے نمائندے تو مارتے بھی ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے۔ایک ہی وقت میں ایسے بیانات دیتے ہیں جن میں ''کھلا تضاد'' صاف دکھائی دیتا ہے اور نہ بھی دکھائی دے تو میڈیا کلپس دکھا دیتا ہے۔لیکن واہ رے' میں نہ مانوں کی رٹ سوائے اپنی ہی بوٹیاں نوچنے کے اور چارہ نہیں ہوتا۔عدلیہ کی بحالی کی تحریک پر اکثر حکومتی نمائندے کہتے تھے کہ عدلیہ کی بحالی کی وہ لوگ بات کررہے ہیں جنہوں نے خود سپریم کورٹ پر حملہ کیا تھا۔ان سے سرسری کہا جاتا کہ ان میں سے کئی لوگ تو اب آپ کے ساتھ ہیں۔سرسری ہی کہا جاتا تھا انہیں قائل نہیں کیا جاتا تھا اس لیئے آئندہ کسی اور پروگرام میں وہ پھر اس ہی بات

کو دہراتے نظر آتے تھے۔موجودہ عوامی حکومت کا بھی یہ ہی حال رہا۔اکثر وزراچیف پر الزام لگاتے کہ انہوں نے بھی تو پی سی او کے تحت حلف لیا تھا۔اس لیئے ان کی بحالی کا کیا جواز۔حیرت ہوتی تھی کہ کوئی انہیں یہ نہیں بتاتا کہ اس میں فرق کیا ہے۔کوئی انہیں یہ نہیں بتاتا کہ حضرت عمرؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے کیا تھے۔قائداعظمؒ ایمیسڈر آف یونیٹی کہلاتے تھے۔پہلے کانگریس میں تھے۔کیا ماضی کے حوالے سے ان لوگوں کے حال کو رد کیا جاسکتا تھا۔اکثر تو کج بحثی میں کہتے ہیں کہ تمام اپوزیشن لیڈران کسی نہ کسی ڈکٹیٹر کی گود میں پلے ہیں۔سچ ہے لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ انکے اپنے لیڈر بھی دس سال تک ایوب خان کے ساتھ ہی نہیں رہے بلکہ مادرِ لت کی شمع جمہوریت کو گل کرنے میں بھی پیش پیش رہے تھے۔وہ اور شعیب ایوب کے پولنگ ایجنٹ تھے اور جس دھاندھلی سے انہوں نے نتائج بدلے تھے وہ ہمارے لیئے کسی لعنت سے کم نہیں۔

۳۰/مارچ ۲۰۰۹ء

محکمہء پیشگوئی یا پیش بندی

ملک میں سینکڑوں محکمے ہوتے ہیں جو پلاننگ کرتے ہیں فیزیبلیٹی (feasibilty) بناتے ہیں۔ان پر عمل کرتے ہیں یا پھر نہیں کرتے۔ان محکموں کی کارکردگی پر نظر رکھنے کے لیئے بھی محکمے ہوتے ہیں جو کارروائی بھی کرتے ہیں۔اس سلسلے میں کوتاہیوں پر پکڑ دھکڑ بھی ہوتی ہے اور نظر انداز بھی کر دی جاتی ہیں۔ایسا کیوں ہوتا ہے یہ ہمارا آج کا موضوع نہیں۔ویسے عوام اتنے تو باشعور ہیں ہی کہ اس کی ساری وجوہات جانتے ہیں اس لیئے دہرانے کی کیا ضرورت۔بس اللہ کا فضل ہونا چاہیئے۔ہمیں عربی آتی ہوتی تو کہتے ہٰذہ من فضل ربی۔ہاں ہم نے پاکستان بننے کے بعد سے تو یہ ہی دیکھا کہ کرپشن کے چارج پر نکالے گئے لوگ تبدیلیء حکومت کے ساتھ باعزت بحال ہی نہیں ہوئے بلکہ ان کے بیٹے یا بیٹیوں کو حکومتی کاموں میں حصہ ڈالتے بھی دیکھا ہے۔بس یوں سمجھئے کہ کرپشن کے الزام کے ساتھ ہی حکومت کرنے کی اہلیت کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔دور کیوں جائیں ابھی چند برسوں پہلے ایک بہت ہی طاقتور بلکہ یوں کہیئے فولادی اہمیت کی حامل ایک مِل کے کرتا دھرتا پر کرپشن کے سنگین الزامات کا سلسلہ کچھ یوں شروع ہوا کہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔کبھی تجوریوں سے سونے چاندی کے خزانے برآمد ہو رہے تھے تو کبھی بینک لاکرز سے۔کچھ بینک اکاؤنٹ کے ہوش اڑانے والے واقعات بھی منظر عام پر آئے۔جنہیں دیکھ کر ہمیں اپنی پارسائی پر شبہ ہونے لگتا کہ کہیں ہماری پارسائی اس مصرعے کے عین مطابق تو نہیں کہ

؎ اجز گناہ کے دم سے ہیں عصمتِ کامل کے جلوے

ان کی بیوی بیٹی کی مظلومیت کی داستانیں بھی اخبارات کی زینت بنی ہوئی تھیں۔پھر آہستہ آہستہ کسی فلمی سین کی طرح یہ سارے مناظر فیڈ آؤٹ ہو گئے۔اس کے بعد کیا ہوا اس سے عوام کا کیا واسطہ۔

یہ تو اللہ کی مرضی ہے کہ ایسی تمام رسوائی کے بعد بھی وہ عزت افزائی کر سکتا ہے۔اگر میر جعفر کا پڑ

نواسہ پاکستان کا صدر بن سکتا ہے تو ایسے معمولی غبن کے ملزم کے بچے وزیر مشیر کیوں نہیں بن سکتے۔جیسا کے ہم نے کہا ہمارا آج کا موضوع یہ نہیں بلکہ ایک خاص محکمے کی نشاندہی ہے۔جس کا ذکر ہم آخر میں کریں گے کہ اس نے حال ہی میں ایک دوسرے محکمے کے بطن سے جنم لیا ہے۔لیکن ابھی تک اپنی الگ شناخت نہیں بنائی۔حکومتی محکموں میں ایک ایسا محکمہ بھی ہوتا ہے جو آنے والے دنوں کا موسم بتاتا ہے کہ گرمی ہوگی یا سردی رہے گی۔بارش ہو گی یا موسم خشک رہنے کی توقع ہے۔اس محکمے کا کام ہے کہ فقط پیشگی اطلاعات فراہم کرے۔اپنی فراہم کردہ اطلاعات پر اثر انداز ہونا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔بارش ہونے کی پیش گوئی کے بعد دعا ہی کر سکتا ہے کہ اس کی دی ہوئی اطلاع سچ ثابت ہو جائے اور محکمے کی لاج رہ جائے۔کسی سمندری طوفان کے آنے کی اطلاع تو دے سکتا ہے کہ فلاں دن کراچی کے ساحل سے ٹکرائے گا۔لیکن طوفان کو روک نہیں سکتا۔ظاہر ہے اس کو روکنا تو محکمے کے بس میں نہیں اس لیئے لوگ کم از کم اپنی حفاظت کے لیئے ساحل سے دور ہٹ جاتے ہیں۔دو ایک دن بعد یہ خوشخبری بھی اس ہی محکمے کے توسط سے ملتی ہے کہ طوفان نے اپنا رخ بدل لیا ہے اور خطرہ ٹل گیا ہے۔ایسی دو تین اطلاعات کے ہم بھی گواہ ہیں لیکن بدقسمتی سے زلزلے کی آمد کی اطلاع کبھی نہ ملنے کی وجہ سے قوم کو کافی نقصانات اٹھانے پڑے۔

اس محکمے کے علاوہ ایک محکمہ اطلاعات بھی ہوتا ہے لیکن اس کا کام ظاہر ہے پیشگوئیاں کرنا تو ہو نہیں سکتا اس لیئے یہ کام محکمہء موسمیات کے سپرد ہے۔اب اس کا کیا علاج کہ کبھی کبھار محکمہء موسمیات بھی ڈس انفارمیشن کا مرتکب ہو جاتا ہے۔اب چونکہ کبھی کبھار کی بات ہے اس لیئے اسے محکمہء اطلاعات میں ضم نہیں کیا جا سکتا۔ایک اور محکمہ ہے جس کا کام لا اینڈ آرڈر قائم رکھنا ہے۔اب اپنی اوور ایفیشنسی (over efficiency) کی وجہ سے اس نے پیشن گوئی اور اطلاعات فراہم کرنا بھی شروع کر دی ہے جس کی وجہ سے یہ میڈیا کی تنقید کا نشانہ بن رہا ہے۔اب اکثر ایسی اطلاعات ملتی ہیں کہ ۱۴ دہشت گرد ملک میں داخل ہو گئے ہیں۔ایک مشتبہ کار پنڈی میں دیکھی گئی ہے۔چار دہشت گرد کراچی میں داخل ہو گئے۔یہ فلاں جگہ یا فلاں شخص کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔سات سے آٹھ مشکوک لوگ لاہور میں موجود ہیں۔کسی بھی وقت کوئی حادثہ ہو سکتا ہے۔اب چونکہ یہ اطلاعات پیش گوئی کہ زمرے میں آتی ہیں اور ان کا کوئی مداوا بھی نہیں تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ

یہ کام محکمہء موسمیات کو سونپ دیا جائے کہ وہ بھی طوفان کی آمد کا تو بتا دیتا ہے لیکن کچھ کر نہیں سکتا۔ لیکن اس میں قباحت لفظ موسم کی موجودگی ہے اس لیئے بہتر ہوگا کہ پہلے اس محکمے کا نام تبدیل کر کے ''محکمہ پیشنگوئی'' رکھ دیا جائے یا پھر ذرا براڈر پراسپیکٹ (Broader Prospect) میں اسے محکمہء پیش گوئی و پیش بندی کا درجہ دے دیا جائے۔ ویسے تو یہ فریضہ محکمہء اطلاعات بخوبی انجام دے سکتا ہے لیکن اس میں پرابلم یہ ہے کہ اس محکمے اور میڈیا کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ اس لیئے آئے دن میڈیا سے آمنا سامنا رہتا ہے، پھر ایسے میں کوئی کوتاہی ہو جائے اور بار بار معذرت کرنی پڑ جائے تو۔۔۔ اب جلدی جلدی چولی معاف کرنا وزیر اطلاعت تو نہیں بدلہ جا سکتا۔

۳/اپریل ۲۰۰۹ء

غور فرمائیے

آپ نے یقیناً ٹی وی پر دکھائی جانے والی سوات کی وہ کلپ تو دیکھ ہی لی ہوگی جس میں چند لوگ کھڑے ہوئے ایک لڑکی کو پٹتے دیکھ رہے ہیں۔ لڑکی چیخ چلا رہی ہے اور سزا کے کوڑے مکمل ہونے پر اٹھ کر اپنا برقع درست کرتے ہوئے چل پڑتی ہے۔ اس کلپ کے ٹیلی کاسٹ ہوتے ہی ہر طرف سے مذمتی بیانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے اس کلپ کا تجزیہ کرنے کے لیئے مندجہ ذیل باتوں پر غور ضروری ہے۔۔ لڑکی کو تین آدمیوں نے دبوچ رکھا ہے جب کہ چوتھا آدمی کوڑے مار رہا ہے۔۔ یہ کوئی ڈاکٹر یا سائکیٹرسٹ (Psychiatrist) ہی بتا سکتا ہے کہ ہر کوڑے کے بعد لڑکی کے جسم کا رفلکس ایکشن (Reflex Action) نیچرل تھا یا نہیں۔ کیونکہ ہمیں کوئی رفلکس نظر نہیں آیا۔۔ ہر کوڑے کے ساتھ نکلنے والی چیخ کیا کوڑے کی ضرب سے ہم آہنگ تھی۔۔ کیا کوئی نورمل مرد بھی اتنے کوڑے کھانے کے بعد اس طرح کھڑا ہو سکتا ہے جیسے وہ لڑکی کھڑی ہو گئی تھی اور اپنا برقع بھی درست کر لیا تھا۔۔ کیا کوڑے کھانے کے بعد بغیر لڑکھڑاہٹ کے اس طرح چلا جا سکتا ہے جیسے لڑکی چل کر جاتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس گھناؤنے کھیل پر کسی قسم کا ردِعمل ظاہر کرنے سے بہتر ہوگا کہ ہم سب تھوڑا سا غور کر لیں۔ غور کے لیئے ہم ذیل میں چند اہم نکات درج کر رہے ہیں تا کہ کچھ پس منظر بھی واضع ہو جائے۔

۱۔ عراق پر حملے سے پہلے امریکہ نے الزام لگایا تھا کہ عراق میں مہلک ہتھیار موجود ہیں

۲۔ عراق پر حملے کے لیئے یہ ایک جواز تھا۔ نتیجے میں سینکڑوں نہیں لاکھوں جانوں کے ضیاع کے باوجود مہلک ہتھیار بازیاب نہ ہوئے۔

۳۔ پاکستان میں بھی ایسی ہی کسی کارروائی کے لیئے جواز حاصل کرنے کے لیئے کہا جا رہا ہے کہ القائدہ پاکستان میں ہے اور بیت اللہ محسود امن کے لیئے خطرہ ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیئے ڈرون حملے

ضروری ہیں

۴۔پاکستانی عوام کی مخالفت سے بچنے کے لیئے بیت اللہ، القائدہ اور طالبان کے لیئے پاکستانیوں کے دل میں ان کے خلاف نفرت پیدا کرنا ضروری ہے۔

۵۔لاہور پولس ٹریننگ سینٹر اور سری لنکن ٹیم پر حملے یہ نفرت پیدا کرنے میں ناکام رہے

۶۔ڈرون حملوں کے نتیجے میں اب تک سینکڑوں عورتیں اور بچے مارے جا چکے ہیں لیکن نہ حکومت کی طرف سے ایساری ایکشن نظر آیا نہ سول سوسائٹی اور ہیومن رائٹس کمیشن کی طرف سے۔

۷۔ایک بارات پر بمباری کے نتیجے میں ۱۰۰ سے زیادہ لوگ مارے گئے مگر کسی N.G.O کا کوئی بیان امریکہ کی مذمت میں نہیں آیا۔

۸۔ڈاکٹر عافیہ کی رہائی کے لیئے بھی کوئی مذمتی بیان ان سوسائیٹیوں کی طرف سے نہیں آیا۔

۹۔ابھی تک یہ بھی ثابت نہیں ہوسکا کہ یہ وڈیو حقیقی ہے یا جعلی۔یہ ثابت ہونا ضروری ہے۔کیونکہ کئی حملوں کے بعد ذمہ داری قبول کرنے کے جعلی بیانات اور وڈیوز ہم دیکھ چکے ہیں

۱۰۔انٹرنیٹ پر تقریباً روز آنہ ایسی کلپس موصول ہوتی رہتی ہیں جن پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔

۱۱۔کچھ عرصے پہلے ایک ایسی کلپ آئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ایک جن تلاوت کر رہا ہے اور لوگ اسے بالکل اس انداز میں گھیرے کھڑے ہیں جیسے سوات کی اس لڑکی کو۔جن کی شکل نظر نہیں آرہی بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ صرف کوئی لباس ہے جو جھوم جھوم کر تلاوت کر رہا ہے اگر وہ حقیقت نہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ فوٹو گرافی کا کوئی کمال ہے

۱۲۔اس سے پہلے کوئی حملہ آور نہیں پکڑا جاتا تھا لیکن پولس سینٹر پر ایک پکڑا گیا اور اس نے فوراً اپنا تعلق بیت اللہ سے بتلا کر تصدیق کردی کہ اس کے پیچھے کون ہے۔اس سے پہلے ایسا ہی ایک الزام بی بی کے قتل سے منسوب ہے۔پولس سینٹر پر پکڑے جانے والے کا کیا ہوا؟

۱۳۔ کہا جاتا ہے اسامہ پاکستان میں ہے۔یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ اسامہ ڈائلسس (Dyalisis) پر ہے اور وہ بھی کئی برسوں سے۔کوئی نیفرولوجسٹ (Nephrologist) ہی

بتا سکتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے سوچیئے کہیں بیت اللہ اور اسامہ ہمارے لیئے ویپن آف ماس ڈسٹرکشن نہ ثابت ہوں اور امریکہ ان کی تلاش میں ہمارے پانچ چھ لاکھ آدمیوں کو ہڑپ کر جائے۔اگر اتنے شور شرابے کے بعد اگر ثابت ہوا کہ فلم ڈرامہ تھی تو کیا ہوگا۔ہمارے کچھ اینکر پرسن لڑکی کی چیخوں کو بہت اہمیت دے رہے ہیں جیسے اس دور میں ڈبنگ تو ہو ہی نہیں سکتی۔پوری وڈیو میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ تماشہ دیکھنے والے فریم میں نہ آئیں۔ایک اور بات کہ اس لڑکی کے ساتھ اس نامحرم مرد کا کوئی ذکر نہیں، جس کے ساتھ وہ باہر نکلی تھی۔کیا اس کو معاف کردیا گیا تھا یا اسے بھی کوڑے لگے تھے۔لگے تھے تو کیا خلوت میں۔لڑکی کی طرح جلوت میں کیوں نہیں۔کیا خوف تھا کہ مرد کو برقع نہ پہنانے کی وجہ سے وہ پہچان لیا جائے گا۔

ہماری کچھ این جی اوز تو بیرونی ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں۔خدارا دوسروں کو تو سمجھاؤ کہ اس تمام معاملات کے پیچھے مقاصد کیا ہیں۔۔۔واللہ اعلم

۵/اپریل ۲۰۰۹

عقیدہ بولتا ہے

جگر مرادآبادی نے کیا خوب کہا تھا۔ع

؎ جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

اور واقعی خوب کہا تھا کیونکہ اس دور میں کچھ ایسا ہی ہے۔علم بڑھا تو یونیورسٹیاں بھی بڑھیں اور ساتھ ہی جعلی یونیورسٹیاں بھی وجود میں آگئیں اور پھر ظاہر ہے کہ جعلی ڈگریوں کا بول کیوں نہ بالا ہو۔اب یہ اور بات کہ جعلی ڈگریاں تو ہزاروں ہونگی لیکن نشانہ تو وہی بنے گی جو کسی مشہورِ زمانہ یا بدنامِ زمانہ شخص کے پاس ہوگی۔اور جب یہ سلسلہ چل نکلا ہے تو پھر قحطِ رجال کا مسئلہ بھی پیدا ہونا ہی ہے۔ایسے میں نام نہاد دانشور، مبصر، سائنسداں، سیاستداں اور صحافی حضرات کی بہتات تعجب انگیز نہیں۔لیکن باعث تشویش تو یہ ہے کہ اب نام نہاد مولوی اور علماء بھی بکثرت پیدا ہو گئے ہیں۔نتیجتاً الیکٹرونک میڈیا پر بھی اب ایسے میزبانوں کی کمی نہیں جو اپنے آپ کو عقلِ کل نہ سمجھتے ہوں۔بات سیاست یا معاشرت تک ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن اب تو دین اور ایمان بھی ان نام نہاد علماء کی دسترس سے محفوظ نہیں رہے۔جو 'آن لائن' رہنے کے شوق میں ایک جعلی ڈگری والے میزبان کی خوشامدآنہ انداز میں تعریف کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں کسی کے مونہہ پر بیجا تعریف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔اس پروگرام میں میزبان اور مہمانوں کا ایک دوسرے کی تعریفوں کا سلسلہ دیکھ کر گمان گذرتا ہے کہ 'من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو' شائد ان ہی لوگوں کے لیئے کہا گیا ہوگا۔میزبان کے انداز سے لگتا ہے گفتگو میں عاجزی وانکساری اس پر ختم ہے۔مذہب اور دین سے عقیدت کا یہ حال کہ اللہ کے رسول ﷺ یا صحابہ کا ذکر کرتے ہوئے آواز کا زیر و بم درجہء کمال پر رہتا ہے۔رندھی ہوئی آواز سے درد کا وہ تاثر پیدا کیا جاتا ہے جو فلم والے اپنے صوتی اثرات سے پیدا نہیں

کر سکتے۔خلفائے راشدین کا ذکر ہو یا شہدائے کربلا کا، مجال ہے رضی اللہ تعالی، کرم اللہ وجہہ یا علیہ اسلام کہنے میں بھول ہو جائے۔سرتا پا عجز۔لہجہ ملائم۔ادب واحترام میں آواز دبی دبی کہ اونچی آواز گستاخی کے زمرے میں نہ آجائے۔لیکن جب اس ہی میزبان کو ایک وڈیو میں دیکھا تو اسکی شخصیت کا ایک اور ہی پہلو سامنے آیا۔حیرانی ہوئی کہ کیا یہ وہی شخص ہے۔بہرحال منافقت کی ایک اور جھلک سے آشنائی ہوئی کہ موصوف کا لہجہ ہی نہیں بدلہ ہوا تھا بلکہ الفاظ بھی زہر میں ڈوبے ہوئے لگتے تھے۔ادب آداب بالائے طاق کہ صحابہ کے ساتھ رضی اللہ تعالی کہنے کی بجائے اب ان کے لیئے کہا جارہا تھا کہ ''حضور ﷺ کو بیٹیاں دینے والے جنازہ اٹھاتے وقت کہاں مرگئے تھے''۔صحابہ پر دشنام طرازی کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ آج تو میرا عقیدہ بول رہا ہے۔اس لیئے میں تو بولونگا۔اور عقیدہ کیا تھا فقط صحابہء کرام پر دشنام طرازی۔حیرت تو شرکائے محفل پر تھی جن میں نام نہاد دانشور احمد جاوید ہی نہیں شاعر عارف افتخار وسحر انصاری بھی تھے۔چند قابل احترام علامہ بھی موجود تھے۔طرفہ تماشہ تو یہ تھا کہ اسٹیج پر بیٹھے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کے ناموں کے ساتھ 'صاحب' کا لاحقہ تو استعمال کیا گیا لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر اکابرین کے نامِ نامی اس طرح لیئے گئے جیسے وہ سب نعوذ باللہ اس کے ہم جولی رہے ہوں۔نہ جانے کیا مجبوری تھی۔بھائی چارے۔اخوت۔یگانگت۔محبت اور امن کا درس دینے والے نہ صرف سن رہے تھے بلکہ تائید میں سر بھی ہلا رہے تھے۔انسانیت کا سبق دینے والوں کو یہ توفیق نہیں تھی کہ اس مونہہ زور گھوڑے کو لگام دیتے ہوئے بتاتے کہ ہمارے آقا ﷺ نے تو کافروں کے خلاف بھی ایسی زبان استعمال کرنے سے منع فرمایا تھا چہ جائیکہ آپ ﷺ کے سسر اور یارِ غار کے بارے میں ایسی بازاری زبان استعمال کررہے ہو۔کسی نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اختلاف کے باوجود مسلمان دشنام طرازی سے پرہیز کرتا ہے۔کسی برے آدمی کو اچھا کہہ دینا اتنا معیوب نہیں جتنا کسی اچھے شخص کو برا کہہ دینا۔کسی نے اسے یہ نہیں بتایا کہ عقیدے کا بولنا کسی طرح بھی عقیدے کے صحیح ہونے کی سند نہیں۔کیا ہم نے ٹی وی کے مذاکرات میں نہیں دیکھا کہ گانے بجانے والیاں اپنے عقیدے کے مطابق گانے بجانے کو عین اسلامی قرار دیتی ہیں۔بیوٹی پارلر کی ایک مالکہ اپنے عقیدے کے مطابق پردے کیخلاف دلائل دیتے نہیں تھکتی۔ایک مذہبی اسکالر (ہماری نظر میں نام نہاد) فرماتے ہیں کہ شراب حرام نہیں بہکنا حرام

ہے۔ظاہر ہے یہ سب اپنے اپنے عقیدے کے حق میں بولتے ہیں یا اب یوں کہہ لیجئے کہ یہ ان کا عقیدہ بولتا ہے۔اور اگر عقیدہ بولتا ہے تو کیا یہ بولنا اس کے سچ ہونے کی دلیل ہے۔اگر ہم یہ چھوٹی سی بات ذہن نشین کر لیں تو بڑے بڑے اختلافات سے بچا جا سکتا ہے کہ آخرت میں ہمارے اعمال کو دیکھا جائے گا ۔ہم سے حقوق العباد اور حقوق اللہ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ہم سے یہ سند نہیں مانگی جائے گی کہ کون اچھا تھا اور کون غلط۔۔ارے بدبختو اس کافر کی خوش نصیبی پر نظر کیوں نہیں ڈالتے جس نے اپنی آنکھوں سے ہمارے پیارے نبی ﷺ کو دیکھا تھا۔اسکی بدنصیبی پر کفِ افسوس کیوں نہیں ملتے کہ باوجود حضور ﷺ کے دیدار کے اسے اسلام قبول کرنے کی توفیق کیوں نہ ہوئی۔خدارا ان جھمیلوں سے نکلو اور فرقہ پرستی چھوڑ کر قران کو اپنا لو۔انشااللہ منزل آسان ہو جائیگی

۱۲/اپریل ۲۰۰۹ء

یا اللہ ہمیں بچا

ایک ڈکٹیٹر پر الزام ہے یا تھا (کیونکہ ہمارے ملک میں کسی بھی الزام کو اس کے منطقی انجام پر پہنچانے سے پہلے ہی فیڈ آؤٹ کر دیا جاتا ہے اور قوم کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ سچ کیا تھا) بہرحال الزام تھا کہ اس نے پاکستان کے کچھ دریا بھارت کو بیچ دیئے تھے۔ان میں سے کچھ مغربی پاکستان میں تھے اور کچھ مشرقی پاکستان میں۔اب یہ الزام تھا یا حقیقت،خبر تھی یا افواہ اس کا قوم کو کبھی نہیں معلوم ہوگا۔دریا کا کیا ذکر یہاں تو پورا مشرقی پاکستان ہی چلا گیا اور ہم اب تک گومگو کی کیفیت میں ہیں کہ اس سانحہ کا ذمہ دار کسے ٹھہرائیں۔سانحے کے وقت جن پر الزام تھا وہ بعد میں معتبر ٹھہرے۔کوئی پرچم میں لپٹ کر قومی اعزاز کے ساتھ دفن ہوا تو کوئی عزت دار ٹھہرا۔کسی کی آل اولاد برسر اقتدار ہوئی تو کسی نے دولت کمائی۔کہا جاتا ہے کہ فلاں واقعہ تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا اور فلاں سیاہ حرفوں میں۔ہم نے تو اب تک ایسا کچھ نہیں دیکھا۔ہماری تو تاریخ ہی داغدار ہے۔ہر تاریخ داں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے تاریخ مرتب کی۔تقریباً ہر واقعے کے کئی کئی ورژن ہیں اور اتنے مربوط کہ ہر ایک ورژن کی تائید میں دلائل اور ریفرنس کی بھرمار ہے۔یہ بات بھی ہر قتل کے بعد بڑے تواتر سے کہی جاتی ہے کہ ''خون بولتا ہے'' یا ''خون رنگ لائے گا''۔شاعروں نے بھی خوب خوب رنگ بھرے ہیں کہ ع۔

'جو چپ رہے گی زبانِ خنجر،لہو پکارے گا آستیں کا'۔۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ

لیاقت علی خان کے قتل سے لے کر آج تک ہونے والے ہزاروں سیاسی قتل میں (بشمول دہشت گردی کا نشانہ بننے والے یا باجوڑ اور وزیرستان یا سوات یا لال مسجد میں قتل ہونے والے) نہ تو خنجر کی زبان بولی نہ لہو پکارا اور نہ کبھی پکارے گا۔کئی دفعہ گرفتاریاں بھی دکھائی گئیں۔لیکن پھر کیا ہوا۔عوام کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کب مقدمہ چلا۔آیا سزا ہوئی یا بے گناہ قرار پائے۔کیوں قتل ہوا تھا یا کس نے کروایا تھا۔قتل وغیرہ کو

چھوڑیئے۔کیا آج تک ہم لوگوں نے متفقہ طور پر کسی لیڈر یا عالم کو سراہا یا سزاوار ٹہرایا؟ ہمیشہ ہر معاملے پر قوم بٹی رہی۔حتیٰ کہ غلام محمد کے بھی کچھ حامی پائے جاتے ہیں لیکن اقرار کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔لیجئے قارئین ہم بھی جذباتی ہوکر موضوع سے بھٹک گئے۔ بات ہورہی تھی دریاؤں کو بیچنے والے ڈکٹیٹر کی۔اور وہ اس لیئے یاد آیا کہ اس کے صاحبزادے کا ایک بیان اخبار میں چھپا ہے۔فرماتے ہیں'' کارگل پر نواز شریف کو بریفنگ دی گئی تھی لیکن وہ شائد سمجھے نہیں تھے کہ بریفنگ دی جارہی ہے''۔ہم بھی نہیں سمجھے کہ موصوف کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ پورے بیان میں موصوف کنفیوزڈ لگ رہے ہیں۔ایک بات پوری کرنے سے پہلے دوسری پر چھلانگ لگاتے ہوئے بتایا کہ امریکہ کی سابقہ وزیرخارجہ نے فون پر نواز شریف کو بتایا تھا کہ بھارت میں چناٹی کے مقام پر طیارے حملے کے لیئے تیار کھڑے ہیں اور نواز شریف نے اس بات پر موصوف کو (جو اس وقت وزیر خارجہ تھے) اعتماد میں نہیں لیا۔چہ خوب کہ جو بات ہمارے وزیر خارجہ کو بتانی چاہیئے تھی وہ امریکہ کی وزارت خارجہ نے بتائی۔یہ تو بالکل ویسے ہی ہوا کہ ۱۹۶۵ میں انکے والد کے وزیر خارجہ کو بھی علم نہ تھا کہ بھارت بین الاقوامی لائن آف کنٹرول عبور کر کے لاہور پر حملہ آور ہوگا۔اب آپ ہی غور کیجئے کہ جس وزیر خارجہ، کا یہ حال ہو کہ امریکہ کی وزیرِ خارجہ کی فراہم کردہ معلومات پر اعتماد میں نہ لیئے جانے پر شاکی ہو وہ کہہ رہا ہے کہ نواز شریف کو بریفنگ دی گئی تھی لیکن وہ سمجھ نہیں پائے تھے۔اس کی غفلت کا یہ حال ہے کہ اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ چین سے مشرف اور جنرل عزیز کی فون پر گفتگو سے ثابت ہو چکا ہے کہ کارگل کا علم وزیراعظم کو نہیں تھا۔ جیسا کہ ہم نے کہا موصوف کنفیوزڈ لگتے ہیں کیونکہ ایک ہی وقت میں ایسی کئی باتیں بھی کر گئے جن کا سر پیر ہی نہیں۔ بھارت اور کارگل سے ایک ہی جست میں سوات سے ہوتے ہوئے پختونوں پر آ گئے اور پختونوں کو یاد دلانے کے لیئے کہا۔'' بدلہ لینا پختونوں کے خون میں شامل ہے''۔ہمیں تو اس پر وہ خاتون یاد آ گئی جس نے ایک اجنبی سے کہا تھا کہ تم تو مجھے چھیڑو گے۔تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک عورت نے ایک آدمی کو ایک سنسان جگہ پر روکا۔آدمی لدا پھندا تھا اس کے کاندھے پر دو طوطے بیٹھے تھے۔ایک ہاتھ میں پنجرہ تھا دوسرے ہاتھ میں کچھ سامان تھا اور بغل میں ایک چٹائی تھی۔عورت کہنے لگی تم مجھے اکیلا دیکھ کر چھیڑو گے۔مرد نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ میں تمہیں کیسے چھیڑ سکتا ہوں۔عورت بضد ہوئی اور بولی۔' تم

طوطوں کو پنجرے میں بند کرو گے۔بغل سے چٹائی نکالو گے۔دوسرا سامان زمین پر رکھو گے۔۔اور مجھے چھیڑو گے۔موصوف نے بھی سوات کے حوالے کے بعد پختونوں کو اکسانے کے لیا کہا کہ بدلہ لینا تو انکے خون میں شامل ہے۔شائد ویسا ہی بدلہ جیسا موصوف نے اپنے باپ کے کراچی سے الیکشن ہارنے اور دوسری جگہوں سے دھاندلی کر کے جیتنے کے بعد کراچی سے لیا تھا۔۔۔اللہ خیر کرے اور ایسے لیڈروں سے بچائے جو تفرقہ ڈالنے کے ماہر ہیں۔۔۔۔ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہمیں ان ڈکٹیٹروں اور ان کی اولادوں سے بچائے۔آمین

۔۔۱۹/اپریل ۲۰۰۹

پاکستان کا واحد دانشور

پاکستانیوں کو مبارک ہو کہ پاکستان کو بھی ایک ایسا مدبر، دانشور، سیاستدان، فلسفی اور مقرر میسر آ گیا ہے، جسے ہم سقراط کے مدِ مقابل کھڑا کر سکتے ہیں۔ سقراط ہی کیوں؟ یہ کہیئے کہ سقراط، بقراط، ارسطو، لقمان سمیت دس پانچ اور بھی مل ملا کے ہمارے اس دانشور کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ امید ہے آپ پہچان گئے ہونگے اور نہیں تو یہ ہماری بدقسمتی کہ ہم لوگ جوہر شناسی میں صفر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے جواہر کی قدر بھی غیروں کی مرہونِ منت ہے۔ چونکہ آپ نہیں پہچانے اس لیئے ہم کچھ دیر بعد بتائیں گے۔ جناب مختار مسعود کو نہ جانے کیوں یہ غم تھا کہ یہاں قحط الرجال کا دور دورہ ہے۔ اگر وہ جلد بازی سے کام نہ لیتے اور 'آواز دوست' لکھنے کا ارادہ موخر کر دیتے تو شائد پھر لکھنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ ہمارے ملک کے بارے میں لوگوں کا رونا بے جا ہے کہ یہاں کچھ نہیں۔ یہاں سب کچھ ہے بس ذرا قوم بیدا نہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا تو غلط تو نہیں کہا ہوگا کہ ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

تو بات ٹہری نمی پر۔۔ قدرت تو پہلے ہی مہربان ہے کہ ہمیں کیا نہیں دیا۔ آیئے اس قابل ترین شخص کا نام بتانے سے پہلے ہم اللہ تعالی کی دی ہوئے مہربانیوں کا ذکر کر دیں۔ پاکستان اسوقت دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کان کا مالک ہے۔ پانچویں بڑی سونے کی اور ساتویں بڑی تانبے کی کانیں ہمارے پاس ہیں۔ کوئیلے کا پانچواں بڑا زخیرہ ہمارا ہے تو چھٹی بڑی فوج بھی ہمارے ہے۔ ہمارا شمار ان سات ممالک میں ہوتا ہے جو ایٹم بم رکھتے ہیں۔ خوراک میں بھی اللہ نے نوازا ہے کہ ہم گندم پیدا کرنے والے گیارھویں تو چاول پیدا کرنے میں بارھویں نمبر پر ہیں۔ یہ اور بات کہ حکمرانوں کی کامیاب پالیسیوں نے ہمارے ۴۰ فی صد عوام کو خوراک سے اس لیئے محروم رکھا ہے تا کہ عوام خودسر نہ ہو جائیں اور اللہ کو نہ بھلا دیں۔ اتنی بڑی فوج

اور نیوکلیر پاور ہونے کے باوجود غیر ملکی ڈرون حملے اس لیئے برداشت کر رہے ہیں کہ غرور کا فتور ہماری عاقبت نہ خراب کر دے۔ اور ہم میں برداشت کی طاقت پیدا ہو۔ معدنیات کے اتنے بڑے بڑے ذخائر کے باوجود آئی۔ ایم ایف سے بھیک اس لیئے مانگ رہے ہیں کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ ہمارے صرف دو تین لیڈروں کے غیر ملکی اکاؤنٹ میں موجود اربوں ڈالرز کا فقط پانچ فی صد امداد میں ملنے پر ہمارے وزرا ایک دوسرے کو اس لیئے مبارک باد دیتے ہیں کہ ہم میں عجز و انکساری کا فقدان نہ ہو جائے اور ہم ایک ناشکری قوم کے طور پر جانے جائیں۔ ہماری غریب پروری، سخاوت، مروت اور قربانی کا یہ عالم کہ ہم تیل اس لیئے نہیں نکالتے کہ پڑوسی ملک کا تیل بہہ کر ہمارے کنووں میں نہ آ جائے اور اُس ملک کا ذخیرہ کہیں ختم نہ ہو جائے۔ سوات کی زمرد کی کانوں کو بھی اس ہی لیئے نہیں چھیڑ رہے کہ دولت کی ریل پیل سے دنیا کی محبت میں نہ گرفتار ہو جائیں۔ اپنے محکمے O.G.D.C. کی محنت پر اس وقت مٹی ڈال دیتے ہیں جب ان کے کھودے ہوئے کنوؤں سے تیل نکلنا شروع ہو جاتا ہے تا کہ ٹھیکے پر دی ہوئی برطانوی کمپنی کو گھاٹا نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔ پھر کیوں دنیاداری میں پڑیں۔ دوسرے ممالک کا حق کیوں ماریں۔ آپ نے دیکھا کہ اللہ نے ہمیں کتنا نوازا ہے۔ اور ہماری قوم کی کم ظرفی تو دیکھیئے کہ اسے اپنے اندر موجود عقل و دانش کے پیکر کا علم ہی نہیں تھا۔ وہ تو بھلا ہو کہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی نے اس گوہر کو ڈھونڈھ نکالا اور اپنی قوم کی جہالت دور کرنے کے لیئے ایک خطیر معاوضے پر لیکچر دینے کے لیئے مدعو کیا تو ہماری قوم کو بھی آگاہی ہوئی۔ اس کے بعد بھارت اور چین نے بھی استفادہ کیا۔ اب تو یہ حال ہے کہ ہمارے راندہء درگاہ سابق جنرل مشرف کو ہر یونیورسٹی دعوت دے رہی ہے کہ آپ تشریف لائیں اور عقل و دانش کے ذریعے ہماری قوم کو جگائیں۔ کہ اس وقت دنیا میں اور کوئی آپ کا ہم پلہ نہیں۔ اس وقت مشرف حد درجہ مصروف ہے اور اس نے اعلان کیا ہے باوجود مصروفیت کہ وہ وقتاً فوقتاً پاکستان آتا جاتا رہے گا۔ ہر لیکچر کے معاوضے کی رقم کا سن کر کم ظرفوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ان لیکچروں کی آڑ میں بلیک منی وہائٹ ہو رہی ہے ورنہ اس شخص میں ایسی کونسی قابلیت ہے کہ دوسرے ملک اسے مدعو کرنے کے لیئے مرے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اپنے دورِ حکومت میں پاکستانیوں کو بیچ کر جو ڈالرز کمائے وہ اب ان لیکچرز کے بہانے وہائٹ ہو رہے

ہیں۔۔اس قسم کے جاہلانہ الزامات کوتقویت اس لیئے ملی کہ پچھلے دنوں کچھ چینلز کو ایک خاص مقصد کے لیئے استعمال کرنے کے لیئے موبائیل فونز کے اشتہارات کی بھرمار نے ہمیں بھی سوچنے پر مجبور کردیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے ورنہ ہر دو چار منٹ کے بعد 'تم ہی تو ہو' یا 'اور سناؤ' یا 'سب کچھ کہہ دو' اور 'کہتے ہی جاؤ' کی کیا افتاد پڑی تھی۔شائد اشتہارات کی یہ بھرمار نہ ہوتی تو سوات کی کوڑوں والی فلم کبھی باکس آفس پر ہٹ نہ ہوتی۔

۲۰/اپریل ۲۰۰۹

پاپ کمائی

ہمارے محلے کے ایک بزرگ نماز پڑھ کر نکلتے تو مسجد کے باہر بیٹھے ایک خوانچہ بردار بوڑھے سے دس بارہ روپے کی ٹافیاں بسکٹ وغیرہ خریدتے۔ہمیں تعجب ہوتا کہ وہ اس بوڑھے سے یہ اشیاء کیوں خریدتے ہیں۔کیونکہ ان کے گھر میں اول تو کوئی چھوٹا بچہ نہ تھا دوئم وہ محلے کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔اس لیئے بات عجیب تھی کہ وہ ایسی سستی اشیا گھر لے جاتے ہوں۔پھر اتفاقاً ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ان اشیاء کو راستے میں کھیلتے ہوئے بچوں میں تقسیم کردیتے تھے۔ایک دن ہم نے ان سے پوچھ ہی لیا تو آگاہی ہوئی کہ وہ اس غریب بوڑھے کی مدد کرنے کی غرض سے یہ خریداری کرتے ہیں اور محلے کے بچوں میں تقسیم کردیتے ہیں جس سے بچے بھی خوش ہو جاتے ہیں اور خوانچہ فروش کی بکری بھی ہو جاتی ہے۔ہم نے کریدنے کے لیئے کہا کہ بہتر نہیں کہ آپ اس بوڑھے کو یہ روپے ویسے ہی دیدیا کریں۔فرمایا ہاں دے تو سکتا ہوں لیکن اس سے ایک تو بوڑھے کو خیرات لینے کی عادت بھی پڑ سکتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی عزت نفس مجروح ہو جائے۔ایک بات اور کہ ٹافیاں لیتے وقت ان بچوں کی آنکھوں میں جو چمک ہوتی ہے اور وہ مجھے دیکھ کر دادا دادا کہہ کر جس طرح دوڑ کر آتے ہیں اس سے مجھے جو خوشی ہوتی ہے وہ آپ تصور نہیں کر سکتے۔یہ سن کر ہماری تشفی ہوگئی۔یہ بات کافی پرانی ہے لیکن ہمیں آج بھی یاد ہے کہ مدد کرنے کا کتنا اچھا طریقہ انہوں نے بتادیا کہ غریب اور چھوٹے خوانچے والے کی امداد بھی کردی اور اسے احساس بھی نہیں ہوا۔انکی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگوں نے بھی یہ طریقہ اپنالیا جس سے محلے کے دکانداروں کی ہمت افزائی ہونے لگی۔یہ واقعہ کافی پرانا ہے لیکن ہمیں اس لیئے یاد آ گیا کہ اس سے ملتے جلتے واقعات سے ہماری قوم آجکل دوچار ہے۔واقعات میں مماثلت تو ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نیت بھی خیر کی ہے کیونکہ ایک امیر کبیر ملک ایک غریب ملک کے معمولی سوجھ بوجھ والے سابق حکمران کو، جو اپنی قابلیت سے نہیں بلکہ فوج کی طاقت سے اپنے ہی ملک کا حکمران بن بیٹھا تھا،

اقتدار سے محروم ہونے کے بعد لیکچرز دینے کے لیئے مدعو کرنے لگا۔ پہلے پہل تو ہمیں تعجب ہوا کہ ایک اوسط درجے کے (Mediocre) شخص کو مدعو کرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے جبکہ اُس ملک میں تھنک ٹینکس کی کمی نہیں اور وہاں ایک سے بڑھ کر ایک دانشور موجود ہے۔لیکن جب اسے معاوضے میں دی جانے والی رقم کا پتہ لگا تو بات سمجھ میں آئی اور ساتھ ہی ان بزرگ کی مہربانیاں بھی یاد آ گئیں جو وہ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازوں کے بعد معمولی خوانچہ فروشوں سے سودا خرید کر کیا کرتے تھے جبکہ ان کے اپنے کئی سوپر اسٹورز شہر میں موجود تھے ہمیں حیرت اس پر بھی تھی کہ اس سپر پاور کو اتنا گھماؤ پھراؤ والا طریقہ اپنانے کی کیا ضرورت ہے۔سیدھے سادھے طریقے سے رقم پکڑا دیتا۔ان بزرگ کی تو مجبوری تھی کہ انہیں خوانچہ فروشوں کی عزت نفس کا بھی خیال تھا۔لیکن یہاں تو عزت وغیرہ کا کیا سوال کہ اس غاصب حکمران نے تو عزت ہی بیچ کھائی تھی ظاہر ہے قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں کو غیر کے حوالے کرنا بے غیرتی ہی تو ہے۔ہم نے اس کے لیکچرز میں بھی ایسی کوئی عقل و دانش نہیں محسوس کی جس کا معاوضہ اتنا زیادہ ہو کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جائیں۔ہوسکتا ہے گھماؤ پھراؤ اس لیئے ہو کہ کچھ اور بھی ضمیر فروشوں کو ایسے کاموں کے لیئے ایٹریکٹ کیا جاسکے۔موصوف نے ایک کتاب بھی لکھی یا لکھوائی۔ یہ کتاب فروخت تو کیا ہوئی لیکن سنا ہے پبلشر نے ادائیگی کرنے میں کوئی کثر نہ چھوڑی۔کیا خبر یہ ادائیگی بھی موصوف نے خود کی اور خود ہی وصول کی ہو۔واللہ اعلم۔کتاب کا نام نہ جانے کیوں 'In the line of Fire' رکھا۔جبکہ ہمارے خیال میں تو اسے 'In the line of FEAR' ہونا چاہیئے تھا کہ موصوف ایک فون کال پر ہی شائد خوف سے ڈھیر ہو گئے تھے۔اس کتاب میں پاکستانیوں کو امریکا کے حوالے کرنے کا اعتراف کیا گیا ہے۔یہ کام مفت تو نہیں ہوا ہوگا۔اب واجب الادا رقم کی ادائیگی بوگس لیکچرز کے معاوضے کی مد ہی میں مل سکتی ہے۔اس ہی ضمن میں ایک اور واقعہ بھی سماعت فرمایئے۔ایک صاحب اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے فنکشنز کرواتے اور خود ہی چیف گیسٹ بن جاتے تھے۔ان کے پرائز بانڈز بھی نکلتے رہتے تھے۔سنا ہے نکلتے تو نہ تھے لیکن موصوف ایسے انعام یافتہ بانڈ زائد قیمت پر خرید کر بلیک منی کو وائٹ کرتے تھے۔ کاش ہمارے پاس بھی کچھ بلیک منی ہوتی تو ہم بھی لیکچرز دیتے اور حسبِ منشا معاوضہ وصول کرتے۔لیکن۔۔ ؎ اے بسا آرزو کہ خاک شد۔۔۔

بہر حال بلیک منی کو وائٹ کرنے کے بہت سے طریقے ہیں لیکن کمائی کے دو ہی مروجہ طریقے ہمیں معلوم تھے۔ایک تو 'باپ کمائی' جس پر ہمارا گذارا بچپن سے جوانی تک رہا۔اسکے بعد 'آپ کمائی' جو ہم اب تک کر رہے ہیں۔اب بڑھاپے میں پرویز مشرف کی بدولت ''پاپ کمائی'' کا علم ہوگیا جس سے اللہ ہم سب کو محفوظ رکھے۔آمین

۲۳/اپریل ۲۰۰۹ء

لو وہ بھی کہتے ہیں۔۔

غالب نے کہا تھا۔۔ع

؎ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

غالب نے کہا تھا اور کیوں کہا تھا اس کی تو ہمیں خبر نہیں لیکن ہلیری کلنٹن کی اس تشویش پر کہ پاکستان کا ایٹم بم طالبان کے ہاتھ لگ سکتا ہے، ہمیں یہ شعر یاد آ گیا۔ ہلیری کہہ رہی ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہہ رہی ہونگی کیونکہ وہ ایک بہت ہی مدبر اور دانشور ہی نہیں سابقہ خاتون اوّل بھی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ صدارتی امیدوار بھی رہی ہیں۔ جس طرح مرا ہاتھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے اس ہی طرح ہارا ہوا صدارتی امیدوار بھی اہم ہوتا ہے۔ اس ہی لیئے ہرانے والے نے ہلیری کو وزارتِ خارجہ سونپ دی۔ اب اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لیئے ایسے بیانات تو ضروری ہیں۔ اب ایک سوپر پاور کی سوپر وزارتِ خارجہ کی سوپر ہیڈ کے بارے میں یہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ ع۔

؎ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

بہر حال ہمیں تو میڈم کی تشویش پر تشویش ہے کہ انہیں ایسی تشویش ہوئی تو ہوئی کیونکر۔ ارے تشویش تو ہمیں ان کے نیوکلیئر ویپنز (Nuclear Weapons) پر ہونی چاہیئے کہ جن کی سیکیورٹی کا یہ عالم ہے کہ 9/11 پر ایک دن، ایک وقت اور ایک ہی ایئر پورٹ سے ایک دو نہیں، کئی جہاز اغوا ہوئے۔ دو تو اُن ٹوئن ٹاور پر کام آئے جو کہ اس ہی شہر میں تھے لیکن جو جہاز نیو یارک سے واشنگٹن تک پہنچے وہ حیرت زدہ کرنے کے لیئے کافی ہیں کہ یہ مسافت کئی گھنٹوں پر محیط ہے۔ اور اس دوران اس سوپر پاور کی سوپر سیکیورٹی کا یہ عالم رہا کہ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ ان کے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ اب اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔۔۔ اوّل ان کی سیکیورٹی اس لائق نہیں کہ ایسے کسی اقدام کو روک سکے۔ اگر یہ درست ہے تو ہماری تشویش

جائز ہے کہ ان کا ایٹمی سامان محفوظ ہاتھوں میں نہیں۔ نیو یارک سے اغوا ہونے والے جہاز اگر پینٹا گون اور وہائٹ ہاؤس تک پہنچ سکتے ہیں تو واشنگٹن سے اغوا ہونے والے جہاز نیوکلیئر بموں تک کیوں نہیں پہنچ سکتے۔ دوئم۔ اگر سیکیورٹی ٹھیک ٹھاک ہے تو پھر یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ 9/11 کا واقعہ امریکہ کا اپنا تھا اور اس پر وہاں کے بیسیوں دانشور بھی متفق ہیں۔ ایک دو نے تو اس بات کو ثابت کرنے کے لیئے ڈاکیومنٹری فلمیں بھی پیش کی ہیں۔ اب امریکہ کو چاہیئے کہ ان دو باتوں میں سے ایک کو تسلیم کرے۔۔ یا تو اپنی ناقص سیکیورٹی کا اعتراف کرے یا اقرار کرے کہ یہ سب اس کا اپنا کیا دھرا ہے اگر اعتراف کرتا ہے کہ اس کی سیکیورٹی ناقص ہے تو ہلیری کی تشویش بے معنی اور ہماری تشویش درست ہوگی کہ امریکہ کا ایٹمی اثاثہ غیر محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر واضع کرے کہ 9/11 کا واقعہ کیسے ظہور پذیر ہوا۔ کیا اس معاملے میں وہ خود ملوث تھا؟ اگر تھا تو عراق اور افغانستان میں لاکھوں اموات کا کون ذمہ دار ہوگا۔ خاص طور پر ویپن آف ماس ڈسٹرکشن کی عدم موجودگی میں۔ اب دلائل اور منطق کی رو سے امریکہ دونوں طرح سے پھنستا ہے۔ لیکن یہاں دلائل کا کیا کام۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ مائٹ از رائٹ کے ماننے والوں کا دور دورہ ہے۔ اللہ سے ڈرنے والے عنقا ہیں تو پھر ظالم کو کون روکے گا؟ اگر 9/11 کے بعد سے ہونے والے واقعات اور امریکیوں کے دیئے ہوئے بیانات کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے۔ تو نام نہاد بکے ہوئے ذہنوں کے علاوہ ہر ذہن کا یہ ہی تجزیہ ہوگا کہ یہ سب کچھ پاکستان کو ایٹمی اثاثوں سے محروم کرنے کی سازش ہے۔ ورنہ ہلیری سے اس بچگانہ بیان کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ پاکستانی ایٹم بم طالبان لے اڑیں گے۔ ایٹم بم نہ ہوا امریکن ایئر ویز کا طیارہ ہو گیا اور پاکستان نہ ہوا نیو یارک کا ہوائی اڈہ ہو گیا کہ القائدہ اور مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں نے C.I.A اور F.B.I جیسی ویل ایکوپڈ (Well Equiped) ایجنسیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر طیارہ نہیں، طیارے اغوا کر لیئے۔ ہلیری پر ہی کیا دوش۔ دوسرے امریکی بھی الٹی سیدھی ہانکتے رہتے ہیں کہ اسامہ فاٹا میں ہے۔ کوئی کہتا ہے بلوچستان میں ہے۔ جس کا وجود ہی نہ ہو اس کو کہیں بھی بتایا جا سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں یا تو اسامہ قید حیات سے آزاد ہو چکا ہے یا اگر ہے تو واشنگٹن کے علاوہ کہیں نہیں ہو سکتا کیونکہ بہت پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ اسامہ کے گردوں نے کام چھوڑ دیا ہے اور وہ ڈایا

لسس (Dialysis) پر زندہ ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات ہیں ڈایالسس پر بھی ایک خاص مدت تک ہی زندہ رہا جاسکتا ہے۔ اور ڈایالسس جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے نہیں ہوتی۔ اور گردہ لگوانے کے لیئے بھی سہولتیں درکار ہوتی ہیں۔ جو فاٹا یا بلوچستان کی پہاڑیوں میں تو نہیں مل سکتیں۔ کہنے والے تو ہمیں ڈومور (Do More) کے لیئے بھی کہتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستانی ڈالرز کے لیئے اپنی ماں کا بھی سودا کر سکتے ہیں۔ کہنے والے تو اور بہت کچھ کہتے ہیں لیکن اب ہمارے پاس سننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ اگر ہمارے غاصب صدر کو تھوڑی بہت سمجھ ہوتی تو وہ ایک فون کال پر ہمارے گھر کو یوں نہ لٹا دیتا اور آج ہمیں غالب کا یہ شعر بھی یاد نہ آتا

؎ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

۲۷/اپریل ۲۰۰۹ء

چک شدّاد

ملک الموت حضرت عزرائیلؑ کے ذمہ جو کام ہیں ان میں سے ایک روحوں کا قبض کرنا بھی ہے جسے وہ حکم ربی سے احسن طریقے سے ادا کر رہے ہیں۔ سنا ہے (واللہ عالم۔ اس روائت کی ابھی تک تصدیق نہیں ہوئی) کہ روح قبض کرتے ہوئے انہیں دو مرتبہ ترس آیا اور اتفاق دیکھیئے کہ ہر بار قابل رحم وہی شخص تھا۔ پہلی بار انہیں ایک ایسے نومولود پر ترس آیا جب وہ اپنی ماں کے ساتھ کھلے سمندر میں بے یار و مددگار ایک تختے پر تیر رہا تھا اور عین اس وقت اسکی ماں کی روح قبض کرنے کا حکم آ گیا۔ اس وقت ملک الموت کو بچے پر بڑا ترس آیا۔ دوسری بار انہیں اس وقت ترس آیا جب ایک ایسے شخص کی روح قبض کرنے کا حکم ملا جو اتنا طاقتور با اختیار تھا کہ خدائی کا دعویدار بن بیٹھا تھا۔ ترس اس لیئے آیا کہ وہ شخص اپنی بنائی ہوئی جنت کو پہلی بار دیکھنے کے لیئے آ رہا تھا کہ روح قبض کرنے کا حکم آیا اور وہ شخص اپنی ہی بنائی ہوئی جنت کو بنا دیکھے ہی دنیا سے رخصت ہو گیا اور اس کے تمام خدائی دعوے بھی دھرے کے دھرے رہ گئے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ دونوں بار شخص ایک ہی تھا یعنی پہلی بار بے یار و مددگار بچے کی حیثیت میں اور دوسری بار ایک با اختیار اور خدائی کے دعویدار کے روپ میں۔ جس کے اختیار کا یہ عالم تھا کہ اپنی جنت کو دیکھنے کا موقع بھی نہ حاصل کر سکا اور اس طرح مرا کہ نہ زمین پر تھا نہ آسمان پر۔ گھوڑے سے اترتے ہوئے ہوا میں معلق تھا کہ روح پرواز کر گئی۔ ہاں! ایک شاعر کو یہ کہنے کا موقع ضرور فراہم کر گیا کہ۔ ع

؎ بنا شدّاد نے جنت تو لی، لیکن، نہ یہ سمجھا
کہ نہ میں جنت کے قابل ہوں نہ جنت میرے قابل ہے

اس واقعے کے بعد سے 'شداد کی جنت' ایک ایسا استعارہ بن گئی ہے جس سے رعونت اور بیچارگی ہی نہیں ٹپکتی ہے بلکہ اللہ کی عظمت اور وحدانیت کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ وہ چاہے تو ایک لاوارث بچے کو اتنا طاقتور بنا دے کہ

وہ خدائی کے دعوے کرنے لگے اور چاہے تو کسی بھی فرعون کو بے چارگی کی موت سے ہمکنار کردے۔ وہ چاہے تو نمرود کے تکبر کا علاج اس طرح کرے کہ اسے صبح وشام سر پر جوتے لگوانے سے آرام ملے۔ وہ چاہے تو شہنشاہ ایران کو، جسے اپنے مطلق العنان ہونے کا اتنا زعم تھا کہ رعایا کو سائرسِ اعظم کی اولاد کہنے میں فخر محسوس کرتا تھا، در در کی ٹھوکر کھانے پر مجبور کردے۔ اپنے تخت کے وارث کے لیئے جس نے دوسری شادی کی، اس کو وارث تو دے دیا لیکن وراثت سے اس طرح محروم کردیا کہ آج اس کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں اور سائرس اعظم کی اولاد مفقود الخبر ہوگئی ہے۔ سائرس اعظم کی اولاد سے خوب یاد آیا کہ آجکل مسلمانوں میں اپنے آپ کو ہزار ہا سال پرانے کافروں سے منسلک کرنے کا رجحان بھی بڑھتا جارہا ہے۔ پہلے پہل تو ہمیں اس وقت تعجب ہوا تھا جب مصر کے ڈکٹیٹر ناصر جمال نے اقتدار کے نشے میں اپنی قوم کو فخریہ 'فرعون کی اولاد' کہہ کر مخاطب کرنا شروع کردیا۔ اس کے بعد یہ بیماری شاہ ایران کو لاحق ہوئی اور اسنے اپنی قوم کو سائرس اعظم کی اولاد کہنا شروع کیا۔ خیر۔ ع

ے ''بات ہوتی یہاں تک تو سہ لیتے ہم''

لیکن اب تو ماشا اللہ پاکستانی مسلمانوں کو بھی یہ بیماری لگ گئی ہے۔ پنجاب کے کچھ دانشوروں نے اپنے آپ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ سے منسلک کرنا شروع کیا لیکن شکر ہے عوامی سطح پر پذیرائی نہ ہوئی۔ سندھ کے کچھ نیشنلسٹوں (nationalists) نے بھی سوچا ہم کیا کسی سے کم ہیں اس لیئے انہوں نے راجہ داہر کو اپنا ہیرو بنالیا۔ اس کے لیئے محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کو ولن ٹھہرانا ضروری تھا کیونکہ ایک نے داہر کو شکست دی تھی تو دوسرے نے سومنات فتح کیا تھا۔ یہاں بھی قوم پرستوں کو مونہہ کی کھانی پڑی کہ سندھ کے غیور سندھیوں نے انکے اس دعوے کو کہ دونوں لٹیرے تھے رد کردیا۔ ہمارے ایک کولیگ راجپوت ہیں۔ اکثر و بیشتر فخریہ کہتے ہیں کہ' معلوم ہے میں ٹھاکر ہوں۔ ایک دو دفعہ تو ہم نے سنا اور نظر انداز کیا لیکن ایک دن کہنا پڑا کہ'' یار یہ بتانے کی بات نہیں بلکہ چھپانے والی بات ہے''۔ برا مان گئے لیکن شکر ہے اس کے بعد سے پھر ہمارے سامنے یہ کبھی نہیں کہا۔ چلیئے اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں کہ ضمناً یہ اولادوں کا ذکر نکل آیا ورنہ بات ہورہی تھی شداد اور اس کی جنت کی، جسے دیکھنے کی حسرت لے کر اسے دنیا سے جانا پڑا۔ شداد ہمیں اس

لیئے یاد آیا کے ہزار ہا برس گذرنے کے بعد'' چک شہزاد'' میں آج پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے کہ ایک ڈکٹیٹر نے لوٹ کھسوٹ کے بعد اپنے لیئے ایک محل بنوایا اور حکومتی خرچ پر (دروغ برگردنِ راوی) اسلام آباد سے اس چک شہزاد تک ایک بیش قیمت سڑک بھی بنوائی لیکن قدرت خدا کی اس میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ اور اسے دیار غیر میں رہتے ہوئے اپنی غیر موجودگی میں آرمی ہاؤس سے اپنا سامان منتقل کروانا پڑا۔ انشا اللہ یہ ابتدا ہے۔ ہمیں یقین ہے کسی نہ کسی کا خون تو رنگ لائے گا۔ کسی نہ کسی آہ تو لگے گی۔ رنگ لانے کے لیئے صرف لال مسجد میں ہی کافی خون ہے۔ بد دعا کے لیئے ڈاکٹر عافیہ یا بیگم جنجوعہ ہی کافی ہیں۔ باجوڑ کے بچوں کی چیخوں کا کیا ذکر، کارگل کے شہیدوں کی پکار بھی رنگ لائے گی۔ خیر یہ تو ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

اللہ اگر چاہے تو چک شہزاد کو چک شداد بنادے۔

۲۹ مئی ۲۰۰۹ء

رویئت ہلال اور اسامہ

دوعیدیں منانے کی بدعت کب اور کیسے شروع ہوئی اس کے بارے میں ہمارا علم ناقص ہے۔بس ہمارے ہوش میں پہلی بار ایسا دورِ ایوبی میں ہوا ۔اس سے پہلے بھی ایسا کبھی ہوا یا نہیں یہ ہم نہیں جانتے۔مشہور(؟) تاریخ داں (ڈاکٹر) مبارک اگر چاہیں تو اس پر تحقیق کر سکتے ہیں۔اس طرح ہمیں معلوم ہو سکے گا کہ یہ بدعت کب سے شروع ہوئی۔ایک فائدہ تاریخ داں کو بھی ہوگا کہ شائد اس طرح انہیں مستند ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل ہوجائے۔یہ ۶۰ء کی دہائی کا واقعہ ہے کہ ۲۹ رمضان کو چاند ہونے کی تصدیق نہ ہونے پر لوگوں نے تراویح ادا کی ۔درزیوں نے سکھ کا سانس لیا کہ ایک دن کی مزید مہلت مل گئی۔دکانداروں نے بھی غنیمت جانا کہ کمانے کے لیئے مزید ایک دن مل گیا۔اس لیئے صبح تک دکانیں کھلی رکھنے کی کیا ضرورت۔چاند رات کو ہی خریداری کرنے والوں نے بھی اپنی اپنی خریداری دوسرے دن تک کے لیئے موخر کردی اور سب سونے چلے گئے۔لوگ ابھی نیند کے سحر میں تیسویں سحری کر کے اٹھے ہی تھے کہ لاؤڈ اسپیکروں کی آواز سے شہر گونج اٹھا۔''بھائیو روزہ توڑ دو آج عید ہے۔عید کی نماز عیدگاہ میں ٹھیک۔۔۔'' یہ آواز تانگوں پر لگائے ہوئے اسپیکروں سے نشر ہو رہی تھیں۔ذرا ہی دیر میں لوگ گھروں سے نکل پڑے ۔سب شش و پنج میں تھے کہ اس سے پہلے ایسی کسی افتاد سے پالا نہیں پڑا تھا۔دوکانداروں نے دوکانیں کھولنا شروع کی۔درزیوں نے بھی کام شروع کر دیا۔جگہ جگہ لوگ جمع تھے۔حکومت کو ٹھیک ٹھاک گالیوں سے نوازا جا رہا تھا۔کچھ ہی دیر میں مساجد سے اعلانات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔'بھائیو۔آج عید نہیں ہے روزہ ہے۔کل تراویح بھی ہو چکی ہے۔روزہ توڑنے کا کفارہ ادا کرنا ہوگا'۔۔۔کنفیوژن بڑھنے لگا۔ایک بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔کچھ ہی دیر میں پولس نے مولویوں کو پکڑنا شروع کر دیا۔کچھ ہاتھ آئے کچھ غائب ہو گئے۔عوام بٹ گئی۔ کچھ عید کی تیاری میں مشغول ہو گئے کچھ روزے کی حفاظت میں۔عوام سمجھنے سے قاصر تھے کہ حکومت پر ایسی کیا مصیبت پڑ گئی تھی کہ ایسا اعلان کر دیا۔چاند تو واقعی نظر نہیں آیا تھا۔کچھ دانا کہہ رہے تھے'بھئی چاند اگر ہو جائے تو

چھپایا نہیں جا سکتا کہ کوئی نہ کوئی، کہیں نہ کہیں دیکھ ہی لیتا۔ہاں چاند نہ ہونے کی صورت میں تو دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ چاند ہو گیا۔آپ کو نظر نہیں آیا تو ہم کیا کریں' صبح کا عالم بھی عجیب تھا۔کوئی عیدگاہ کی طرف جا رہا تھا تو کوئی کھڑکی سے جھانک کر اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔عیدگاہ اور بڑی مساجد پر پولس کی معیت میں عید کی نماز کا انتظام کیا جا رہا تھا۔جن مساجد کے پیش امام غائب ہو گئے تھے انہیں ڈھونڈھا جا رہا تھا۔عیدگاہ کہ قاضی صاحب جو ہر عید پر اونٹوں پر سوار ہو کر اپنے ساتھیوں سمیت قافلے کی صورت نماز پڑھانے آتے تھے، غائب تھے پولس تلاش میں تھی۔نماز کا وقت ہو گیا۔عوام بے چین ہو رہی تھی۔کچھ دیر بعد شور ہوا کہ قاضیءشہر ہاتھ لگ گئے۔وضو کر رہے ہیں۔بس کچھ ہی دیر میں نماز ادا کر دی جائے گی۔پھر نماز تو ہوئی۔لوگوں نے پڑھ بھی لی۔لیکن یہ سوالیہ نشان بھی ذہنوں میں اٹک گیا کہ کیا اس طرح زبردستی کی نماز قبول ہوگی۔دوسری مساجد میں بھی نماز ہوئی۔اگر امام ہاتھ نہ آئے تو سرکاری مولوی کا انتظام ہوا۔یا کسی بھی ڈاڑھی والے کو یہ سعادت نصیب ہوگئی۔پھر پورا دن گلے ملنے یا گلہ کرنے میں گذر گیا۔جو روزے سے تھے انہوں نے عید مبارک وصول نہیں کی۔دوسرے دن پولس جو کل نماز پڑھوانے پر معمور تھی آج نماز سے روکنے پر کمر بستہ تھی۔لیکن اہلِ ایمان بھی کبھی رکے ہیں۔نمازیں مساجد میں ادا ہوئیں۔کچھ نے فائدہ اٹھایا اور دونوں دن نماز میں شریک رہے۔اور شرع،فتویٰ اور دیگر دینی مسائل سے بالا رہ کر دو دو عیدیں منائیں۔ہماری دانست میں یہ پہلی 'ڈبل عید' تھی۔پہلی تھی اس لیئے لوگ پریشان رہے لیکن بعد میں وہ دو عید کے عادی ہو گئے۔اب سنگل عید میں مزہ نہیں آتا۔ہمارے پشاور اور اسکے گرد و نواح کے برادران اسلام نے تو اب ایسی چشمِ بینا حاصل کر لی ہیں کہ انہیں رمضان اور عید کا چاند ایک دن پہلے نظر آجاتا ہے جبکہ رویت ہلال والوں کو ہوئی جہاز میں بیٹھ کر دوربین سے بھی نظر نہیں آتا۔چاند تو سال میں بارہ دفعہ نکلتا ہے لیکن رویئت کا جھگڑا دو دفعہ ہی اٹھتا ہے۔اور پاکستانی اہل اسلام دو تین دن بڑی سوچ بچار میں گذار دیتے ہیں کہ اب اجتہاد ہونا چاہیئے۔یا ہمیں سعودی عرب سے منسلک ہو جانا چاہیئے۔ان کے ساتھ عید اور حج وغیرہ منانا چاہیئے۔سب بھول جاتے ہیں کہ اسلام میں پاپائیت والے طریقے اپنانے سے منع کیا گیا ہے۔۔رویئت کے سلسلے میں ایک بات خوب ہے کہ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ رویئت کمیٹی کو چاند نظر آ گیا ہو اور ہمارے سرحدی بھائی اس سے انکار کر رہے

ہوں۔واقعی اس دانشور کی بات میں وزن ہے کہ موجود نہ ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ 'ہے'۔جبکہ 'ہو' تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ 'نہیں ہے' اس کو یوں سمجھئے کہ اسامہ نہیں ہے مگر امریکہ بضد ہے کہ ''ہے اور پاکستان میں ہے''۔اسے دکھائی دے رہا ہے جیسے ہمارے پشاوری بھائیوں کو چاند نہ ہوتے ہوئے بھی نظر آجاتا ہے اور وہ ایک دن پہلے عید کر لیتے ہیں۔ایوبی دور کی دو عیدوں کے بعد تو یہ سلسلہ چل پڑا۔دروغ بر گردنِ راوی مگر کوئیٹہ والے بھی حاجی فتح خانی عید کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔وہاں کے ایک سرمایہ دار فتح خان قسم کھا کر عید کا چاند ہونے کی نوید دیتے ہوئے کہتے قسم سے میں نے خود چاند کو دیکھا ہے۔اس طرح وہ ایک دن پہلے عید کروا دیتے تھے۔یہ تو بعد میں راز کھلا کہ موصوف کی بیٹی کا نام ہی چاند ہے اور وہ قسم بھی صحیح کھاتے تھے۔اب کوئی اسے گواہی سمجھ کر عید کر لے تو ؟۔۔۔کسی کا کیا دوش؟

۲۹/اپریل ۲۰۰۹ء

شمشان یا قبرستان

بھارتیہ جنتا پارٹی کے باغی رہنما کلیان سنگھ نے مسلمانوں کو مطلع کیا ہے کہ انہوں نے بی جے پی کی قبر کھود دی ہے اور مسلمان مٹی ڈال کر بدلہ لے لیں۔کلیان سنگھ کے اس بیان کا تجزیہ کرنے سے پہلے ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کے باہمی اختلاف کا تھوڑا سا جائزہ لے لیا جائے تو کلیان سنگھ کے بیان پر تبصرہ کرنے میں آسانی ہوگی۔قائداعظم نے کہا تھا کہ ہم گائے کھاتے ہیں جبکہ ہندو پوجتے ہیں۔کیوں پوجتے ہیں یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔سمجھ سے باہر اس لیئے ہے کہ ڈاکٹر ذاکر نائک نے ہندوؤں کی اپنی مذہبی کتابوں کے اقتباسات سے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوؤں کو گائے کھانے کی ممانعت نہیں۔مگر ہندو مان کر نہیں دے رہے۔مان کر اس لیئے نہیں دے رہے کہ ان لوگوں کی رسائی انکی اپنی کتابوں تک نہیں۔چند ایک جو ذاکر نائک کے لیکچرز سن چکے ہیں ان میں سے چند ایک مسلمان ہو گئے ہیں۔اس کے علاوہ بھی کئی اور باتیں ہیں جو ہندوؤں میں رائج ہیں حالانکہ انکی کتابوں میں ان کی ممانعت ہے وجہ وہی لاعلمی ہے۔انکی مذہبی کتابیں سنسکرت میں ہیں اور عام آدمی سنسکرت سے نابلد۔اب جو پنڈت کہہ دے وہی صحیح !!۔ایسا ہی کچھ بائیبل کے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔بائیبل کو زنجیروں سے جکڑ کر رکھا جاتا تھا اور اس تک پہنچ صرف پادریوں کی تھی۔عام عیسائی کو اسے پڑھنے یا رکھنے کی اجازت نہ تھی۔خلاف ورزی پر سزائے موت تھی۔پادری زنجیر کھولتا اور عیسائیوں کو مخاطب کر کے کہتا ''اس بائبل' میں لکھا ہے'' پھر جو کلیسا (چرچ) کی مرضی ہوتی وہ کہہ دیتا۔اب کوئی تصدیق تو کرنے سے رہا۔یہ ہی وجہ ہے کہ بائبل میں شراب پینے اور سور کھانے کی ممانعت کے باوجود عام عیسائی ان کو استعمال کرنا اپنے عیسائی ہونے کی دلیل سمجھتا ہے۔بات ہو رہی تھی ہندوؤں کی جن کے مذہب میں باوجود ممانعت کے گائے کی پوجا کی جاتی ہے۔پنڈتوں نے اپنے مفاد کی خاطر ایسے ایسے اختلافی مسائل پیدا کر دیئے ہیں کہ اب ہندوؤں کا اپنی ہی مذہبی کتابوں پر عمل کرنا ناممکن نہیں تو

مشکل ضرور ہو گیا ہے۔ ورنہ دیکھا جائے تو بتوں کو پوجنے سے منع تو ان کی اپنی کتابیں بھی کرتی ہیں لیکن وہاں شائد ہی ایسی کوئی شہ بشمول حیوانات و نباتات کے ہو، جس کی پوجا نہ کی جاتی ہو۔ چاہے وہ تلسی کا پودا ہو یا ناگ دیوتا۔ بندر ہو یا ہاتھی۔ ایسا ہی کچھ عیسائیوں کے ساتھ ہے جہاں بت پرستی کی ممانعت کے باوجود حضرت عیسیٰؑ اور بی بی مریمؑ کے بت اور تصاویر کی بھرمار ہے۔ ہاں پروٹسٹنٹ ان سے بَری ہیں۔ ان کے چرچ میں کوئی بت یا تصویر نہیں ہوتی۔ عیسائی ہندو اور مسلمانوں میں عورتوں کو حجاب استعمال کرنے کا حکم ہے لیکن اس حکم کو بھی صرف مسلمانوں تک محدود کر دیا گیا ہے ورنہ یہ ہندوؤں اور عیسائیوں کی کتابوں سے بھی ثابت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو راہباؤں (NUNS) کا لباس وہ نہ ہوتا جو ہے۔ چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ پورا جسم سر تا پاؤں ڈھکا ہوا۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس کے باوجود چند عیسائی ممالک میں مسلمان لڑکیوں پر حجاب استعمال کرنے کی پابندی ہے۔ وہاں عورتوں کو کم لباسی پر تو نہیں ٹوکا جاتا۔ لیکن سر پر اسکارف لینا جرم گردانا جاتا ہے۔ یہ ڈبل اسٹنڈرڈ عیسائیوں اور ہندوؤں کا شیوہ ہے۔ انہیں سکھوں کی ڈاڑھی پر اعتراض نہیں لیکن مسلمانوں کی ڈاڑھی سے بیر ہے۔ یہودی ڈاڑھی رکھ سکتا ہے لیکن مسلمان نہیں۔ یہودی کو مذبح خانے کی اجازت، لیکن مسلمانوں کا جانور ذبح کرنا جانوروں پر ظلم ہے!!! زندگی میں تو اختلافی مسائل ہیں ہی لیکن بعد مرنے کے بھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ مسلمان دفنانے پر کاربند ہیں تو ہندو جلانے پر۔ ٹھیک ہے! اگر آپ کو جلانا پسند ہے تو جلاؤ لیکن قبرستانوں پر اعتراض تو نہ کرو۔ اگر اعتراض ہے تو پھر اپنے بچوں کو کیوں دفناتے ہو۔ محاورۃً بھی دفنانے کی بات کیوں کرتے ہو۔ ہمیں کلیان سنگھ کے بیان پر اعتراض ہے انہوں نے بی جے پی کی قبر کیوں کھودی۔ جلانے کی تیاری کیوں نہیں کی۔ اور مسلمانوں کو الیکشن والے دن بی جے پی پر مٹی ڈالنے کی ذمہ داری کیوں ڈالی ہے۔ بی جے پی کا کریا کرم کرنا ہے تو کانگریس کرے مسلمانوں کو کیوں گھسیٹ رہے ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بی جے پی کو بھی مسلمان ثابت کرنا چاہ رہے ہوں۔ یا پھر کلیان سنگھ کے ذہن میں کہیں یہ تو نہیں کہ۔۔۔ مسلمانوں میں اچھا ہو تو امیر۔ برا ہو تو فقیر اور مر گیا تو پیر ہندوؤں میں اچھا ہو تو سپوت۔ برا ہو تو کپوت اور مر گیا تو بھوت اس ہی لیئے کہہ رہے ہیں کہ وہ بی جے پی کو بہت گہرا دفنائیں گے۔ تاکہ وہ نہ تو قبر سے اٹھ سکے اور نہ ہی شمشان سے بصورت بھوت نکل سکے۔ بہرحال مسلمانوں کو ہوشیار

رہنے کی ضرورت ہے کہ ورون گاندھی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ چلتے چلتے بھارتیہ جنتا پارٹی کے اقتدار کے زمانے میں شہرت پانے والی ایک ''تُک بندی'' کے دہرانے میں کوئی حرج نہیں۔ ع

ویجٹبل گھی اور بھارتیہ جنتا پارٹی

پہلے گھی میں سبزی بنتی تھی
اب سبزی سے گھی بنتا ہے
پہلے عورت بچے جنتی تھی
اب سارا بھارت جنتا ہے

۲ر مئی ۲۰۰۹ء

''3 / 9'' سے ''14 / 700'' تک

بچپن میں اسکول کے کورس میں ایک کہانی پڑھی تھی۔آج یاد آئی تو سوچا کیوں نہ آپ کو بھی سنادی جائے۔کہانی تھی کہ ایک جنگل سے دس آدمیوں کا ایک قافلہ گذر رہا تھا کہ تین ڈاکوؤں نے انہیں آلیا۔انکا مال اسباب لوٹ لیا اور پھر حکم دیا کہ کھانا تیار کرو۔کھانا کھا کر شراب کی بوتلیں لے کر بیٹھ گئے اور حکم دیا ناچ گا کر جی بہلایا جائے۔ناچ گانا تو بیچاروں کو آتا نہ تھا۔لیکن حکم ہوا تھا اس لیئے قافلے کے سردار نے اپنی بانسری نکالی اور بقایا ''9'' نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔سردار نے دیکھا کہ ڈاکوؤں پر شراب کا غلبہ ہو رہا ہے تو اس نے اپنی بانسری پر دھن کے ذریعے پیغام دینا شروع کر دیا۔۔۔۔۔

'' باج رہی ہے مدھر بین

ایک ایک پر تین تین ''

ساتھی سمجھ گئے اور وہ تین تین کی ٹولیوں میں بٹ گئے اور اچھلتے کودتے ڈاکوؤں کے سر پر پہنچ گئے اور پھر ان پر قابو پالیا۔سردار نے سب کو باندھ لیا اور روانہ ہو گئے۔مندرجہ بالا کہانی یاد آئی تو سوچا کیوں نہ آج دو چار متفرق واقعات ہی بلا تبصرہ بیان کر دیئے جائیں جن کی توجیہ ہم آج تک پیش نہ کر سکے۔خاص بات یہ ہے کہ یہ واقعات ہم نے ایسے لوگوں سے سنے ہیں جنہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔اس لیئے ان کے وقوعہ پذیر ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔یہاں یہ گذارش ضروری ہے کہ مندرجہ بالا اور مندرجہ ذیل واقعات خاص کر آخری واقعے میں برائے مہربانی کسی قسم کا ربط تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ ان میں کوئی ربط ہے ہی نہیں اس لیئے وقت کے ضیاع سے کیا فائدہ؟ تو آیئے بسم اللہ۔۔۔

۱) سکھر شہر میں ہمارے واقف ایک ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ گذشتہ برس وہ سرکاری ڈاکٹر کی حیثیت سے حکومتی حج وفد کے ساتھ مکہ مکرمہ پہنچے۔وفد کے اراکین کے ساتھ خانہ کعبہ کے در پر پہنچے تو ایک رکن نے شور مچا دیا کہ میں اندر نہیں جاؤں گا۔دوسروں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ ہوٹل جانے پر بضد

رہے۔مجبوراً دو ساتھیوں نے انہیں ہوٹل پہنچا دیا۔طواف اور سعی سے فارغ ہو کر جب ہوٹل پہنچے تو ان صاحب کو نارمل پایا۔لیکن اس کے بعد جب بھی انہیں لے کر حرم شریف جاتے تو وہ شور شرابہ شروع کر دیتے اور مجبوراً انہیں واپس بھیجنا پڑتا۔ڈاکٹر صاحب نے انہیں میڈیکل ٹریٹمنٹ کے علاوہ نفسیاتی طور پر بھی ٹریٹ کیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔عام حالات میں وہ بالکل نارمل ہوتے لیکن خانہ کعبہ کے دروازے پر پہنچ کر ان کی حالت بدل جاتی۔بالآخر انہیں حج سے پہلے واپس بھجوانا پڑا۔

۲)۔۱۹۸۸ میں ہم جب عمرے کے لیئے گئے تو ہماری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو چار پانچ سال سے حرم شریف کے سامنے ایک ہوٹل پر ملازم تھا۔لیکن اس نے اس عرصے میں ایک بار بھی حرم میں جانے کی سعادت حاصل نہ کی۔اس کے ساتھیوں نے بتایا کہ جب اس کو اندر چلنے کے لیئے کہتے ہیں تو بہانہ کر دیتا ہے کہ پہلے میں اس لائق ہو جاؤں۔پھر جاؤں گا۔دوسری بار جب ہم عمرے کے لیئے گئے تو معلوم ہوا وہ شخص واپس پاکستان چلا گیا ہے مگر اسے اندر جانا نصیب نہ ہوا۔

۳) ہماری والدہ مرحومہ نے ایک بار بتایا کہ جب وہ زیر تعلیم تھیں تو انکا ایک ہاتھ بالکل سوکھ گیا حکیم ڈاکٹر کے علاوہ گھریلو ٹوٹکے بھی کیئے لیکن افاقہ نہ ہوا۔پڑوس میں ایک عیسائی مارگریٹ نامی رہتی تھی۔والدہ کی ہم عمر تھی۔ایک دن کہنے لگی ہمارے چرچ میں بی بی مریم کا دن منایا جا رہا ہے ہم لوگ منتیں مانگتے ہیں۔میں وہاں جا رہی ہوں وہاں تمہارے ہاتھ کے لیئے منت مانگوں گی۔اگر ہاتھ ٹھیک ہو جائے تو موم کا بنا ہوا ایک ہاتھ دینا پڑے گا۔والدہ دل میں ہنسیں لیکن کہا ٹھیک ہے دیدونگی لیکن میں خود نہیں جاؤں گی۔اس بات کے چند دن بعد ہی اللہ کے کرم سے والدہ کا ہاتھ بالکل ٹھیک ہو گیا۔مارگریٹ نے منت کی یاد دہانی کروائی اور موم کے ہاتھ کے لیئے کہا۔والدہ نے اسے قیمت ادا کر دی لیکن وہاں جانے سے انکار کر دیا کہ وہ پہلے ہی کہہ چکی تھیں کہ وہ وہاں نہیں جائیں گی۔

۴) ۔ایک بزرگ خاتون نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ سنایا کہ وہ اپنے گھر کے پائیں باغ میں مغرب سے کچھ پہلے قرآن پاک کی بلند آواز میں تلاوت کر رہی تھیں۔اچانک ان کی نظر دائیں طرف کی جھاڑیوں پر پڑیں جہاں ایک بہت بڑا سانپ اپنی دم کے بل پر پھن اٹھائے کھڑا جھوم رہا تھا۔خاتون جن کی عمر

اس وقت بمشکل دس بارہ سال ہوگی گھبرا گئیں اور انکی چیخ نکل گئی۔ چیخ سن کر گھر والے آ گئے اور سانپ کو دیکھ کر ایک صاحب بندوق لینے دوڑے۔ اتنی دیر میں سانپ جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ خاتون کا کہنا ہے کہ مجھے ایسا لگا تھا جیسے سانپ وہاں دیر سے موجود تھا اور تلاوت پر جھوم رہا تھا۔ سب لوگوں کے آنے کے بعد بھی اس نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور غائب ہوگیا۔

۵)۔ ہمارے بچپن کے ایک دوست ڈاکٹر ہیں۔ گریڈ ۲۰ میں ریٹائر ہو گئے ہیں۔ ما شااللہ پرائیویٹ پریکٹس بہت زبردست ہے۔ بہت سادہ طبیعت ہیں۔ پنج وقتہ نمازی ہیں۔ مزاروں سے عقیدت ہے۔ کسی خاص مزار کے ارادت مند نہیں۔ بس جمعرات کو کسی نہ کسی مزار پر حاضری دیتے ہیں اور فاتح خوانی کرتے ہیں۔ ایک دن کہنے لگے یار ہم لوگ کبھی کبھی اللہ سے ضد کر بیٹھتے ہیں۔ سوچے سمجھے بنا۔ ہم کچھ نہ سمجھے تو کہنے لگے ''میری عادت ہے میں عشاء کے بعد کچھ وضائف کا ورد کرتا ہوں پھر دعا مانگ کر سو جاتا ہوں۔ اللہ دعائیں قبول کرتا ہے۔ زندگی بہت مزے سے گذر رہی ہے۔ کسی قسم کی کمی نہیں۔ لیکن چند دن پہلے نہ جانے کیا ہوا کہ دعا میں ضد کرنے لگا کہ اللہ مجھے مال دے۔ حالانکہ اللہ کا دیا سب کچھ ہے لیکن نہ جانے کیا دھن سوار ہوئی کہ روزانہ یہ ہی دعا مانگنے لگا۔ دو تین دن بعد خواب میں ایک فقیر کو دیکھا اور اس سے ملنے کی ترغیب ہوئی۔ پہلے پہل تو میں نے اسے واہمہ جانا لیکن جب مسلسل یہ ہی خواب تواتر سے دیکھنے لگا تو سوچنا پڑا اور اس فقیر کی تلاش شروع کر دی۔ کراچی اور حیدرآباد کے تمام مزاروں اور درگاہوں پر تلاش کیا لیکن اس حلیئے کے فقیر سے ملاقات نہ ہوئی۔ میں مایوس ہوگیا اور تلاش چھوڑ دی۔ اتفاقاً کچھ دن بعد ایک جمعرات کو میں حیدرآباد کے مکی شاہ بابا کے مزار پر حاضری کے لیئے گیا تو وہاں اچانک میری نظر اس ہی حلیئے کے فقیر پر پڑی جو ایک پبلک لیٹرین میں کھڑا تھا۔ میں فوراً ادھر لپکا لیکن پھر ٹھٹک گیا کیوں کہ لیٹرین غلاظت سے اٹی ہوئی تھی۔ فقیر کا بھی یہ حال کہ اسکے پیر ہی نہیں لباس بھی غلاظت سے لتھڑا ہوا تھا۔ فقیر نے مجھے دیکھ کر قریب آنے کا اشارہ اور اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیئے۔ میں سمجھا کہ باہر نکلنے کے لیئے مدد چاہتا ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کروں۔ کیونکہ مدد کرنے کی صورت میں خود کے ناپاک ہونے کا احتمال تھا۔
عقل نے کہا کہ چھوڑ کس چکر میں پڑ رہا ہے لیکن پھر اس جستجو اور خواری کا خیال آیا جو میں نے اس کی تلاش

میں کی تھی۔ میں نے ہمت کی اور ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے ایک ذرا سی صاف جگہ نظر آئی۔ میں نے وہاں پیر جمائے اور فقیر کو کاندھے سے پکڑا تا کہ میرے ہاتھ نہ ناپاک ہو جائیں۔ اب میں نے اسے کھینچنا چاہا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ باہر آنے کی بجائے، الٹا وہ مجھے اندر کھینچ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے فوراً اس کے کاندھے چھوڑے اور اپنے آپ کو لتھڑنے سے بچانے کے لیئے باہر کی طرف کود گیا۔ شکر ہے میرے بدن کا کوئی حصہ ناپاک نہیں ہوا۔ میں وہاں سے ہٹ کر مزار پر گیا اور فاتح خوانی کے بعد پلٹ کر پھر اس لیٹرین پر آیا تو میری حیرت کی کوئی حد نہ تھی کہ وہاں نہ وہ فقیر تھا نہ کوئی غلاظت تھی۔ بالکل صاف ستھری جگہ تھی۔ تعجب ہوا۔ کیونکہ پانچ سات منٹ میں اس طرح صفائی ناممکن تھی۔ پھر کافی دیر تک میں نے اسے تلاش کیا۔ لیکن اسنے نہ ملنا تھا نہ ملا۔''

۶)۔ امریکہ میں سیٹلڈ ایک خاندان کے دس بارہ افراد اپنے عزیز و اقارب سے ملنے کے لیئے پاکستان آنے کی تیاری کر رہے تھے۔ پیرس تک TWA پر بکنگ ملی اور وہاں سے آگے کا سفر پی آئی اے سے تھا۔ روانگی سے ایک روز قبل شاپنگ کر کے لوٹ رہے تھے کہ دو ممبران کو ایک کار نے کچل دیا۔ خوشی کا سفر غم میں بدل گیا اور وہ سب لوگ اپنے پیاروں کے تابوت لے کر جہاز پر سوار ہونے کے لیئے چل پڑے۔ دونوں تابوت بھی جہاز پر رکھے جانے کے منتظر تھے۔ جہاز روانہ ہوا تو یک صاحب کی نظر پڑی تو دیکھا دونوں تابوت لوڈ ہونے سے رہ گئے ہیں۔ انہوں نے شور مچایا تو عملے نے بتایا کہ تابوتوں کا سائز دو انچ بڑا تھا اس لیئے ریک (RACK) پر نہیں رکھا جا سکا۔ اب کسی دوسری فلائٹ سے بھجوا دیا جائے گا۔ یہ سن کر سب نے شور مچا دیا کہ نہیں ہم سب میت کے ساتھ جائیں گے۔ مجبوراً جہاز کو واپس آنا پڑا اور ان لوگوں کو اتار کر جہاز روانہ ہوگیا۔ ابھی یہ لوگ ائیر پورٹ پر فارمیلیٹیز پوری کر رہے تھے کہ اطلاع آئی کہ وہ طیارہ جس سے یہ سب لوگ آف لوڈ ہوئے تھے پرواز کے کچھ ہی دیر بعد سمندر میں گر کر تباہ ہوگیا

۷)۔ 11 / 9 کے بعد عراق، افغانستان اور پاکستان میں جس طرح مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا ہے اس پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ امریکیوں کے ہی نہیں ہمارے لیڈران کے بیانات بھی زخموں پر نمک پاشی سے کم نہیں۔ ہر لیڈر اپنے کانوں کو نہیں دیکھ رہا، کوؤں کے پیچھے بھاگ رہا ہے کہ میرے کان لے گیا۔ ستم یہ ہے کہ مرنے والے دو چار نہیں سینکڑوں میں ہوتے ہیں۔ مرنے والوں کا کوئی

سرکاری طور پر غم نہیں مناتا۔ الٹا انہیں دہشت گرد قرار دیا جاتا ہے۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ بارات میں مرنے والے بچے دہشت گرد تھے یا خواتین؟ مدرسہ میں مرنے والے ۸۰ بچے شہید ہوئے یا جہنم رسید۔ جس قوم کو جانوروں کے مرنے تک کا غم ہوتا ہے وہ سوڈیڑھ سو معصوم لوگوں کے مرنے پر افسوس تو کر لیتا ہے لیکن معذرت کرنے سے معذور ہی رہتا ہے۔ ایسے میں حیرت ہوئی کہ اس کے ایک جنرل نے بہانگ دہل مطلع کیا کہ اب تک ان کے حملوں سے ۱۴ دہشت گرد مارے گئے اور ۷۰۰ بے گناہ۔ بس سمجھ لیجیئے ۷۰۰ بٹا ۱۴۔ یعنی ایک دہشت گرد کے ساتھ ۵۰ معصوم بھی گئے۔ پچھلے وقتوں میں ایک ایک پر تین ہوتے تھے۔ تین آدمی مل کر ایک ڈاکو پکڑتے تھے لیکن اب ایک دہشت گرد کے لیئے ۵۰ جانیں قربان ہوتی ہیں۔ ویسے ہمیں یہ غم بھی ہے کہ پاکستانیوں کے مرنے پر امریکہ کا ردِعمل درست نہیں ہوتا۔ بس اطلاع دیدی کہ ۷۰۰ معصوم مارے گئے۔ جبکہ افغانستان میں اس سے ملتے جلتے ایک واقعے میں ڈیڑھ سو بچے اور خواتین مارنے کے بعد اوباما نے افسوس کا اظہار تو کیا۔ اگر ایسا ہی اظہار یہاں کے لیئے بھی ہوتا تو کم از کم ہمارے وزرا کو امریکہ کا شکریہ ادا کرنے کا ایک اور موقع تو ہاتھ آتا۔۔۔

۸ مئی ۲۰۰۹ء

ہدائت کار

پیٹر سیلرز کی ایک مزاحیہ فلم تھی، دا پارٹی 'The Party'۔ مزاحیہ تھی اس لیئے حماقتیں تو ہونگی۔ ہوسکتا ہے آپ نے بھی یہ فلم دیکھی ہو، لیکن پھر بھی کم از کم وہ سین دہرانے میں کوئی حرج نہیں جس میں پیٹر سیلرز ایک فلم کی عکسبندی میں حصہ لے رہا ہوتا ہے۔ کردار ایک احمق کا تھا۔ سین کے مطابق اسے ایک مزدور کی حیثیت سے پہاڑوں میں بچھائے ہوئے ڈائنامائٹ کو اڑانے کے لیئے سوئچ کو دبانا تھا۔ جیسے ہی وہ سوئچ پر ہاتھ رکھتا ہے ڈائرکٹر کی نظر پیٹر کے ہاتھ پر بندھی ہوئی بیش قیمت گھڑی پر پڑتی ہے۔ مزدور کے ہاتھ میں بیش قیمت گھڑی دیکھ کر ڈائریکٹر چیخ پڑتا ہے اور فلم بندی رکوا کر اسے گھڑی اتارنے کا حکم دیتا ہے۔ پیٹر سیلرز کو بتایا جاتا ہے کہ اس وقت وہ پیٹر سیلرز نہیں ایک غریب مزدور ہے۔ اس طرح ڈائیریکٹر کی صلاحیتوں کے باعث ایک کوتاہی کو فلمانے سے بروقت روکدیا جاتا ہے۔ اسکرپٹ مضبوط تھا۔ ڈائیریکٹر قابل تھا اسلئے اس کی مداخلت سے سین میں جان پڑجاتی ہے اور مزاح کا پہلو بھی اجاگر ہوجاتا ہے۔ یہ تو فلم کی عکس بندی کی بات تھی اور سب کچھ اسکرپٹ کے تحت تھا ورنہ فلموں میں تو کپڑے بدل جاتے ہیں۔ بس میں چڑھتے ہوئے جو لباس ہوتا ہے وہ اترتے وقت بدل جاتا ہے۔ اکثر ایسے نالائق ڈائرکٹر بھی ہوتے ہیں جو دھیان ہی نہیں دیتے کہ ایک ہی سین میں ہیرو کی ڈاڑھی اگ آتی ہے۔ ہندو پاک میں تو بڑے بڑے نامی گرامی ہدایتکار کنٹینوٹی 'Continuity' کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ ہاں خواجہ خورشید کا کمال تھا کہ ماچس کی ڈبیہ تک کا خیال رکھتے تھے کہ کہیں دوسری بار استعمال میں ہی نئی ڈبیہ نہ آجائے۔ اگر ہیرو سگریٹ پی رہا ہے تو وقت کے لحاظ سے سگریٹ کے سائز کا خیال رکھا جاتا تھا۔ یہ نہیں کے ری ٹیک کرتے کرتے صرف ٹوٹا ہی ہاتھ میں رہ جائے۔ کہتے ہیں سچ بولنے میں یا حقیقت دکھانے میں ایسی غلطیاں نہیں ہوتیں۔ ہاں جھوٹ بولتے وقت دھیان نہیں رہتا اور متزاد باتیں ظہور میں آجاتی ہیں۔ فلموں کے تو اسکرپٹ لکھے جاتے ہیں اور اگر عملہ قابل ہو تو ایسی کوتاہیوں سے بچا جاسکتا ہے۔ لیکن حقیقی زندگی میں جھوٹ کا پول کھلتے دیر نہیں لگتی ایک دفعہ حزب

اختلاف نے ہڑتال کی کال دی ۔حکومت ہڑتال کو ناکام ثابت کرنا چاہ رہی تھی اس لیئے ایک دن پہلے بازاروں کی فلم بندی کر لی گئی جس میں دکانوں کو کھلا دکھایا گیا تھا۔اب ہڑتال تو کامیاب ہوئی لیکن سرکاری میڈیا نے یہ ثابت کرنے کے لیئے کہ ہڑتال ناکام رہی۔ایک دن پہلے کی بنائی ہوئی فلم چلادی۔جس میں سب دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور لوگ خریداری میں مشغول تھے۔حکومت شاید یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوجاتی لیکن ستم یہ ہوا کہ ہڑتال منگل کی تھی اور فلم بندی پیر کی تھی اس لیئے گوشت کی کھلی دکانوں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔اور حکومت کو خفت اٹھانی پڑی۔لیکن یہ اچھے زمانوں کی بات ہے جب بے غیرتی کا دور دورہ نہیں تھا اور دنیا نے آج کی طرح ضمیر اور شرم کا سودا نہیں کرلیا تھا۔ بھارت نے ایک دہشت گردی کے واقعے کے بعد کچھ گرفتاریاں دکھا کر الزام پاکستانی مسلمانوں پر ڈالدیا۔ایک ملزم نے اعتراف بھی کرلیا اور اقبال جرم کرتے ہوئے دکھانے کے لیئے ٹی وی پر بھی آ گیا۔ملزم نے اپنا نام بتایا جس سے معلوم ہوا موصوف بہ فضل تعالیٰ مسلمان ہے اور پھر اس نے اپنا تعلق پاکستان سے جوڑتے ہوئے بتایا کہ اس نے کہاں کہاں ٹریننگ لی تھی۔خوب جے جے ہوئی لیکن پاکستان کو موردالزم ٹہرانے کی جلدی میں ملزم کی کلائی سے رکھشا بندھن کی راکھی کھولنا بھول گئے ۔یہ بھی ہوسکتا ہے کسی بھارتی ناری نے خوش ہوکر مسلمان ملزم کو بھائی بنا لیا ہو کہ راکھی باندھنا پھیرے لینے سے تو آسان ہے۔ بھارتیوں سے دو جوتے آگے یہودی ہیں جنہوں نے فلسطینیوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کے لیئے اپنے ہی ایک آدمی کو دہشت گرد کا روپ دیدیا تھا۔اس کی آنکھوں کی رنگت چھپانے کے لیئے سیاہ چشمہ کام آیا۔تصویر کھینچ کر میڈیا کو بھجوادی گئی۔مگر چوک ہوگئی کہ اس دہشت گرد کے گلے سے ڈیوڈ اسٹار(David Star)اتروانا بھول گئے ۔اور تصویر اس طرح شائع ہوئی کہ مسلمان عرب کے گلے میں یہودیوں کا ڈیوڈ اسٹار تھا۔لڑکی کو کوڑے مارتے ہوئے دکھانے والے ڈبنگ میں مار کھا گئے ۔لڑکی کی آہ و بقا تو رکارڈ ہوگئی لیکن مجمع کی موجودگی سے پیدا ہونے والا شور غائب تھا۔ہدایت کار بھول گیا تھا کہ ۳۲ کوڑے پڑنے کے بعد مرد کی چال میں بھی لڑکھڑاہٹ آجاتی ۔اچھا ڈائرکٹر ہوتا تو بیک گراؤنڈ میوزک سے ہلکا سا مجمعے کا شور سنوا دیتا اور لڑکی کو لڑکھڑاتے ہوئے بھی دکھایا جاسکتا تھا۔یا بہتر ہوتا کہ اسے اسٹریچر پر لے جایا جاتا۔حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیئے اسکے ساتھی مرد کی حیثیت سے کسی مرد کو بھی کوڑے

پڑتے دکھادیا جاتا سچ کہا ہے کسی نے کہ ہدایت کار اچھا ہو تو چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتا ہے۔جیسے فلم کے سین میں بروقت گھڑی اتروالی تھی۔لیکن برے ہدایت کار سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔وہ بے چارہ گوشت کے ناغے کا خیال تک نہیں کرسکتا۔اور حکومت کی رسوائی کا باعث بنتا ہے۔مسلمان اور وہ بھی پاکستانی مسلمان کی کلائی پر ہندو رسم و رواج کے دھاگے گلے پڑ جاتے ہیں اور سارا ڈرامہ فلاپ ہو جاتا ہے۔دہشت گرد کو فلسطینی ظاہر کرتے وقت گردن سے ڈیوڈ اسٹار نہ اتروانا بھی کوتاہی ہے لیکن جس دور میں جس کی لاٹھی۔۔ والا قانون چلتا ہو تو وہاں ان باتوں سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔۔۔۔

۹/مئی ۲۰۰۹ء

وقت

مسٹر گومز گووا کے عیسائی تھے۔ پاکستان بنتے وقت ان کی فیملی حیدر آباد میں تھی، اس لیئے وہ یہیں سیٹل ہوگئے۔ ریلوے میں ملازم تھے۔ٹرین گارڈ کی حیثیت سے رٹائر ہوئے تو وہ ریلوے کے واحد گارڈ تھے جن کی، دوران ملازمت، کوئی ٹرین لیٹ نہیں ہوئی۔ اس میں ان کی کاوشوں کے ساتھ قدرت کی بھی مہربانیاں تھیں۔ کیونکہ وہ خود کی صلاحیتوں کو بروئے کار تو لاتے ہی تھے۔لیکن ناگہانی آفات کو سوائے اللہ تعلیٰ کے کون روک سکتا ہے۔ٹرین کی روانگی میں وہ بالکل تساہل نہ کرتے۔ لگیج کی لوڈنگ اور ان لوڈنگ میں دیر نہ ہونے دیتے۔ اسٹیشن پر تمام خانہ پُری بھی بروقت کرتے۔ وقت کا بالکل ضیاع نہ کرتے۔ تمام اسٹیشنوں کا عملہ بھی ان سے تعاون کرتا اس لیئے ٹرین بروقت روانہ ہوتی۔ وہ کام جو ان کی دسترس میں تھے وہ پوری تندہی سے کرتے۔ تاکہ تاخیر نہ ہو۔لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو انسان کے بس سے باہر ہوتی ہیں۔ مثلاً کوئی مسافر بوجہ زنجیر کھینچ کر ٹرین رکوا دے۔ یا ریلوے کراسنگ پر کسی وجہ سے سگنل نہ ہو۔اور ٹرین لیٹ ہو جائے۔لیکن جیسا کہ ہم نے کہا کہ قدرت بھی ان پر مہربان رہی اور انکی ملازمت کے دوران کبھی بھی ایسا نہ ہوا کہ کوئی معاملہ باعث تاخیر ہوا ہو۔اس لیئے انکا یہ رکارڈ بن گیا۔ اور اس کارکردگی پر ریلویز نے انہیں تعریفی سند سے نوازا۔ مسٹر گومز کو اپنی اس کارکردگی پر بہت فخر تھا۔ وہ اکثر و بیشتر اس کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ بلا کے بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ انکی موجودگی میں کوئی بور نہیں ہوسکتا تھا۔ اکثر پرانے لطیفوں کو بھی اپنی آپ بیتیوں میں اس طرح استعمال کرتے کہ گمان ہوتا وہ حقیقت میں ان کے قصے کا حصہ ہیں۔ رٹائرمنٹ کے بعد ان کے مشاغل میں روزانہ اسٹیشن کا ایک چکر لگانا بھی تھا۔ وہ روزانہ شام کو نیلا سوٹ پہن کر اپنی چھڑی لیتے اور سگار مونہہ میں دبا کر ٹہلتے ٹہلتے اسٹیشن پہنچ جاتے۔ وہاں اپنے واقف کاروں کے ساتھ کچھ دیر گپ شپ کرتے۔ اگر اس دوران کوئی ٹرین آجاتی تو اس کے گارڈ سے ضرور علیک سلیک کرتے۔ انہیں اس کا بڑا کلک تھا کہ انکے روز کے اس معمول میں کبھی کوئی ٹرین بروقت آئی ہو۔ انکا ٹہلنے کا وقت مقرر تھا لیکن ٹرینوں کی آمد مقرر نہ تھی۔ جس

وقت وہ پلیٹ فارم پر ہوتے وہ وقت تیزگام کی آمد کا تھا۔لیکن شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا کہ وقت پر تیزگام آجاتی۔ کبھی اس وقت، کوئی دو چار گھنٹے لیٹ والی ٹرین پہنچ جاتی۔ کبھی تیزگام پندرہ بیس منٹ لیٹ پہنچتی۔ اگر گھنٹہ دو گھنٹہ لیٹ ہوتی تو مسٹر گومز واپسی کے لیئے چل پڑتے۔ شائد ہم بتانا بھول گئے کہ گومز کو تیزگام سے بہت زیادہ انسیت تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ گارڈ بنے تھے تو ان کی تعیناتی اس ہی ٹرین پر ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت اس کا نام کوئین ایکسپریس تھا۔ بعد میں جب نام بدل کر تیزگام ہوا تب بھی ان کی ڈیوٹی اس ہی ٹرین پر رہی۔ ایک دن گومز حسبِ معمول پلیٹ فارم پر تھے کہ معلوم ہوا تیزگام لیٹ ہے۔ ریلوے کی خراب کارکردگی پر افسوس کرتے ہوئے لوٹ آئے۔ دوسرے دن جب اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا، تیزگام پہنچ رہی ہے۔ گھڑی دیکھی تو خوشی ہوئی کہ آج ٹرین وقتِ مقررہ پر پہنچ رہی تھی۔ چند لمحوں میں ٹرین پہنچ گئی تو گومز گارڈ کے ڈبے پر پہنچے اور گارڈ کو مبارک باد اور سگار پیش کرتے ہوئے بولے 'ویری گڈ مائی بوائے۔ آج تم وقت پر آئے ہو۔ یہ لو سگار قبول کرو'۔ نوجوان گارڈ نے کہا۔ 'نو، تھینکس مسٹر گومز۔ سگار آپ ہی رکھیئے، گاڑی چوبیس گھنٹے لیٹ ہے۔' گومز نے یہ لطیفہ اپنی ذات سے منصوبہ کرتے ہوئے ہمیں اس وقت سنایا جب ہم انکے ڈرائنگ روم میں موم بتی کی روشنی میں شطرنج کھیل رہے تھے۔ ہنستے ہوئے بولے۔ مسٹر کیفی۔ چوبیس گھنٹے لیٹ ہونے سے میں دھوکا کھا گیا تھا۔ یقین کرو محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ گاڑی لیٹ ہے۔ پھر قہقہہ لگا کر بولے یہ چوبیس گھنٹے کا سائیکل بھی خوب ہے۔ ۲۴ گھنٹے کا پتہ نہیں چلتا۔ ہاں دو تین گھنٹے کی سب کو خبر ہو جاتی ہے۔ ہنستے ہنستے اچانک سنجیدہ ہو کر کچھ سوچنے لگے۔ ہم نے ٹوکا۔ 'مسٹر گومز کس سوچ میں پڑ گئے' ہمارا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگے 'یار یہ بتاؤ یہ جو گھڑیاں ایک گھنٹہ آگے کر دی گئی ہیں اس سے کتنی بجلی بچے گی''۔ ہم نے بتایا کہ ہمیں صحیح پتہ نہیں لیکن بقول وزیر صاحب کے ٹھیک ٹھاک بچت ہوگی۔ کہنے لگے اگر فرض کرو ایک گھنٹہ آگے کرنے سے ۵۰۰ میگاواٹ بچت ہوتی ہے تو کیا چوبیس گھنٹے آگے کرنے سے ۱۲۰۰۰ میگاواٹ کی بچت نہیں ہوگی۔ ہم نے بھی مسکراتے ہوئے کہا میتھس کے اصول سے تو یہ ہی ہونا چاہئے۔ بولے 'اور کیا۔ اور پھر جو عوام گھڑیاں ایک گھنٹہ آگے کرنے سے حکومت کو تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں وہ الگ!۔ اگر گھڑیاں چوبیس گھنٹے آگے کر دی جائیں تو بچت بھی زیادہ ہوگی اور عوام کو احساس بھی نہ ہوگا کہ گھڑیاں آگے کر دی گئیں ہیں۔ جیسے مجھے

تیز گام کے لیٹ ہونے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا''۔ یہ کہہ کر ہماری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ہم نے کہا وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس صورت میں کیلنڈر میں گڑ بڑ ہو جائے گی۔فرمایا کیا فرق پڑتا ہے۔پھر ہمیں یاد دلایا کہ یہ تو صرف ایک دن کی بات ہے شہنشاہ ایران نے تو ایرانی کیلنڈر کو شائد ڈھائی ہزار سال آگے کر دیا تھا۔ہم نے جواباً یاد دلایا کہ ہاں کیا تو تھا لیکن پھر شہنشاہ کا حشر کیا ہوا تھا۔وقت کے ساتھ مذاق کرنے والوں کے ساتھ جب وقت مذاق کرتا ہے تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔گھڑیاں آگے پیچھے کرنے والوں کی نظر میں وقت کی اہمیت نہیں رہتی اور وہ سمجھنے لگتے ہیں وقت انکی مٹھی میں ہے اور پھر وقت ریت کی طرح ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔دور کیوں جاتے ہو اگر چیف جسٹس کو فقط دو دن پہلے بحال کر دیا گیا ہوتا تو کیا کنٹینروں کی مدمیں اربوں روپے کے نقصان سے نہیں بچا جا سکتا تھا۔؟؟؟۔۔

۱۲ مئی ۲۰۰۹ء

بغلول

ہمارا خیال ہے کہ ہر آدمی کے اندر ایک بغلول بھی ہوتا ہے جو سادگی، شرافت اور ایمانداری کا مرکب ہوتا ہے۔فی زمانہ اس مرکب کو حماقت کہتے ہیں اور حامل کو احمق سمجھا جاتا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ اگر یہ تینوں چیزیں نہ ہوں تو انسان، انسان نہیں رہتا۔کوئی ہو نہ ہو لیکن ہم اپنے اندر چھپے بغلول سے مطمئن ہیں اور اکثر تنہائی میں اس سے باتیں کر لیتے ہیں یہ اور بات کہ یہ کبھی کبھی ہمیں زچ بھی کر دیتا ہے۔مثلاً کل ہی ہم سے کہنے لگا کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ مجھے جج بنا دیا جائے۔ہم چونکے تو بولا ''دیکھو نا لاکھوں کیسس پینڈنگ میں ہیں اور معزز عدالتوں پر بڑا دباؤ ہے۔کچھ لوگ بڑے خلوص سے چاہتے ہیں کہ عدالتیں اپنا کام آزادی سے کریں جب کہ وہ لوگ جو بحالیء عدالت کے خلاف تھے بڑی ریاکاری سے وقتاً فوقتاً طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔'اب تو عدالتیں بحال ہو گئی ہیں اب تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا' یا جسٹس ڈیلیڈ از جسٹس ڈینائڈ یا ہر بات کے لیئے کہتے ہیں عدالت کو اس پر از خود نوٹس لینا چاہیئے۔حد تو یہ ہے کہ کچھ لوگ ڈرون حملے رکوانے کے لیئے طنزیہ انداز میں فرماتے ہیں کہ اس پر لانگ مارچ کیوں نہیں کرتے۔''

بات سچ تھی اس لیئے ہم نے کہا ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں جج بنانا تو ناممکن ہے کیونکہ اس کے لیئے تعلیم اور قابلیت ہی نہیں کچھ اور فارمیلیٹیز بھی ہوتی ہیں۔کہنے لگا دیکھو اسطرح عدالتوں پر سے بوجھ کم کرنا مقصود ہے اس لیئے ضرورتاً قانون میں ترمیم کر کے مجھے اپائنٹ کیا جا سکتا ہے۔ہم نے سمجھایا کہ بھئی یہ ناممکن ہے اول تو اب نظریہء ضرورت ہمیشہ کے لیئے دفن ہو گیا دوئم یہ کہ انصاف کرنا کوئی آسان کام نہیں کہ ہر ایرا غیرا اٹھ کر عدالت میں بیٹھ جائے۔یہ سن کر مونہہ پھلا لیا تو ہم نے سمجھایا کہ بھئی یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔بڑے بڑے مقدمات ہوتے ہیں جن میں لوگوں کا مال ہی نہیں زندگی تک داؤ پر لگی ہوتی ہے۔چمک کر بولا تو میں کب کہتا ہوں کہ مجھے قتل، اغوا، فراڈ یا نجکاری کے مقدمات دیئے جائیں۔بس میں تو ایسے اشوز پر کام کروں گا جن

سے عوام کا مفاد وابستہ ہو۔ ہم نے پوچھا مثلاً؟ ۔خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''جیسے PTCL کا ظلم! جس سے عوام پریشان ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر اپنے گھر کا فون ون سائڈڈ (one sided) ہو جاتا ہے، تو کہتے ہیں آپ نے بل نہیں جمع کرایا ہوگا۔ جب بتاتے ہیں کہ ہم نے تو وقت پر جمع کرا دیا تھا، تو حکم ہوتا ہے پیڈ (PAID) بل لا کر دکھاؤ اور ایک فوٹو کاپی بھی لیتے آنا۔ اگر کہو کہ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ بل بھی جمع کرا دیا اور دکھانے بھی ہم ہی آئیں تو کہتے ہیں بس جی طریقہ یہ ہی ہے۔ اب بتایئے قصور انکا، یا بینک کا، مگر سزاوار صارف۔''

بغلول کی بات تھی سچ، کہ اکثر یہ پریشانی ہمیں اٹھانی پڑتی ہے۔ جب پی ٹی سی ایل آفس میں شکایت کرو تو کہتے ہیں' آپ نے ڈیوڈیٹ (Due Date) کے بعد جمع کرایا ہوگا۔ بینک کی مہر سے ثابت کردو کہ وقت پر جمع کرایا تھا'۔ یہ کہنے پر کہ بھئی ہم نے وقت سے پہلے جمع کرا دیا تھا تو جواب ہوتا ہے۔ بینک نے ہمیں مطلع نہیں کیا۔ اب آپ بل لا کر دکھا دیں۔ بہرحال جیت پی ٹی سی ایل ہی کی ہوتی ہے اور ہمیں ایک روپیہ فوٹو کاپی کے علاوہ آنے جانے کی تکلیف بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ ہم نے کئی بار آواز اٹھائی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ہم نے بغلول سے اتفاق کرتے ہوئے کہا بات تو تمہاری ٹھیک ہے کہ واقعی یہ لوگ ظلم کرتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے۔ سن کر بولا اس ہی لیئے تو کہتا ہوں کم از کم ان دو محکموں کو درست کرنے کا موقع دلوا دو۔ ہم نے پوچھا دوسرا کونسا؟۔ بولا'' دوسرا واپڈا۔ جس نے ہمارے گھر کے میٹر ۵۰۰ گز دور کسی کھمبے پر لگا رکھے ہیں۔ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا بیسیوں میٹر میں سے ہمارے کونسے ہیں۔ پھر ہر پانچ چھ مہینے بعد ۱۰ یا ۱۵ ہزار کا ایکسٹرا بل بھیج دیتے ہیں کہ ڈیٹکشن لگایا ہے۔ پوچھو یہ ڈیٹکشن کیا ہے تو جواب ملتا ہے آپنے میٹر میں گڑبڑ کی ہے اس کا جرمانہ ہے۔ اب کوئی پوچھے کہ جب ہمیں یہ ہی نہیں پتہ کہ ہمارا میٹر کونسا ہے تو گڑبڑ کیسے کریں گے۔ کہتے ہیں فی الحال تو بل بھرنا ہی ہوگا۔ پھر درخواست دے دینا۔ آج تک تو کسی درخواست پر عمل نہیں ہوا۔ بیسیوں چکر کے بعد چپ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک واقف کار نے بتایا کہ ہر علاقے میں کچھ لوگ کنڈے ڈال کر بجلی استعمال کرتے ہیں جن کی سرپرستی واپڈا کے اہل کار کرتے ہیں۔ اب ان کی استعمال شدہ بجلی کی وصولیابی ہم جیسے بونا فائڈ (Bonafide) صارفین سے ہی کی جاسکتی ہے اور اسکا طریقہء کار یہ ہے کہ ریڈنگ لیتے وقت سو دو سو یونٹ زیادہ لکھ دیتے ہیں

۔جس کی وجہ سے فی یونٹ چارجز بڑھ جاتے ہیں۔ شکائیت کرو تو اگلے بل میں کم کر دیتے ہیں مگر پچھلا بل تو زیادہ ریٹ سے وصول ہو چکا ہوتا ہے۔''

یہ بات بھی وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ واقعی ایسا ہی تھا۔ بلکہ کئی بار تو کوئی ہماری سو دو سو گز تار ہی کاٹ کر لے گیا۔ ہم لوڈ شیڈنگ ہی سمجھتے رہتے اگر دوسرے میٹر کی بجلی نہ آ رہی ہوتی۔ رپورٹ کی تو کہا تار لے آؤ، لگا دیں گے۔ میٹر کے اتنے دور ہونے سے ایک اور دھڑکا رہتا ہے کہ کوئی ہمارے میٹر سے ہمارے خرچے پر فیضیاب نہ ہو رہا ہو۔ اس کے علاوہ اگر کوئی ذاتِ شریف شوقیہ پتھر یا ڈنڈا مار کر میٹر توڑ دے تو جرمانہ بھی ہمارے سر ہوگا۔ ہمیں سوچ میں ڈوبا دیکھ کر بغلول نے پوچھا۔ کیوں غلط تو نہیں کہہ رہا؟ ہم نے کہا نہیں بات تو سچ ہے لیکن تمہارا جج بننا ناممکن ہے۔ تمہارا ہی نہیں اب سیاسی بنیادوں پر بھی کوئی جج نہیں بن سکتا ۔لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ جلد ہی یہ سب محکمے قابو آنے والے ہیں۔ عدلیہ نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے انشااللہ جلد ہی ہمارے ملک سے ناانصافی ختم ہو جائے گی۔ اور پی ٹی سی ایل، واپڈا ہی نہیں ریلوے اور انکم ٹیکس جیسے سفید ہاتھی بھی پابہ زنجیر ہونگے۔

۱۵ مئی ۲۰۰۹ء

لائف اسٹائل

جارج بش کو جوتے تو کئی بار پڑے لیکن مشہور آخری جوتا ہوا جو اسے پڑا ہی نہیں۔جھنڈے کو لگا۔خود کو بچالیا۔جھنڈا جائے جہنم میں !! یہ تو مسلمانوں کا وتیرہ ہے کہ جب تک جان نہ چلی جائے جھنڈا نہیں گرنے دیں گے۔اگر بش کی جگہ کوئی مسلمان ہوتا (مشرف کے علاوہ) تو جوتے کو سر سے روک لیتا مگر جھنڈے کو بچالیتا۔بہر حال یہ آخری جوتا شہرت پا گیا کیونکہ یہ سب کے علم میں آ گیا تھا۔بقایا جوتے عوام کی نظروں سے مخفی تھے اس لیئے شہرت نہ پا سکے۔جوتے پڑنے کا علم ہمیں اسکے موقف کی تبدیلی سے ہوتا رہا۔جب بھی جوتا لگتا وہ اپنا بیان تبدیل کر دیتا۔پہلا جوتا اس وقت لگا جب اسنے 9/11 کے بعد صلیبی جنگ (Crusade) کا ذکر چھیڑ دیا، کہ مقابلہ مسلمانوں سے ہے۔غیبی جوتا لگا تو بیان بدل دیا کہ یہ جنگ تو دہشت گردوں سے ہے۔مسلمان تو خود دہشت گردی کا شکار ہیں۔شائد پھر جوتا ہی پڑا ہوگا کہ بیان میں یہ تبدیلی آئی کہ یہ لائف اسٹائل کی جنگ ہے، تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے۔اب یہ لائف اسٹائل کیا ہے اور تہذیب کیا ہوتی ہے؟ اس کا جائزہ لینے کے لیئے ہم نے کسی سنجیدہ اور فلسفیانہ بحث میں پڑنے کی بجائے مندرجہ ذیل عام فہم واقعات کے ذریعے ذہنی نشونما کے لیئے کچھ غذا بہم پہنچانے کی سعی کی ہے تا کہ نتیجہ برآمد کرنے میں آسانی ہو کہ تہذیب اور لائف اسٹائل ہوتے کیا ہیں؟ ۔اور اسے پرکھنے کا پیمانہ کیا ہے۔تو چلئے دیکھتے ہیں کہ لائف اسٹائل ہے کیا؟ :۔اگر کسی سے پوچھا جائے کہ پانی کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے تو ہمیں یقین ہے بتا نہ پائے گا۔ہاں سائینس میں اسے ٹیسٹ لیس (Tasteless) گردانتے ہیں جبکہ عام آدمی اسے میٹھا یا کھارا کہتا ہے۔اب میٹھے سے مراد چینی کی طرح نہیں۔درحقیقت یہ نہ میٹھا ہوتا ہے نہ کھٹا۔نہ کڑوا۔اسے پھیکا بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ پھیکی چیز بدمزہ لگتی ہے۔اور پانی کو بدمزہ نہیں کہا جاسکتا۔بس کسی بھی مروجہ ذائقے سے اس کی مماثلت نہیں۔بس اس کا اپنا ذائقہ ہے جو ہر کسی کو بھاتا ہے۔بہر حال ذائقے کے علاوہ ہمارا اپنا ایک تجربہ اور بھی ہے کہ پانی کو شیشے کے گلاس سے پینے میں جو لطف ہے وہ اسٹیل کے گلاس سے پینے سے بالکل جدا ہوتا ہے۔چاندی کے کٹورے

میں پینے سے لطف بڑھ جاتا ہے۔اور اگر آبخورے (مٹی کے پیالے) سے پیا جائے تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔اور اگر اس ہی پانی کو آپ چائے کے کپ سے پیئں تو بدمزہ محسوس کریں گے۔یہ ہمارا تجربہ ہے، ہوسکتا ہے آپ اس سے اتفاق نہ کریں۔چائے کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہے۔چھوٹے مونہہ کے کپ میں چائے وہ مزہ نہیں دیتی جو کھلے مونہہ کے کپ سے پینے میں ملتا ہے۔اگر چائے پیالے میں پی جائے تو کیا کہنا۔اس ہی لیئے اب کیفے پیالہ مقبول ہو رہے ہیں اور شائد یہ ہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ اپنے کپ کی چائے ساسر یعنی پرچ (Saucer) میں انڈیل کر پیتے ہیں۔لیکن اس طرح پینے میں آدابِ مجلس (etiquette) کا سوال کھڑا ہو جاتا ہے۔اب آداب کیا ہیں اس کا تعین کون کرے؟ جو اپر کلاس میں رائج ہے وہ ہی آدابِ محفل ہے۔آداب کے تو پیمانے ہی بدلتے رہتے ہیں۔کیا صحیح ہے کیا غلط اس سے کسی کو کوئی غرض نہیں ہاں کون کر رہا ہے یہ ہے اہم !! اگر صاحبِ اقتدار یا صاحب زر کر رہا ہے تو مہذب اور غریب کر رہا ہے تو غیر مہذب۔ہم نے اکثر کاٹھیاواڑی سیٹھوں کو رات گئے دوکانوں کے تھلے (چبوتروں) پر بیٹھے دیکھا ہے۔ان کی نشست کا انداز بھی نرالا ہوتا ہے۔آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہیں لیکن نرالا اس لیئے کہ ایک ٹانگ کو کھینچ کر دوسری ران پر اس طرح ٹکاتے ہیں کہ یوگا کا کوئی آسن لگتا ہے۔پھر پیر کے پنجے کو مسلسل ہلاتے رہنا بھی کسی کمال سے کم نہیں۔ان لوگوں کو یوں بیٹھا دیکھ کر یہ قطعی گمان نہیں ہوتا کہ ان میں سے کوئی بھی کڑوڑ پتی ہے۔دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ایک آدھ کے ہاتھ میں 'ڈان گجراتی' اخبار ہوتا ہے۔بیڑی اور پان تو بلا شرکت غیرے ہر ایک کا مشغلہ ہوتا ہے۔لیکن چائے میں حصہ داری کبھی کبھار اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ایک چائے میں دو آدمی سیر آب ہو لیتے ہیں۔اور ایسا کسی کنجوسی کی وجہ سے نہیں بلکہ محبت اور بھائی چارے کے اظہار کے لیئے کرتے ہیں۔گفتگو کا سلسلہ رات گئے تک چلتا ہے اور وقفے وقفے سے چائے کا دور بھی چلتا ہے پرچ میں چائے پینے کا اہتمام ہم نے وہیں دیکھا۔کیونکہ بلا تکلف یہ لوگ چائے کپ سے پرچ میں انڈیل لیتے ہیں اور پھر جس طرح ہر چسکی سے لطف اندوز ہوتے ہیں وہ کم از کم ضبطِ تحریر میں لانا ہمارے لیئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ان کو دیکھ کر ہی ہمیں تجربہ ہوا کہ پرچ سے چائے پینے کا مزہ کچھ زیادہ ہی شاندار ہوتا ہے۔۔اس ہی طرح چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھانے کا بھی لطف خوب ہے۔لیکن محفلوں میں ایسا کرنے میں یہ قباحت کہ

اگر کوئی چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھانا چاہے تو جنگلی کہلائے گا۔ کہ یہ بدتہذیبی ہے۔ حالانکہ بسکٹ بھی اسکا اور چائے بھی اسکی۔ اس کی مرضی جیسے کھائے پیئے۔ ویسے آپس کی بات ہے چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھانے میں بڑا لطف آتا ہے۔ اس لیئے ہم نے کئی بڑے لوگوں کو خلوت میں یا بے تکلف دوستوں کی محفل میں اس غیر مہذب حرکت کا مرتکب ہوتے دیکھا ہے۔ ایک بڑے لیڈر (جو مولانا بھی تھے۔ نام یاد نہیں) کا یہ بڑا پن تھا کہ وہ اعلانیہ چائے اور بسکٹ کا استعمال کرتے اور کہتے کہ بھئی مجھے تو اسطرح کھانے میں مزہ آتا ہے۔ اس لیئے میں تو ڈبو کر ہی کھاؤنگا۔ اب چونکہ وہ بڑے پائے کے سیاسی لیڈر اور دینی رہ نما تھے اس لیئے کون اعتراض کرتا۔ اعتراض تو دور کی بات کچھ نے تقلید شروع کر دی۔ اگر یہ ہی حرکت کسی چھوٹے موٹے سے سرزد ہو جاتی تو خوب خوب نشانہ بنتا۔ پس ثابت ہوا کہ تمیز، بدتمیزی، تہذیب، بدتہذیبی کا کوئی معیار نہیں۔ جو چیز بڑے گھرانوں میں رائج ہے وہ تہذیب کا حصہ ہے اور غریب کے ہاں جہالت کا درجہ پاتی ہے۔ اگر غریب عورت کم لباس ہو تو قابلِ تنقید ہو گی۔ جب کہ امیر زادی اگر لباس کی صرف تہمت ہی لگا لے تو موڈرن مانی جائے گی۔ جتنی زیادہ موڈرن اتنا ہی لباس کم! کیا صحیح ہے کیا غلط اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑنے سے پہلے ایک واقعہ سنانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی۔ یہ پاکستان بننے کے فوراً بعد کا واقعہ ہے جب انگریزوں کا اثر کم نہیں ہوا تھا۔ کراچی اسٹیشن پر ٹرین روانگی کے لیئے تیار تھی۔ چونکہ اس کے فوراً بعد کسی ٹرین کی روانگی نہ تھی اس لیئے پلیٹ فارم پر رش نہ تھا۔ روانگی میں ابھی کچھ دیر تھی اس لیئے کچھ مسافر اور ان کو رخصت کے لیئے آنے والے ریستوران میں بیٹھے تھے۔ ایک انگریز بھی موجود تھا۔ اس نے چائے کا آرڈر دیا۔ ابھی وہ کپ میں چائے انڈیل ہی رہا تھا کہ ٹرین نے سیٹی بجادی۔ انگریز نے جلدی سے دو تین برف کی ڈلیاں لے کر چائے میں ڈال لیں اور جلدی جلدی چائے کے دو تین گھونٹ بھر کر پیالی خالی کی اور دوڑ کر اپنے کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گیا۔ دو تین نوجوان جو شائد کسی کو رخصت کرنے آئے تھے۔ یہ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ٹرین کی روانگی کے بعد چائے منگوائی اور پھر انگریز کی تقلید میں اپنی اپنی پیالیوں میں برف کی ڈلیاں بھی شامل کر لیں۔ لیکن پہلے ہی گھونٹ سے چائے کی بدمزگی انکے چہروں سے عیاں تھی۔ بیچارے یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ انگریز نے چائے میں برف کیوں ڈالی تھی۔

۱۱۷

دل کو لگتی ہے بات۔۔۔

چند دن پہلے ہلیری کلنٹن کو تشویش لاحق ہوئی تھی کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثے دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں ہلیری کی بات ایسی دل پر لگی کہ ہم نے بھی اپنے کالم میں اس تشویش کا اظہار کر دیا کہ پاکستان نہیں، امریکہ کے ایٹمی اثاثے غیر محفوظ ہیں۔ شکر ہے کہ ہماری بات درست نکلی اور یہ ثابت ہو گیا کہ واقعی امریکی جوہری پروگرام غیر محفوظ ہیں۔ اطلاع ملی ہے کہ امریکی صدر نے ۲۶۶ صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ اپنے کسی ادارے کو بھجوائی تھی جو غلطی سے انٹرنیٹ پر جاری ہو گئی۔ اس رپورٹ میں انتہائی خفیہ معلومات، نقشے، کوڈ ورڈز (code words) کے علاوہ جوہری ایندھن کے ذخیرہ کرنے کے مقامات کا بھی ذکر تھا۔ گرچہ غلطی کا احساس ہوتے ہی اس رپورٹ کو انٹرنیٹ سے ہٹا دیا گیا لیکن حکومتی اداروں نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ یہ معلومات دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتی ہیں۔ ہوسکتا ہے چین، ایران یا کوریا کی نظر انٹرنیٹ پر پڑ گئی ہو لیکن اول تو وہ دہشت گرد نہیں، دوئم ان میں صلاحیت نہیں۔ اس لیئے ان معلومات سے استفادہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ رہ گئے طالبان تو ان کو انٹرنیٹ سے کھیلنے کی فرصت کہاں۔ ویسے ان میں تمام تر صلاحیت موجود ہیں۔ اس ہی لیئے تو ہلیری کلنٹن کو تشویش تھی کہ پاکستانی ایٹم ان کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اور یہ تو ہلیری ہی بتا سکتی ہیں وہ اسے استعمال کیسے کریں گے۔ کیا کسی راکٹ لانچر کو کاندھے پر رکھ کر ایٹم بم داغا جا سکتا ہے۔ یا امریکہ نے طالبان کو خفیہ طور پر 'F-16' دے رکھے ہیں۔ پاکستان کے ایٹمی اثاثے تو محفوظ ہیں لیکن خدانخواستہ طالبان کی نظر سے '266' صفحات پر مشتمل یہ خفیہ رپوٹ گذر گئی تو پھر وہ بجا طور پر امجد خان اسٹائل میں کہہ سکیں گے۔ 'اب تیرا کیا ہو گا کالیا!!'

ہم تو شروع سے ہی شاکی ہیں کہ جو ملک اپنے ایئر پورٹ کی حفاظت نہیں کر سکتا جہاں سے بیک وقت کئی جہاز اغوا ہو سکتے ہوں وہ کیسے اپنے ایٹمی اثاثوں کی حفاظت کر سکے گا۔ اس کے علاوہ غیر ذمہ داری کا

۱۱۸

الزام بھی امریکہ پر لگ سکتا ہے کہ اسکے صدر ٹرومین نے جاپان پر دو ایٹم پھینک دیئے تھے۔ جرمنی، اٹلی اور ٹرکی اس لیئے بچ گئے کہ یورپ میں واقع ہوئے ہیں۔ جب کہ جاپان ایشیا میں ہونے کی وجہ سے مارا گیا ورنہ دوسری جنگ عظیم کا روحِ رواں تو جرمنی تھا۔ یہ عنایت اس پر کیوں نہ ہوئی۔ ویسے آفرین ہے جاپان پر کہ آج وہ امریکہ کا ایسا فین (Fan) ہے کہ کہا جا سکتا ہے وہ شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے۔ "جس نے کی شرم اسکے پھوٹے کرم۔۔ جس نے کی بے حیائی اس نے کھائی دودھ ملائی" بس اب وہ دودھ ملائی کھا رہا ہے۔ پاکستان، ایران یا کوریا ایٹمی تجربات کرتا ہے تو امریکہ سے پہلے اسے تکلیف ہوتی ہے۔ اقتصادی پابندی میں بھی پہل کرتا ہے لیکن اسرائیل اور بھارت اس سے مستثنیٰ رہتے ہیں۔ امریکہ، حقیقتاً ایٹمی ٹیکنالوجی اسرائیل کو منتقل کرے تو جائز۔ لیکن پاکستان شک کی بنیاد پر ہی ملزم نہیں، مجرم ٹھہرے۔ مندجہ بالا دودھ ملائی والی کہاوت کی بازگشت ابھی ہمارے ذہن میں گونج رہی تھی کہ ٹی وی کے پروگرام میں ایک وفاقی وزیر اور سینیٹر وسیم سجاد کی باتیں ایسی دل کو لگیں کہ ہم ایٹم بم کے ذکر کو ادھورا چھوڑ رہے ہیں تا کہ ان بیانات کا جائزہ لیا سکے جو ہمارے دل پر اثر انداز ہوئے۔ اگر کچھ دیر کے لیئے دودھ ملائی والی کہاوت کو بھلا دیا جائے تو وفاقی وزیر کی بات سے ہمیں قلبی سکون حاصل ہوا۔ کیونکہ ہم نے جب سے انٹرنیٹ پر اپنے وزرا کے دورہء امریکہ کے دوران بنائے ہوئے کلپ دیکھے تھے دل پریشان ہو گیا تھا۔ وزیر صاحب کے لیئے دل سے دعا نکلی کہ 'تیری آواز مکے اور مدینے'۔ موصوف نے بتایا کہ امریکہ کے دورے میں بنائے گئے اسکینڈل میں کوئی حقیقت نہیں اور انہوں نے وہاں ایسا کچھ نہیں دیکھا۔ یہ سن کر ہماری پریشانی دور ہو گئی۔ واقعی آج کے دور میں جس طرح جعلی وڈیوز بنائی جا رہی ہیں تو اس سے ہر قسم کے اسکینڈلز کی توقع کی جا سکتی ہے۔ مجرے میں وزیر بھی دکھائے جا سکتے ہیں اور ڈالرز بھی ہوا میں اڑتے نظر آ سکتے ہیں۔ اس ہی پروگرام میں ہم وزیر صاحب کی اس بات سے بھی متفق ہوئے کہ پرویز مشرف کا احتساب کرنے سے پہلے ایوب، یحییٰ اور ضیا الحق کا احتساب ہونا چاہیے۔ بلکہ ہم تو کہیں گے کہ ان سے بھی پہلے ہابیل اور قابیل کا مقدمہ زیرِ غور آنا چاہیئے کہ پہلی برائی تو وہیں سے شروع ہوئی تھی۔ اسکینڈلز کے حوالے سے وسیم سجاد کی یہ بات بھی دل کو لگتی ہے کہ شوکت عزیز کے خلاف بنائے گئے چینی، اسٹیل مل، اسٹاک ایکسچینج و دیگر اسکینڈلز غلط ثابت ہو گئے۔ اس کے لیئے ان کا

استدلال ہے کہ پانچ سال میں اب تک ان کے حوالے سے کوئی چیز سامنے نہیں آئی تو ثابت ہو گیا کہ اسکینڈلز جھوٹے تھے۔ ماشا اللہ وسیم صاحب پائے کے وکیل ہیں اور واقعی یہ ثبوت کافی ہے۔ اب آپ قتل کر دیں اور پھر کوشش کر کے ایف آئی آر نہ کٹنے دیں اور نہ ہی تحقیقات ہونے دیں۔ پانچ سال بعد آپ کہہ سکیں گے 'اب تک کوئی چیز سامنے نہیں آئی تو ثابت ہو گیا کوئی قتل وتل نہیں ہوا تھا'۔ بہر حال دونوں حضرات کی بات ہمارے دل کو لگی۔ کسی بزرگ نے کہا تھا کہ جب آدمی کو ہر عورت خوبصورت لگنے لگے تو سمجھ لو وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ ہمارا خیال اس سے مختلف ہے کیوں کہ بوڑھے تو ہم بھی ہیں لیکن ہمیں ہر عورت خوبصورت نہیں لگتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب ہر بات ہمارے دل کو لگتی ہے۔ اس لیئے ہمارا خیال ہے کہ آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو ہر کسی کی بات دل کو لگتی ہے اس ہی لیئے اب ہم اکثر یہ شعر پڑھتے رہتے ہیں۔ ع

؎ دل کو لگتی ہے بات بکری کی
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی

۴/ جون ۲۰۰۹ء

بلاس فیمی (Blasphemy)

حمایت علی شاعرؔ نے کہا تھا۔ع

یہ راستے میں جو پتھر پڑا ہوا ہے
محبت اسے سنوار دے تو یہ ہی صنم ہے
اور عقیدت تراش دے تو یہ ہی خدا ہے

یہ تو ہوئی شاعری کی بات لیکن عام کہاوت ہے کہ ''مانو تو دیو، اور نہ مانو۔۔تو پتھر'' خیر کوئی مانے یا نہ مانے لیکن یہ حقیقت ہے کہ تقسیم ہند کے بعد سیکیولرزم کا دعویٰ کرنے والے بھارت میں اقلیتوں، بشمول نچلی ذات کے ہندوؤں پر جو گذرتی ہے وہ وہی جانتے ہیں۔تقسیم کے بعد سے اب تک بیسیوں بار عیسائیوں پر منظّم حملے ہوئے جن میں ان لوگوں کا دورانِ عبادت چرچ میں زندہ جلایا جانا بھی شامل ہے حالانکہ بے چاروں نے کبھی الگ ملک کا مطالبہ بھی نہیں کیا تھا۔مسلمانوں پر تو آئے دن یہ قیامت ٹوٹتی رہتی ہے۔عید، بقرعید اور محرم پر تو خوف ہی طاری رہتا ہے۔اور یہ سب کچھ اضطراری نہیں باقاعدہ منصوبہ بندی اور نامی گرامی لیڈروں کی آشیر باد کے ساتھ ہوتا ہے۔کسی بھی سہانی صبح کو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ فلاں مسجد تو ہزاہا سال پرانے کسی مندر کی جگہ تعمیر کی گئی تھی۔بس پھر اسے منہدم کرانے کے لیئے مسلمان بستیوں پر حملے شروع ہو جاتے ہیں۔کبھی ٹرین میں دھماکے تو کبھی کسی ٹرین کی بوگی میں مسلمانوں کا زندہ جلایا جانا۔اور یہ عام بات ہے اور دکھ یہ کہ پاکستانی 'N.G.Os' کو اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ ان حملوں کی مذمت ہی کر دیں۔بھارتیوں کی بھلی چلائی وہ تو تاج محل کے بھی دعویدار ہیں سیکیولر بھارت میں برہمنوں کے ہاتھوں نچلی ذات کے ہندو بھی محفوظ نہیں۔ان پر بھی زندگی تنگ کر رکھی ہے۔چانکیہ کے پیروکاروں کی سیاست بھی خوب ہے کبھی مسلمان

صدر، کبھی سکھ وزیرِ اعظم کبھی عیسائی وزیر دفاع بیوقوف بنانے کے کام آتے رہے۔اب امریکن کالے صدر نے نئی راہ دکھائی اور اسپیکر کے عہدے پر ایک اچھوت عورت کو بٹھا کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا انتظام کر لیا ہے ورنہ اچھوت بے چارے برہمنوں کے ہوٹل میں بھی نہیں جا سکتے۔پاکستان میں ۱۹۴۷ سے آج تک ایک بھی ہندو مسلم یا مسلم عیسائی فساد نہیں ہوا۔جب ہم فساد کہہ رہے ہیں تو ہماری مراد منظّم اور منصوبہ بند حملوں سے ہے۔ہاں ردِ عمل کے طور پر کسی ہندو یا عیسائی کو کوئی نقصان پہنچا ہو تو وہ اور بات ہے ورنہ یہ بھی سچ ہے کہ جیسے ہی بھارت میں کوئی مسلم کش فساد برپا ہوتا ہے ہماری حکومت فوراً اقلیتوں کے تحفظ کے لیئے سر گرم عمل ہو جاتی ہے۔ہمیں یاد ہے ۵۰ کی دہائی میں ہم کونونٹ میں پڑھتے تھے۔برابر ہی لڑکیوں کا اسکول تھا۔ایک دن معلوم ہوا کہ کسی عیسائی ٹیچر نے ایک لڑکی سے سپارہ چھین کر پھاڑ دیا۔جس پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔تمام لڑکے اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر نکل پڑے (یہ اور بات کہ ہم میں سے کوئی بھی عید کے علاوہ نماز نہیں پڑھتا تھا)۔بہر حال ہم نے خوب توڑ پھوڑ کی۔عیسائی ٹیچر کے خلاف نعرے بازی بھی ہوئی۔لڑکیوں کے اسکول کے گیٹ کے ساتھ ایک خاتون کا مجسمہ تھا جس کی گود میں نومولود بچہ تھا جسے عیسائی (نعوذ باللہ) بی بی مریم اور عیسیٰؑ مانتے تھے۔ٹوٹ پھوٹ میں وہ مجسمہ بھی شامل رہا۔بات بڑھ گئی۔طلبا سے بات عوام تک پہنچ گئی۔حکومت نے فوراً ایکشن لیا۔پولس کی بھاری نفری پہنچ گئی۔پکڑ دھکڑ بھی ہوئی۔کئی مسلمان ہسپتال پہنچا دیئے گئے۔تمام مندروں اور کلیساؤں پر پہرے بیٹھ گئے۔اعلیٰ سطحی اجلاس ہوئے۔معاملہ ٹھنڈا کرنے کے لیئے اسکول کی پرنسپل نے ٹیچر کو سسپینڈ کر دیا۔معاملہ ٹھنڈا ہوا تو انکوائیری سے پتہ چلا کہ ٹیچر نئی نئی گوا سے آئی تھی اردو سے نابلد تھی۔اس نے جب کلاس میں ایک لڑکی کو متوجہ نہیں پایا تو سر پر پہنچ گئی۔دیکھا تو وہ دس پندرہ صفحے کی ایک کتاب پڑھنے میں مشغول ہے۔وہ سمجھی کہ لڑکی کوئی کہانی کی کتاب پڑھ رہی ہے اس لیئے اس نے وہ چھین لی۔چھینا جھپٹی میں کتاب پھٹ گئی اور یہ مسئلہ پیدا ہو گیا۔جب اسے سپارے کی اہمیت بتائی گئی تو اس نے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کی موجودگی میں معافی مانگی اور سپارے کو سب کے سامنے چوما اور توبہ کی۔سب نے اسے معاف کر دیا۔پاکستان میں اس قسم کے واقعات تو ہوئے لیکن اقلیتوں کے خلاف کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جیسا بھارت میں اکثر ہوتا رہتا ہے۔مسلمانوں کی بستیاں جلانے کے

بعد بھی کسی نے معافی نہیں مانگی۔اس واقعے کے بہت بعد جب بلاس فیمی (Blasphemy) کا قانون بنا تو اقلیتوں نے شد و مد سے مخالفت کی اور تو اور NGO's بھی خوب اچھلے کہ اس قانون کے غلط استعمال کا خدشہ ہے۔کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ کیا دوسرے قوانین کو ایسا کوئی خدشہ نہیں۔کیا ۴۲۰ اور ۳۰۲ کے جھوٹے مقدمے نہیں قائم ہوتے۔اقلیتوں کے ڈرنے کی وجہ بھی سمجھ نہیں آئی۔جب انہیں ایسا کوئی جرم کرنا ہی نہیں تو پھر ڈرنے کی وجہ۔ہمیں جب چوری نہیں کرنا تو پھر ہاتھ کاٹے جائیں یا سر ہمیں کیا؟۔بلکہ ہمارا خیال ہے کہ اس قانون سے ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اب ایسا ہر ملزم عدالت میں پیش ہوگا۔بصورتِ دیگر یہ ہوسکتا تھا کہ لوگ ملزم کو خود ہی سزا دیدیتے اور جذبات میں ڈوبے ہوئے تو کوئی بھی سزا تجویز کر سکتے ہیں۔ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگ قانون کا غلط استعمال بھی کرتے ہیں۔کئی بار دیکھا گیا کہ دو آدمیوں میں کسی بات پر جھگڑا ہوا۔کمزور پڑنے والے نے چیخنا شروع کر دیا کہ بھائیو اس نے ہمارے ملک کو، یا دین کو یا ہمارے لیڈر کو گالی دی تھی۔لیجئے کمک آ گئی اور دوسرا چیختا ہی رہ گیا ارے بھائیو میں تو اس سے اپنا قرض مانگ رہا تھا۔میں نے کسی کو برا نہیں کہا۔میں نے کوئی گالی نہیں دی۔لیکن کون سنتا ہے۔اقلیت والے بھی کم نہیں۔یقین جانئے کہ ہم تو اپنے گلی کے جمعدار سے بھی اونچی آواز میں نہیں بولتے کہ کہیں اپنے اقلیت میں ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمارے خلاف کوئی محاذ نہ کھولدے۔کوئی الزام نہ لگادے۔ہڑتال نہ کردے۔'NGO's' بھی ان کی مدد کو آجائیں گی۔اس لیئے اگر دو مہینے بعد بھی گلی میں صفائی نہ کرے تو ہم چپ ہی رہتے ہیں۔اقلیتوں اور این۔جی۔اوز نے بلاسفیمی کے بل پر ایسا شور مچایا جیسے اس سے کوئی بہت بڑا طوفان آجائے گا۔حالانکہ ایسے کسی قانون کی غیر موجودگی میں بھی اکا دکا جھگڑے ہوتے رہے ہیں۔سپارہ پھاڑنے والا واقعہ بھی بلاسفیمی کے قانون کے پاس ہونے سے پہلے کا ہے۔ایسا ہی ایک واقعہ ایک مؤذن کے ساتھ بھی پیش آیا۔نہ جانے اسے کیا سوجھی کے پھٹے ہوئے سپارے اور ایسے اوراق جن پر قرانی آیات درج تھیں، تلف کرنے کے لیئے جلانے بیٹھ گیا۔کسی کی نظر پڑی تو اس نے شور مچادیا کہ قران شریف جلا رہا تھا۔بیچارے کی خوب ٹھکائی ہوئی۔معلوم ہوا کم علمی اور سستی کی وجہ سے اوراق دریا میں ڈالنے کی بجائے جلانے بیٹھ گیا۔اس کا خیال تھا اس طرح بے ادبی نہیں ہوگی۔ایسے واقعات کم علمی کے باعث رونما ہوتے ہیں۔اگر ہمیں علم اور

دین کی سمجھ ہو تو ہم جذبات کی بجائے عقل سے کام لے کر ایسے واقعات سے بچ سکتے ہیں۔ہمارا ذاتی خیال ہے کوئی بھی شریف اور سمجھدار آدمی چاہے کسی بھی مذہب کا پیروکار ہو بے ادبی کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔اس ہی تناظر میں حال ہی میں سکھر میں رونما ہونے والے ایسے ہی ایک واقعے پر غور اور پھر تجزیہ ضروری ہے جس میں مبینہ طور پر ایک غیر مسلم ڈاکٹر نے ہمارے نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کی۔دلوں کا حال تو اللہ جانتا ہے لیکن یقین نہیں آتا کہ کوئی پڑھا لکھا انسان ایسا کرسکتا ہے۔واللہ اعلم۔کہا گیا ہے کہ اس ڈاکٹر نے کسی دوسرے ڈاکٹر کی مقبولیت سے جل کر اس کے بارے میں طنز فرماتے ہوئے کہا کہ ''اسے تو تم لوگوں نے (نعوز باللہ) پیغمبر ہی سمجھ لیا ہے''۔پھر مزید زور پیدا کرنے کے لیئے کہا ''اس کے نام کے ساتھ 'PBUH' بھی لکھ لیا کرو''۔۔نیتوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کی مراد حضور ﷺ کی شان میں گستاخی تھی یا اس دوسرے ڈاکٹر پر غصے کا اظہار۔!لیکن ہنگامہ تو ہوگیا اور ڈاکٹر کا کلنک بھی جل گیا اور کیس بھی رجسٹر ہوگیا۔

ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ قانون کوئی سا بھی ہو۔نقصان میں شریف آدمی ہی رہتا ہے۔بدمعاش ہر قانون کو اپنے حق میں موڑ لیتا ہے۔کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی ایسا بل بھی پاس ہو جو شریف لوگوں کو تحفظ دے سکے لیکن اس سے پہلے کوئی ایسا پیمانہ ایجاد ہو جو بتا سکے کہ شریف کون ہے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ شریف، بدمعاش اور بدمعاش، شریف ٹھہرے۔۔۔

۱۱/جون ۲۰۰۹ء

چھوٹی چھوٹی خوشیاں

'تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا'۔ ہمیں لگتا ہے یہ مصرعہ ہمارے لیئے ہے۔ کلیوں ولیوں کا تو نہیں معلوم لیکن ہم چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر راضی بالرضا ہو جاتے ہیں۔ تفصیل کچھ یوں ہے کہ ہم کافی زود رنج واقع ہوئے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات کو دل سے لگا لیتے ہیں۔ بس سمجھ لو غم کھانے کا بہانہ ڈھونڈھتے ہیں۔ اس ہی لیئے ایسے میں کوئی چھوٹی موٹی خوشی ہاتھ آ جائے تو تسلی ہو جاتی ہے۔ جتنی جلدی غمزدہ ہوتے ہیں اس سے کہیں تیزی سے غموں کو بھلا دیتے ہیں۔ مثلاً۔ اگر کسی مزاحیہ یا گانوں کے پروگرام کے دوران بریکنگ نیوز میں کہیں دھماکے کی خبر آ جائے جس میں بیس پچیس جانیں تلف اور پچاس ساٹھ زخمی ہونے کی اطلاع ہو تو ہم دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ لیکن خبر نشر ہونے کے فوراً بعد پروگرام کا سلسلہ وہیں سے شروع کر دیا جاتا ہے جہاں سے ٹوٹا تھا تو بس ایک بے خودی سی چھا جاتی ہے اور غم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ محسوس ہی نہیں ہوتا ہے کہ اتنی تعداد میں انسان ختم کر دیئے گئے (شائد اس ہی کو برین واشنگ کہتے ہیں)۔ یہ تو پہلے زمانوں کی باتیں ہیں کہ کچھ لوگ غم کو بھلانے کے لیئے شراب کے ذریعے بے خود ہو جاتے تھے اور جب نشہ اترتا تو پھر وہی غم ہوتا۔ اور پھر مزید پینی پڑتی۔ ع

بے خودی سی چھا گئی تو غم بھی میرا چھٹ گیا
اور پھر ہوگا وہی غم ہوش میں آنے کے بعد اب

ایسا کچھ نہیں۔ کاروبار زندگی ویسے ہی چلتا رہتا ہے۔ لوگوں میں کچھ ایسی بے حسی سرائیت کر گئی ہے کہ سو پچاس کے مرنے کی خبریں لوگ ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کے دوران ہی سنتے ہیں۔ لیکن ہمارا معاملہ دوسرا ہے ہمیں غم بھلانے کے لیئے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی ضرورت پڑتی جو اللہ کے فضل سے ہمیں مل ہی جاتی ہیں۔ کبھی تو، جیسے اوپر بیان کیا کہ ٹی وی کے مزاحیہ پروگراموں سے اور کبھی حکمرانوں کے مزاحیہ بیانوں سے۔ جو اکثر سانحہ

کے فوراً بعد ہی آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اپنی بات واضع کرنے کے لیئے حال ہی میں ہونے والے ایک دھماکے کی مثال پیش کریں گے۔ ایک دھماکہ ہوا۔ بیس جاں بحق ہوئے پچاس زخمی ہوئے۔ ہمارا سکون برباد ہوا۔ دل پر ایک بوجھ سا تھا کہ فوراً ہی ڈی آئی جی صاحب کا بیان آ گیا 'دھماکے میں ۵۰۰ کلو دھماکہ خیز مادہ استعمال کیا گیا'۔ سن کر کچھ اطمینان قلب ہوا کہ چلو وزن تو معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر میں کسی وزیر کا پر مغز بیان بھی آ گیا 'یہ شدت پسندوں کا کام ہے جس کی ہم مذمت کرتے ہیں'۔ چلو خوشی ہوئی کہ یہ تو پتہ چلا کہ شدت پسندوں کا کام ہے۔ ورنہ ہم نہ جانے کیا سمجھتے رہتے۔ اس کے بعد ایک مذہبی رہنما نے بھی رہنمائی فرمائی کہ یہ کام کسی مسلمان کا نہیں ہو سکتا۔ یہ بیان از خود دیا گیا ورنہ کسی نے بھی یہ الزام نہیں لگایا تھا کہ یہ کام کسی مسلمان کا ہے۔ ایسے بیانات سے ہم خوشیاں سمیٹ رہے تھے اور غم میں کچھ افاقہ ہو رہا تھا کہ ایک مزید خوشی کا بندوبست پولس کے ترجمان نے کر دیا کہ صدر اور وزیراعظم کے کہنے پر تحقیقات کا حکم دے دیا گیا ہے اور تحقیقاتی ٹیمیں تشکیل دے دی گئیں ہیں۔ اس حکم پر خوشی ہوئی ورنہ ایسے کسی حکم کی غیر موجودگی میں تحقیقات کیونکر شروع ہوتیں۔ ایک خوشی اس پر بھی ملی کہ خودکش بمبار کا سر مل گیا ہے اور اس کا ڈی۔ این۔ اے حاصل کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں کہ 'DNA' کیوں حاصل کیا جا رہا ہے اور اسے کس سے میچ کیا جائیگا۔ مگر سر کے ملنے سے ایک نیا سوال اٹھ گیا کہ اب تک جو اتنے سر مل چکے ہیں انکا کیا بنا۔ کیا نادرہ کے رکارڈ سے کچھ معلوم ہوا۔ اکثر حزب اقتدار اور حزب اختلاف سولہ سترہ کروڑ عوام کی بات کرتی ہیں تو کیا نادرہ کے پاس سولہ سترہ کروڑ کا رکارڈ ہے، اگر نہیں، تو اب تک نادرہ نے کیا کیا ہے؟ حاصل کردہ سروں کے لواحقین کا پتہ کیوں نہیں چلتا۔ ایسے سروں کی تشہیر کا کیا بندوبست ہے۔ اگر نہیں ہے تو پھر ایسے سروں کی تلاش اور ان کے ڈی این اے پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے۔ بہرحال آجکل ہمیں یہ غم کھائے جا رہا ہے۔ لیکن ہمیں قوی امید ہے کہ جلد ہی کوئی خوشخبری اس ضمن میں ملے گی جس سے ہمارے دل کو سکون مل جائے گا۔ اس کا ہم کو اس لیئے یقین ہے کیونکہ تین چار ہفتے پہلے ایک امریکی جنرل نے جو اکثر پاکستان کے دورے پر رہتا ہے یہ بیان دے کر ہمارا سکون غارت کر دیا تھا کہ اب تک کیئے گئے حملوں سے ۱۴ دہشت گرد مارے گئے لیکن ساتھ ہی ۷۰۰ معصوم جانیں بھی تلف ہوئیں۔ یہ سن کر جو دکھ ہمیں ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ ڈرون حملوں کے نتائج کچھ ایسے ہی

تھے۔ کہ بے گناہ ہی مارے جارہے تھے۔ ہمارا یہ غم اب ختم ہوگیا اور امریکی جنرل جھوٹا ثابت ہوگیا۔ اور اس کا سہرا ہمارے سفیر جناب حسین حقانی کے سر جاتا ہے جنہوں نے یہ انکشاف کیا ہے ڈرون حملوں سے دہشت گردوں کے سرکردہ لیڈروں کا صفایا کردیا گیا ہے۔ ہے نا خوشی کی بات کہ امریکی جنرل کا بیان جھوٹا ثابت ہوا کہ ۷۰۰ بے گناہ مارے گئے تھے۔ افسوس! اتنی اچھی خبر نہ جانے کس مصلحت کے تحت حسین حقانی نے اتنی دیر سے سنائی۔ ورنہ امریکی جنرل نے تو ۷۰۰ بے گناہوں کی موت کا بتا کر ہم جیسوں کو ڈپریشن کا شکار بنادیا تھا۔

۱۵/جون ۲۰۰۹ء

ایک کہانی، نہ نئی نہ پرانی (Non Realistic Ordinance)

ایک ملک تھا (بلکہ اب بھی ہے اللہ کے فضل و کرم سے۔ یہ اور بات کے حالت بری ہے)۔ ٹھیک ٹھاک ترقی کررہا تھا کہ ایک لٹیرے نے شریف حکمرانوں کو چلتا کردیا۔ کیوں کردیا یہ الگ داستان ہے جس کا موجودہ کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیئے یہ کہانی۔ پھر سہی۔ لٹیرے حکمران نے ملک کے ساتھ وہی کچھ کیا جو لٹیرے کرتے ہیں۔ بس ملک کی وہی صورت کردی جو ہم نے بچپن میں اپنی اردو کتاب کی ایک کہانی 'اندھیر نگری چوپٹ راجہ' میں دیکھی تھی۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ انصاف اور عدالتوں کو رسوا کردیا کہ کوئی ادھر رجوع ہی نہ کرسکے۔ اپنے اثاثے غیر ممالک میں بنائے جارہے تھے۔ ملکی اثاثے بنانے کے بجائے اونے پونے بیچے جارہے تھے۔ طوائف الملوکی ہی نہیں طوائفیں بھی عام تھیں۔ ناچنے گانے والوں کی بن آئی تھی۔ ٹاک شوز میں مدعو ہوتے اور بانگ دہل اسلام اور پردے کے خلاف اس طرح تبصرہ کرتے کہ محسوس ہوتا کہ اصل عالم دین تو یہ ہیں۔ اسلام میں پردے کا وہ وہ تصور پیش کرتے جو مولانا اشرف تھانویؒ سے مولانا مودودیؒ تک کے علماء پیش نہ کرسکے۔ ایک اسلامی اسکالر نے قران کے حوالوں سے 'ثابت' کردیا کہ پردہ ضروری نہیں۔ ایک دانشور کے نزدیک شراب نہیں، نشہ حرام ہوا۔ یعنی آپ بلا نوش ہیں اور دو چار پیگ سے نہیں بہکتے تو بسم اللہ۔۔!!

شاہی محل میں رقص و سرود کی محفلیں جمتیں جن میں سربراہ مملکت ہی نہیں ۲۲ اور ۲۴ گریڈ کے افسران بھی رقص کرتے ہوئے 'نہر والے پل پر بلا کر غائب ہوجانے والے' کا گلہ کرتے نظر آتے۔ جب ظلم و ستم کی رات کچھ زیادہ ہی طویل ہونے لگی تو ایسی سیاہ آندھی چلی کہ غاصب کو اپنا وہ مقدس لبادہ اتارنا ہی پڑا جس کی آڑ میں وہ ملک کو کھوکھلا کررہا تھا۔ مقدس لباس کے اترتے ہی اس کی برہنگی ایسی عیاں ہوئی کہ اپنی بساط لپیٹتے ہی بنی۔ لیکن

جاتے جاتے کمال ہوشیاری ، بلکہ کمال عیاری سے ملک کی باگ ڈور حقداروں کے حوالے کرنے کی بجائے ایک ایسا غیر حقیقی قانون (نان ریلسٹک آرڈیننس Non Realistc Ordinance) نافظ کر گیا جس کی رو سے آئندہ حکمران اس کو بنایا جائیگا جو کسی بھی حکومت کے خاتمے کے بعد دوسری صبح مملکت میں سب سے پہلے داخل ہوگا۔اس سے یہ فائدہ مقصود تھا کہ اپنے آپ کو احتساب سے بچایا جائے۔نہ کوئی قابل شخص حکومت تشکیل دے گا نہ غداری کا مقدمہ چلے گا۔غیر حقیقی قانون کے تحت تشکیل دیئے گئے کمیشن نے غاصب حکومت کے گرتے ہی اپنے افسران کی ڈیوٹی دارالخلافہ کے باہر ٹول پلازہ پر لگادی تا کہ سب سے پہلے آنے والے کو سربراہ مقرر کیا جاسکے۔اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ صبح سویرے ایک مداری کا ندھے پر ایک گدڑی ڈالے اپنے ایک عدد ریچھ کے ساتھ آتا نظر آیا۔افسران نے اسے فوراً ساتھ لیا اور کمیشن کے چیرمین کے حوالے کر دیا۔چیرمین نے مداری کو جب بتایا کہ اسے مملکت کا سربراہ چن لیا گیا ہے تو اس نے خوب واویلا کیا کہ میرا حکومت سے کیا کام۔مجھے بخشو۔میں یونہی خوش ہوں۔چوہالنڈورا ہی بھلا۔بڑی مشکل سے اسے راضی کیا تو اس نے ایک شرط رکھدی کہ وہ جب بھی کہے حلوہ پکوایا جائے اور اسے اور اس کے ریچھ کو کھلایا جائے۔شرط مان لی گئی اور مداری نے حلف اٹھانے کے بعد سب سے پہلے حلوہ پکوانے کا حکم دیدیا۔اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو حلوہ پکوانے کا حکم ہوتا اور مداری اور اس کے ریچھ کے علاوہ دوسرے بھی سیر ہوتے۔دن رات حلووں کا دور دورہ رہتا۔سب کے مزے آرہے تھے سوائے عوام کے کہ گڈ (good) کا کیا ذکر کوئی گورننس (governance) ہی نہ تھی۔ملک کا خزانہ خالی ہونا شروع ہوا تو غیر ملکی سود خوروں نے اپنی پسندیدہ شرائط پر تجوریوں کے مونہہ کھول دیے کہ کچھ ہی دنوں میں سود اور اصل دونوں ہی کے ہاتھ آنے کی امید ہو چلی تھی۔اندر بھی ملک دشمنوں کی کمی نہ تھی اس لیئے سازشیں زور پکڑنے لگیں۔افواہیں گردش کرنے لگیں کہ ملک ٹوٹنے والا ہے۔پڑوسی ملکوں کو درپردہ دعوتیں ملنے لگیں کہ موقع ہے۔حالات بگڑتے جارہے تھے لیکن اس گھپ اندھیرے میں ابھی روشنی کی ایک کرن باقی تھی۔یعنی مملکت کے اصل وارث،عوام، جنکا صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جارہا تھا۔پڑوسیوں نے سرحد پر اپنی اپنی فوجیں تعینات کر دیں،موقع ملتے ہی بہتی گنگا میں ہاتھ دھولیں گے لیکن سب کے خواب اس وقت چکنا چور ہو گئے جب عوام نے کسی رہ نما کا انتظار کیئے بغیر از

خود شاہی محل پر حملہ کرنے کے لیئے لانگ مارچ شروع کر دیا۔

مداری سربراہ کو اطلاع ملی کہ عوام نکل پڑے ہیں تو اس نے حلوہ پکوانے کا حکم دیدیا۔خود نے بھی کھایا ریچھ نے بھی اور دیگر افسران نے بھی۔پھر اطلاع آئی کہ عوام شہر میں داخل ہو گئے ہیں تو سن کر پھر حلوے کے لیئے حکم دیدیا گیا۔عوام محل کے قریب پہنچ گئے تو پھر حلوہ پکوایا گیا۔ابھی کھایا جارہا تھا کہ بپھرے ہوئے عوام محل میں داخل ہو گئے۔مداری نے یہ دیکھتے ہی اپنی گدڑی اٹھائی اور ریچھ کی رسی کھینچتے ہوئے عوام سے مخاطب ہوا "بھائیو میرا حکومت سے کیا کام۔ان بدمعاشوں نے مجھے زبردستی یہاں قید کر رکھا ہے۔شکر ہے کہ آپ لوگ آگئے۔اب آپ یہ سب کچھ سنبھالو میں تو چلا۔میں نے اس دوران سوائے حلوہ کھانے کے کچھ نہیں کیا۔اگر آپ لوگوں کو حلوہ پکانے کی توفیق ہو تو میرے اور میرے ریچھ کے لیئے ضرور بھجوا دینا۔اللہ بھلا کرے گا"۔

۱۶/جون ۲۰۰۹ء

نیند ،بتیسی اور لوڈشیڈنگ

ہمارے ایک دوست کو اپنے مقدر سے بڑا شکوہ تھا۔ مفلسی اور بے روزگاری نے اسے قنوطی بنا دیا تھا۔ مگر پھر بھی تھا بزلہ سنج۔ ہم اکثر گھنٹوں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے۔ کبھی ماضی میں چھلانگ لگا دیتے تو کبھی حالاتِ حاضرہ کے بخیئے ادھیڑنے لگ جاتے۔ ایک رات تقریباً بارہ بجے اس کے گھر گئے۔ اس نے دروازہ کھولا تو ہم نے بے تکا سوال کیا' کیا جاگ رہے ہو'۔ ہمیں اندر لے جا کر بٹھانے کے بعد بولا۔' یار جاگنا ہی ہے۔ جب مقدر سو رہے ہوں تو ہمیں تو جاگنا ہی پڑے گا'۔ پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ع

نیند تو ایک ہے ، دونوں کو آئے گی کیسے
ہم بھی سو لیں گے ، اگر اپنے مقدر جاگے

اس کے بعد عادت کے مطابق یہ لطیفہ سنایا کہ سویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد کئی ریاستوں میں لوگ بھوکوں مر رہے تھے۔ ایسے میں ایک دن ایک مخیّر شخص نے ایک مفلوک الحال بوڑھے جوڑے کو کھانے کے لیئے گھر پر بلایا۔ دونوں کافی عمر رسیدہ تھے۔ پھر کئی وقت کے بھوکے ہونے کی وجہ سے کافی نحیف ونزار ہو رہے تھے۔ اس شخص نے دونوں کے آگے دو پلیٹوں میں کھانا رکھ دیا۔ بوڑھے نے جلدی جلدی کھانا شروع کر دیا، لیکن بڑھیا نے پلیٹ کی طرف ہاتھ تک نہیں بڑھایا۔ اس شخص کو گمان گزرا کہ کہیں بوڑھی خاتون کا تعلق اس قوم سے تو نہیں جو شوہر پرستی میں اتنا آگے بڑھ گئی تھی کہ پتنی کو زبردستی پتی کے ساتھ ستی کروا دیتی تھی۔ اس لیئے شائد شوہر کے سیر ہونے کا انتظار کر رہی ہے۔ اس نے کہا۔' ارے کھانا اور بھی ہے آپ بھی شروع کرو'۔ عورت بولی۔' نہیں کھانا تو بہت ہے لیکن ہمارے پاس بتیسی ایک ہی ہے۔ اس لیئے جب یہ فارغ ہونگے تو اسے دھو کر میں استعمال کرونگی'۔

ہم نے اپنے دوست سے کہا' یہ لطیفہ کئی بار کا سنا ہوا ہے لیکن آج نیند والے شعر کے ساتھ اسے ملا کر سننے سے

تمہارے جاگنے کی وجہ بھی سمجھ آ گئی'۔ یہ سن کر دوست بولا' یہ شعر اور لطیفے کو ملا کر پڑھنے پر سابق وزیر ڈاکٹر شیر افگن ماہر ہائین (آئین) کی باتیں یاد آ گئیں۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے' اگر ہائین کی شق نمبر ایکسو باون جا (۱۵۲) کو شق نمبر پینسٹھ۔ ٹو بی (65-2B) کے ساتھ ملا کر پڑھو تو صاف لکھا ہے کہ صدر کو وردی سمیت بھی منتخب کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ہائین سے شق نمبر (6) کو نکال کر پڑھو تو صاف واضع ہو جائے گا کہ پرویز مشرف کو تا حیات بھی صدر بنایا جا سکتا ہے'۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ بجلی داغِ مفارقت دے گئی اور گفتگو کا رخ لوڈ شیڈنگ کی طرف مڑ گیا۔ حسب توفیق بجلی کی شان میں گستاخی کرنے کے بعد لوڈ شیڈنگ کے بارے میں وہ دو بیانات یاد آئے جو دو وزیروں نے حال ہی میں دیئے تھے۔ ڈاکٹر بابر اعوان نے اطلاع دی تھی کہ' لوڈ شیڈنگ '2011' تک ختم نہیں ہو گی'۔ جب کہ لوڈ شیڈنگ کے وزیر کے مطابق دسمبر ۲۰۰۹ کے بعد لوڈ شیڈنگ نہیں ہو گی۔ بظاہر یہ بیانات متضاد لگتے ہیں لیکن ایسا ہے نہیں کیونکہ ایک تو دونوں وزرا ایک ہی پارٹی کے ہیں، دوسرے دونوں نے ابھی تک ایک دوسرے پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ اس سے لگتا ہے پرویز اشرف صحیح کہہ رہے ہیں اور غلط ڈاکٹر بابر اعوان بھی نہیں۔ پرویز اشرف تو بجلی سے متعلق ہیں اس لیئے ان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔ رہ گئے ڈاکٹر بابر اعوان تو ان کا بھی یقین کرنا ہی پڑے گا۔ ماشا اللہ کافی سینئیر ہیں۔ پھر ایک چینل سے ایک ایسا معتبر پروگرام پیش کرتے ہیں کہ دروغ گوئی کی تہمت تو ان پر لگ ہی نہیں سکتی۔

ڈاکٹر شیر افگن اور ڈاکٹر بابر اعوان کے ذکر سے ہم دونوں کو اپنا ایک پرانا دوست یاد آ گیا۔ وہ بھی ڈاکٹر تھا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ جسے ہم دونوں 'پھرا ہوا دماغ' کہتے تھے۔ حالانکہ بے چارا جینوئین (genuine) پی ایچ ڈی تھا۔ لیکن اپنی ساس سے نالاں تھا۔ جب بھی وہ اس کے گھر رہنے آتی تو یہ پریشان ہو جاتا۔ جب تک وہ ڈیرہ ڈالے رہتی یہ پریشان رہتا۔ اس کے جانے کے بعد ہی نارمل ہوتا۔ سسر کے انتقال کے بعد جب وہ کچھ زیادہ ہی سامان کے ساتھ وارد ہوئی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ کہ اللہ خیر کرے! دو چار دن انتظار کے بعد' پھرے ہوئے دماغ' والی حرکت کر بیٹھا۔ اور پوچھا' خالہ اسکے بعد کب آنا ہو گا'۔ ساس، جو بالکل پی ایچ ڈی نہ تھی، بولی۔' بیٹا اب اس کے بعد کیا آنا ہو گا'۔ دوست خوشی خوشی ہم دونوں کے پاس آیا اور یہ خوشخبری سنائی لیکن ہم نے اس کی خوشیوں پر یہ کہہ کر پانی پھیر دیا کہ بیٹا جب وہ جائیں گی ہی نہیں تو آئیں گی کیسے؟ ابھی ہم

دونوں اپنے ڈاکٹر دوست کی باتوں کو یاد کر کر کے محظوظ ہو ہی رہے تھے کہ ہمارے دوست نے یکلخت سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا یار لوڈ شیڈنگ کے بارے میں جن دو وزرا کے بیانات کا ذکر تم نے کیا اگر ہم ان بیانات کو بقول ڈاکٹر شیر افگن، نیند والے شعر، بتیسی والے لطیفے اور پھرے ہوئے دماغ والے دوست کی ساس کی باتوں کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو صاف واضح ہو جائے گا کہ دونوں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ جب لوڈ ہی نہ ہوگا تو شیڈنگ کی کیا ضرورت رہ جائے گی۔ جب بجلی آئے گی نہیں تو جائے گی کیسے؟

۱۸ر جون ۲۰۰۹ء

ہم عصر

انسان کو اپنی تخلیقات سے بہت پیار ہوتا ہے۔ شائد اس ہی لیئے کسی نے کہا ہے کہ آدمی کو اولاد اپنی اور بیوی دوسرے کی اچھی لگتی ہے۔ ہم اس سے ۵۰ فی صد متفق ہیں کیونکہ اولاد تک تو ٹھیک ہے لیکن دوسری بات اخلاق سے گری ہوئی لگتی ہے۔ جہاں تک اپنی تخلیقات سے پیار کی بات ہے وہ ٹھیک ہے لیکن مسئلہ تو تب پیدا ہوتا ہے جب کوئی شاعر، نثر نگار یا مصور یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تخلیق کو نہ صرف سنیں، پڑھیں یا دیکھیں بلکہ تعریف بھی کریں اور دوسروں تک بھی پہنچائیں۔ اب یہ ایک مشکل کام ہے کیونکہ یہ فریضہ اس کے ہم عصر ہی کر سکتے ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ عموماً ہم عصر 'گھر کی مرغی دال برابر' میں یقین رکھتے ہیں۔ اس لیئے ہم جیسے نئے لکھنے والوں کو یہ شکوہ ہی رہتا ہے۔ ویسے اگر غور کریں تو یہ گلہ غالبؔ کو بھی رہا تھا جب ہی تو اپنے ہم عصروں سے ان کی نہیں بنی اور کمالِ ہوشیاری سے اپنے آپ کو نشانہ بناتے ہوئے بین السطور (In between the lines) دوسروں کی کم ظرفی ظاہر کر دی کہ

؎ بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
و گرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

دیکھا جائے تو غالب نے یہ بھی تو مانا کہ 'کہتے ہیں اگلے وقتوں میں کوئی میرؔ بھی تھا' لیکن ذوقؔ سے کھنچے کھنچے ہی رہے۔ ان کے ہم عصروں نے بھی ان کی وہ پزیرائی نہیں کی جو اقبال اور فیضؔ نے کی۔ یہاں ہم واضع کر دیں کہ یہ مضمون غالب پر کوئی معلوماتی مقالعہ نہیں ہے بلکہ ہمارا اپنا دُکھڑا ہے۔ کیونکہ جب ہم نے کچھ لکھنا شروع کیا تو خواہش ہوئی کہ ہمارے لکھے کو پڑھا بھی جائے۔ اس لیئے بذریعے ای میل تمام دوستوں اور رشتہ داروں کو بھیجنا شروع کیا۔ اپنے بیٹا بیٹی اور بھانجے بھتیجوں کے علاوہ خواتین دوستوں نے تعریف کے دو دو بول بھیج کر ہمت افزائی کی لیکن مرد دوستوں پر جنرل منٹگمری کا یہ تاریخی جملہ فٹ آتا ہے 'every thing is calm & quite on the Normandy Coast'۔ ہم نے بھی جب ہار نہیں مانی

اورمضامین بھیجتے رہے تو کچھ کرم فرماؤں نے ہماری میل کھولنا ہی چھوڑ دی۔لیکن جیسا آپ جانتے ہیں کہ شاعر جب تک اپنا کلام نہ سنادے اسکے پیٹ میں درد ہی رہتا ہے اس ہی طرح جب تک اپنا آرٹیکل ای میل نہیں کر دیتے ہمیں چین نہیں پڑتا۔بات یہیں تک رہتی تو بھی ٹھیک تھا لیکن اب یہ آرزو رہتی ہے کہ تعریف نہ سہی کوئی تبصرہ کوئی تنقید ہی آجائے۔اس لیئے کریدتے رہتے ۔کبھی کبھار کوئی مروت میں لکھ دیتا ہے۔ ''زبردست''یا''بہت خوب''۔لیکن اس سے تشفی نہیں ہوتی تھی۔دل چاہتا اور یقین جانیئے حقیقتاً جی یہ چاہتا ہے کہ کوئی کھل کر تبصرہ کرے،تعریف نہ کرے بلکہ بھرپور تنقید کرے تاکہ کچھ رہنمائی ہو سکے۔

بس کچھ ایسی ہی کیفیت تھی کہ''شائد کچھ رحم آگیا میرے پروردگار کو''۔کیونکہ یکے بعد دیگرے دو چار ایسی ای میل آئیں جن میں لکھا تھا کہ آپ کے مضامین نہ جانے کیسے ہم تک پہنچے۔بہت دلچسپ لگے برائے مہربانی ہمیں اپنی لسٹ میں شامل کرلیجیئے۔ایک دو اصحاب نے تو ایڈریس مانگا اور پھر شرفِ ملاقات بھی بخشا۔ایک دو تو غیر ملکی تھے اس لیئے انہیں بتادیا کہ ملنا ناممکن ہے۔ای میل پر ہی گذارا کیجیئے۔الحمداللہ گذارا ہو رہا ہے۔پھر کسی (ہم عصر نے نہیں) نے مشورہ دیا کہ آرٹیکلز اخبارات کو بھجوائیں لیکن اخبارات بھی ہم عصر نکلے۔خوش قسمتی سے ہم نے دو تین مضامین نوائے وقت کے چیف جناب مجید نظامی کو بھجوادیئے تھے۔دو تین دن بعد انکا مختصر نوٹ ملا جس میں مضامین کی تعریف کرتے ہوئے کراچی کے ریزیڈنٹ اڈیٹر سعید خاور سے رجوع کرنے کے لیئے لکھا تھا جنہیں وہ ہمارے مضامین ارسال کر چکے تھے۔بس اس کے بعد جناب سعید خاور کی مہربانی سے ہمارے مضامین شائع ہونے لگے اور ضائع ہونے سے بچ گئے۔لیکن مجید نظامی صاحب کا تعریفی نوٹ ہمارے لیئے سرمایہ حیات بن گیا۔جس کی موجودگی میں اب ہمیں کسی تعریف کی ضرورت ہی نہ رہی لیکن یہ خواہش ضرور ہے کہ ہمارے دوست ان پر تنقید اور تبصرہ ضرور کریں۔ہم یہاں اس مضمون کے لکھنے کی ضرور وضاحت کریں گے۔ ہوا یہ کہ ایک جمعے کی صبح ہم نے ایک آرٹیکل لکھ کر اپنے دوستوں کو بھجوادیا۔اتفاق سے پیر کے دن اسی موضوع پر ایک مشہور کالم نویس کا کالم چھپا۔جسے ہمارے ایک دوست نے سب کو فارورڈ کر دیا۔ہمیں بڑا دکھ ہوا کہ ہمارے مضمون کا کوئی ذکر تک نہیں۔ہمارے مضمون اور اس کالم کا موضوع تو اتفاق سے ایک تھا لیکن ہمارے خیال میں ہمارا مضمون اس لحاظ سے بہتر تھا کہ اس میں سیاسی

گھماؤ پھراؤ نہیں تھا۔اس لیئے ہم نے اپنے دوست سے بذریعے ای میل استفسار کیا کہ کیا اس نے ہمارا مضمون بھی پڑھا۔اس نے جواباً بتایا کہ وقت نہیں ملا لیکن جیسے ہی وقت ملا وہ ضرور پڑھے گا۔ہمیں بہت دکھ ہوا کہ اس نے ہمارا مضمون کھولا تک نہیں جو دو تین دن پہلے بھجوایا جا چکا تھا۔جبکہ ہماری خواہش تھی کہ ہمارے مضامین بھی انٹرنیٹ پر فارورڈ کیئے جائیں کیونکہ اس وقت تک ہماری رسائی نوائے وقت تک نہیں ہوئی تھی۔افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے دوستوں نے کبھی اس خاتون کی طرح بھی تنقید نہیں کی جو اپنے خاوند کے کمالات کو نہیں مانتی تھی۔ایک دن جب اس کا خاوند گھر آیا تو بیوی نے کہا'سنتے ہو آج ایک شخص کافی دیر تک ہمارے گھر کی چھت پر اڑتا رہا تھا۔ہے نا کمال!'۔شوہر نے جب بتایا کہ دراصل اڑنے والا خود وہی تھا،تو بیوی نے برجستہ کہا ''اچھا۔۔جب ہی اتنا ٹیڑھا ٹیڑھا اڑ رہا تھا''۔۔

۱۹/جون ۲۰۰۹ء

ڈِفینس کا علی ہجویری

ہمارے کچھ مغرب زدہ دانشور جن میں سے چند ایک نے مذہبی لبادہ بھی اوڑھ رکھا ہے، آجکل ایک ایسے ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں جو ہماری قوم کو اسلام سے دور کرنے میں معاون ہوسکتا ہے۔ اور اگر نہیں، تب بھی کم از کم قوم کو تقسیم تو کر سکتا ہے۔ ہماری چند این جی اوز بھی اس ہی ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں۔ ایجنڈا اسرائیلی ہے۔ فنڈز امریکن یہودیوں کا۔ پس پردہ ہدائیت کار امریکن تھنک ٹینک اور عمل پیرا پاکستانی اسلامی دانشور اور اسکالرز۔ ایجنڈا ہے مسلمانوں کو اپنے دینی فرائض سے دور کرنا۔ اس کے لیئے ایسے طریقے اپنائے جا رہے ہیں جن سے بظاہر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیئے مسلمانوں کو ترغیب ہو۔ ایک دو سال سے ہمارے چند زندہ و جاوید مذہبی اسکالر اور نام نہاد دانشوروں (جن میں دو تین ماشااللہ ہم نام بھی ہیں) نے ٹاک شوز میں ایسے شوشے (feelers) چھوڑنے شروع کیئے جو بڑے بے ضرر لگتے ہیں مثلاً 'اسلام واحد مذہب ہے جو حقوق العباد کو زیادہ اہمیت دیتا ہے'۔ اس سے کس کو اختلاف ہوسکتا تھا لیکن گراؤنڈ تیار ہو نے کے بعد پہلے قربانی کی اہمیت جتائی گئی اور پھر آہستہ آہستہ اپنا یہ فلسفہ پیش کر دیا کہ بجائے جانور ذبح کرنے کے وہی رقم غریب غربا۔ مساکین اور زلزلہ زدگان میں تقسیم کر دی جائے تو انسانیت کی بہتر خدمت ہو سکے گی۔ یہ بات کچھ لوگوں کے حلق سے اتر گئی لیکن ان کے اس فلسفے کو مطلوبہ پزیرائی نہیں ملی۔ مخالفت کی وجہ سے اس کے بعد کھل کر اس فلسفے کا پرچار تو بند ہوا لیکن دبے لفظوں اور غیر محسوس طریقوں سے اپنے ہمنوا بنانے کا کام جاری رہا۔ کچھ کچے اور سطحی علم رکھنے والے ذہنوں کو پراگندہ بھی کر لیا لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ ابھی قربانی کے خلاف مغربی ایجنڈا پائے تکمیل کو پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ انٹرنیٹ پر کسی علی ہجویری کی کہانی گردش میں آ گئی۔ جس میں اس دور کے کسی نیک حاجی کو میدان عرفات میں یہ الہام ہوا کہ اس سال صرف علی ہجویری نامی شخص کا حج قبول ہوا ہے۔ نیک بزرگ کی تگ و دو سے معلوم ہوا کہ ہجویر سے کوئی علی نامی شخص

حج کے لیئے آیا ہی نہیں۔ بزرگ کو تشویش ہوئی تو ہجویر پہنچ گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ اس نام کا موچی ہے۔ جس نے حج کے لیئے پیسہ جمع تو کیا تھا لیکن حج پر نہ جا سکا کیونکہ ایک دن اس کی بیوی کو پڑوس میں گوشت بھونے جانے کی خوشبو نے بے چین کر دیا تو وہ فرمائش کر بیٹھی۔ موچی کے پاس پیسے نہ تھے اس لیئے پڑوس میں گوشت مانگنے پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ پڑوسی کئی روز کے فاقے کے بعد مرے ہوئے گدھے کا گوشت پکا رہے تھے۔ علی کو بڑا ملال ہوا اور اس نے اپنے حج کے لیئے جمع شدہ رقم پڑوسی کو دے دی۔ اس طرح اس کو حج کا ثواب، سفر کی صعوبتیں اٹھائے بغیر ہی مل گیا۔ اور فقط اس کا ہی حج قبول ہوا۔ جبکہ تمام دوسرے حاجیوں سمیت، صاحب الہام نیک بزرگ بھی اس سعادت سے محروم رہے۔ یہ کہانی پیش کرنے والے نے یہ نہیں بتایا کہ علی ہجویری کے فاقہ زدہ پڑوسی نے مردار گوشت بھوننے کے لیئے ایسی کونسی ریسپی (Recipe) استعمال کی تھی جس کی خوشبو نے علی کی بیوی کو گوشت کی فرمائش کے لیئے بے چین کر دیا اور علی کو اس کے دروازے پر جانا پڑا۔ ویسے برصغیر میں غریب بستیوں میں پڑوسیوں سے مانگنے تانگنے کا کام عورتوں کے ذمہ ہوتا ہے۔ شائد ہجویر میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کہانی کے بعد اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیئے صاحب تحریر نے اپنے کسی دوست، ڈاکٹر مقبول جعفری کا واقعہ بھی سنایا جن کے پاس رات تین بجے ایک جوڑا اپنی بیٹی کو لے کر آیا۔ ڈاکٹر نے بچی کی حالت دیکھتے ہوئے بچی کو داخل کروانے کے لیئے کہا تو انہوں نے بتایا کہ ان کے دو بچے تھے صبح سے دست و قے سے کچھ دیر پہلے لڑکا فوت ہو گیا۔ بچی کی حالت دیکھتے ہوئے بیٹے کی لاش کو گھر پر چھوڑا اور تالا لگا کر آئے ہیں چار روز سے بھوکے ہیں۔ پیسہ پائی کچھ نہیں ہے اس لیئے جانے دیں، وہ دونوں بچوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیں گے۔ اس کے بعد ڈاکٹر مقبول کے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہ تھا کہ اس صورت میں کراچی والوں کا حج کیسے قبول ہوگا۔ نہ جانے ان کے ذہن میں یہ کیوں نہیں آیا کہ حکومت جو زکواۃ کی مد میں مال بٹورتی ہے وہ کہاں ہے۔ اس کے علاوہ انفرادی طور پر جو زکواۃ دی جاتی ہے وہ کہاں ہیں۔ کہانی سنانے والے نے یہ نہیں بتایا کہ یہ میاں بیوی کراچی کے ایسے کس محلے میں رہتے ہیں جہاں کے پڑوسیوں نے ان کے گھر میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ آخر بچے کی موت پر چیخے تو ہونگے۔ یہ بھی تو نہیں بتایا کہ چار دن کے فاقہ زدہ جوڑے نے لاش کی حفاظت کے لیئے گھر میں تالا ڈالدیا تھا یا وہاں کوئی قیمتی سامان بھی تھا۔ امیروں کی بستیوں کا تو نہیں کہہ سکتے

لیکن غریبوں کی بستی میں یہ کہانی فٹ نہیں ہوتی۔کہانی نویس نے حج پر جانے والوں کی تعداد(105,800) اورخرچ ہونے والی رقم تقریباً۱۹ارب کا تو حساب پیش کردیا۔اور یہ بھی بتادیا کے اس رقم سے غربت بھی مٹائی جاسکتی اورہسپتال بھی قائم کیئے جاسکتے ہیں۔لیکن یہ نہیں بتایا حج سے تین چار مہینے پہلے کتنی زکواۃ جمع ہوتی ہے اورعید پر فطرہ کتنا دیا جاتا ہے۔ان کے پاس اس کی تفصیل بھی نہیں کہ روزانہ مزاروں ہر کتنا لنگر تقسیم ہوتا ہے۔کیا حقیقت میں لوگ بھوکے مرتے ہیں۔کیا ایک شخص بھوکے بچوں کے لیئے مردار پکا سکتا ہے تو کیا کلفٹن کے مزار پر بٹنے والی سینکڑوں دیگوں میں سے دو پلیٹ کھانا نہیں حاصل کرسکتا۔اس کے علاوہ مختلف اداروں کی جانب سے قائم کردہ مفت کھانے کھلانے کے سلسلے کی موجودگی میں کیا کوئی بھوکا مرسکتا ہے۔کیا غربت کی یہ کہانی صرف حج اور بقرعید کے گرد ہی گھومتی ہے۔کیا کبھی کسی نے غور کیا یہ اچانک بچے فروخت کرنے کا سلسلہ کیسے شروع ہوگیا تھا۔اور پھر تین چار واقعات یکے بعد دیگرے کیوں ہوئے تھے۔جن میں حکومت نے جس زوروشور سے مداخلت کی تھی وہ بجائے خود تعجب انگیز تھا۔ان واقعات سے کسی کو پیغام دینا مقصود تھا یا قوم کی برین واشنگ تھی۔غربت ایک حقیقت ہے لیکن اس میں جو فراڈ کا تڑکا لگتا ہے وہ بھی سامنے لانا ضروری ہے۔کیا آپ نے کراچی کے مختلف علاقوں میں ایسے نومولود اور چھوٹے بچے نہیں دیکھے جن کے پورے مونہہ پر سیاہ پینٹ کرکے پیلی مرہم تھوپی ہوئی ہوتی ہے۔پورا چہرہ جلا ہونے کا تصور پیش کیا جاتا ہے بس آنکھیں سلامت ہوتی ہیں ایک بار گی تو ہم بھی دھوکہ کھا گئے تھے۔اور فراڈ نہ پہچان سکے۔ہمارے پاس ایسے فراڈیوں کی بیسیوں سچی کہانیاں ہیں جنکے آگے علی ہجویری اور ڈاکٹر مقبول کی من گھڑت کہانیوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ہم اس کہانی نویس کے اس دوست سے ضرور ملنا چاہیں گے جس نے یہ کہانیاں سن کر دو ڈرافٹ بنوائے تھے ایک حج کے لیئے اور دوسرا ہسپتال کے لیئے۔شکر ہے اسنے حج کا ارادہ نہیں بدلا ورنہ ہم کیا کر لیتے۔ہم اس سے اس لیئے ملنا چاہتے ہیں کہ اسے ڈفینس کی اس دوکان پر لے جاسکیں۔جس پر جانے کے لیئے جب ہم اپنی چھوٹی سی کار سے اترے تو دروازے پر کھڑے دربان نے مونہہ پھیر لیا تھا۔اندر اچھی خاصی بھیڑ تھی۔جوتے،ٹائیوں اور سوٹوں کی خریداری زوروں پر تھی۔قیمتیں سن کر ہمیں احساس ہوا کہ دربان نے مونہہ کیوں موڑ لیا تھا۔ہمیں خبر ہی نہ تھی کہ اٹالین جوتے ۵۰،۰۰۰ سے ۷۰،۰۰۰ تک کے ہوسکتے ہیں۔ٹائیوں کی قیمت پانچ سے اٹھارہ ہزار

اور سوٹ تو اسی ہزار سے لیکر دو لاکھ ساٹھ ہزار تک بڑے آرام سے فروخت ہورہے تھے کہانی نویس کے دوست نے ہسپتال کو ڈرافٹ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''کاش میں علی ہجویری ہوتا''۔ہمیں یقین ہے خیابانِ تنظیم کی وہ دکان دیکھنے کے بعد وہ کہے گا'' کاش میں ڈفنس کا علی ہوتا''۔لیکن کیا وہ کہانی نویس کسی سوٹ خریدنے والے سے یہ کہہ سکے گا''یہ سوٹ مت خریدو،اس کی بجائے حج کا فریضہ ادا کرلو۔۔۔یہ ٹائی نہ لو قربانی کے لیئے ایک بکرا لے لو''بھارت میں حقیقتاً لوگ بھوکے مرجاتے ہیں لیکن وہاں کوئی دانشور یہ مشورہ نہیں دیتا کہ یاترا پر جانے کی بجائے اپنی یہ رقوم ڈونیٹ(Donate) کردو۔

۲۲/جون ۲۰۰۹

حج سرٹیفیکیٹ

ہمارے ایک دوست فرید خان نے ابھی ابھی S.M.S. پر آگاہ کیا ہے کہ انٹرنیشنل مارکیٹ میں ایک لیٹر پٹرول کی قیمت 'Rs.13.71' ہے جو سپر ٹیکس کے ساتھ 'Rs.19.20' بنتی ہے۔لیکن عوامی سرکار نے نئی قیمت مبلغ '62.60' مقرر کی ہے۔اس اطلاع کے بعد جاگنے، جگانے اور اپنا حق حاصل کرنے کی صلاح دیتے ہوئے ہم سے اس پر کچھ لکھنے کی درخواست کی ہے۔موضوع قومی نوعیت کا ہے اور درخواست ایک کرمفرما کی ہے مگر اپنا یہ حال ہے کہ۔ع

جب سے جانا ہے کہ ہیں نا اہل بادہ بکف
اب مجھے جام اٹھانے سے حیا آتی ہے

اس ضمن میں ہم نے ایک مضمون ''ہم عصر'' لکھا تھا اور ای میل کرتے ہوئے یہ مژدہ جانفزا بھی بھجوادیا تھا کہ شائد یہ آخری مضمون ہے جو ہم ای میل کررہے ہیں۔اس کے جواب میں ۵۰ میں سے صرف دو دوستوں نے بذریعے واپسی میل بتایا کہ وہ ہمارے مضمون پڑھتے ہی نہیں فارورڈ بھی کرتے ہیں اور یہ تاکید بھی کی کہ انہیں محروم نہ کیا جائے۔ پندرہ بیس دن بعد اتفاقاً ایک ایسا ایشو جس میں اسلام خطرے میں نظر آرہا تھا، ہاتھ آیا اس لیئے ''ڈفینس کا علی ہجویری'' لکھنا پڑا۔موضوع اتنا اہم تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی تمام دوستوں کو ای میل کردیا۔لیکن اس کا حشر بھی پچھلے مضامین جیسا ہی ہوا جس خطرے کے پیش نظر یہ مضمون لکھا تھا وہ کل عود کر بلکہ کود کر اس خبر کی صورت میں سامنے آیا کہ مسلم تاجکستان کے صدر نے اپنی قوم سے درخواست کی ہے کہ حج پر جانے کی بجائے اپنی رقم فلاحی کاموں پر خرچ کریں۔تاجکستان سے ہر سال پانچ ہزار لوگ حج پر جاتے ہیں اس سے ایک خطیر رقم کی بچت ہوسکے گی۔کہاوت ہے کہ باپ کے مرنے کا غم نہیں لیکن غم یہ ہے موت نے گھر دیکھ لیا ہے۔اس لیئے ہماری تشویش میں اضافہ ہوگیا ہے کہ ہمارے یہاں سے تو پانچ ہزار نہیں

ایک لاکھ پانچ ہزار سے بھی زیادہ جاتے ہیں۔اگر ہمارے بینکار (اس میں 'ن' نہ پڑھی جائے تو بھی چلے گا) مشیرِ خزانہ کی سمجھ میں تاجکستان کی مثال آگئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے کہ یہاں معاملہ پندرہ سے بیس ارب کا بنتا ہے۔اور مشورہ دینے میں اپنی جیب سے بھی کچھ نہیں لگتا۔اور پھر یہ تو ہماری بدقسمتی ہے ہی کہ ہمارے خزانے کی چابی زیادہ تر بینکاروں کے پاس رہتی ہے جن کا تجربہ صرف قرض لینے یا دینے تک کا ہی ہوتا ہے یا یہ کہہ لیجئے کہ ڈیبٹ کریڈٹ تک ہی محدود ہوتا ہے۔اس لیئے کچھ بعید نہیں کہ نام نہاد اسلامی اسکولروں کے مشوروں سے حج فیس مبلغ ڈیڑھ لاکھ کے عیوض عازمین حج کو صدر کی جانب سے ایک سرٹیفکیٹ دیدیا جائے جس کی رو سے درخواست گزار آئندہ سے حج کی صعوبتیں اٹھائے بنا ''حاجی'' کہلائیگا۔نیز تمام اینلائٹنڈ اسلام کے حامی دانشور اور اسکالرز دعاگو رہیں گے کہ تمام عازمین کا حج مقبول ہو۔ایسے تمام حاجیوں کو دنیا بھر میں مقبول کرنے کے لیئے سرکار اپنے وزرا کو مختلف ممالک کے دوروں پر اس ہدایت کے ساتھ بھیجے گی کہ وہ اپنے اپنے حلقوں کے سرٹیفکیٹ بردار حاجیوں کا تذکرہ کرنے کا خصوصی اہتمام کریں۔اس تمام عمل سے بجٹ پیش کرتے ہوئے وزیرِ مملکت بھی پُر اعتماد نظر آئیں گی اور بغیر لکنت کے کہہ سکیں گی کہ حج درخواستوں کی مد میں بیس ارب آئے۔حاجیوں کو سرٹیفکیٹ جاری کرنے اور انہیں دنیا میں مقبول کروانے کے لیئے بھیجے جانے والے وفود پر خرچ ہوگا اٹھارہ ارب۔اس طرح صرف حج اسکیم سے دو ارب کی بچت متوقع ہے۔ جو آئندہ سال قربانی اسکیم متعارف کرانے کے علاوہ ایسے مناظروں اور مذاکروں پر خرچ کی جائے گی جس میں عوام کو بتایا جائے گا کہ سرٹیفکیٹ کے ذریعے حاجی کہلانے والے سفری صعوبتوں سے محفوظ رہیں گے۔اور قربانی کی وجہ سے جو صفائی کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے اس سے بھی بچا جاسکے گا۔اس سلسلے میں ہجویر کے موچی (جس کا حج گھر بیٹھے قبول ہوا تھا) پر ٹاک شوز بھی کیئے جائیں گے۔بینکار مشیر یا وزیر خزانہ کا یہ فائدہ ہے کہ پونڈ فولش، پینی وائز (Pound foolish, penny wise) ہوتے ہیں۔اس لیئے کسی بڑی اسکیم بنانے کی بجائے موجود تلوں میں سے ہی تیل نکالتے ہیں۔مثلاً اگر ایک کروڑ لوگ ٹیکس دیتے ہیں تو نئے ٹیکس گذاروں کو تلاش کرنے سے بہتر ہے ان پر ٹیکس دگنا کردو۔اس طرح ایک ارب آمدنی دو ارب ہوجاتی ہے۔یہ ہی فارمولا بجلی اور گیس کے لیئے ہے۔اب کوئی بڑی تبدیلی کرنا چاہے تو اس کے لیئے

محنت ہی نہیں دماغ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ہمیں یاد ہے پاکستان بننے کے بعد جو ریلوے کا ٹائم ٹیبل تھا وہ گرمیوں اور سردیوں میں پانچ پانچ منٹ اوپر نیچے کر کے چھاپ دیا جاتا تھا۔ایک عرصے بعد کسی نے اس میں خاطر خواہ تبدیلی کی کوشش کی تو ٹرینوں نے احتجاجاً ٹکرانا شروع کر دیا۔اس لیئے طے پایا کہ ٹائم ٹیبل وہ ہی رکھا جائے ہاں ٹرینوں کے ناموں میں ردوبدل کر کے عوام کو بیوقوف بنایا جائے۔ان مثالوں کے بعد ہم فرید صاحب سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیٹرول میں ۴۰ روپے کی تخفیف کرنے سے پورا بجٹ الٹ پلٹ ہو جائے گا۔اور اس کو ایڈجسٹ کرنے کے لیئے جینوئین ماہر معاشیات کی ضرورت ہوگی یہ کام کسی بینکار یا آڈیٹر کے بس کا نہیں۔اس ہی طرح جاگنے، جگانے اور اپنا حق لینے کے لیئے شعور کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمارے عوام ایک ہی سوراخ سے کئی بار ڈسے جانے کے بعد بھی اس ہی سوراخ سے بار بار ڈسے جانے کے قائل ہیں۔آج بھی ہماری ملاقات ایسے پڑھے لکھے جاہلوں سے ہوتی ہے جو کہتے ہیں پرویز مشرف ہی ان معاملات کو ٹھیک کر سکتا ہے۔آج بھی ہمارے عوام روٹی کپڑے کے فریب میں مبتلا ہیں۔کیا کوئی ہمیں ایک فقط ایک ایسا قومی ایشو بتا سکتا ہے جس پر پوری قوم متفق ہو۔

۲/جولائی ۲۰۰۹ء

بامروت کمپیرنگ

کمپیرنگ کوئی آسان کام نہیں۔کمپیر حضرات کے سامنے اچھے اچھوں کا سانس اکھڑنے لگتا ہے لیکن نہ جانے کیوں کمپیر حضرات کچھ زیادہ ہی بامروت ہو گئے ہیں۔اس مروت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اکثر مہمان، خاص طور پر حکومتی نمائندے جھوٹ کا وہ طومار باندھتے ہیں کہ عام ناظر جھوٹ اور سچ میں تمیز ہی نہیں کر پاتا۔اس پر بامروت میزبان کی پہلوتہی بھی مخمصے میں ڈالنے میں کافی اعانت کرتی ہے۔ماضیء بعید میں چینلز تو تھے نہیں اس لیئے عوام اتنے باخبر نہ تھے جتنے آج ہیں۔ماضیء قریب یعنی پچھلی دہائی میں یکلخت ٹی چینلوں کی بھرمار نے وہ وہ گل کھلائے کہ الامان والحفیظ۔پرویز مشرف کے وزیروں نے تو دروغ گوئی میں گویا کمال ہی کر دیا تھا۔مناظرے یا مذاکرے تو کیا ہوتا تھے، بس جھوٹ اور سچ کے مقابلے ہی ہوتے جن میں حکومتی ارکان کے جھوٹ کے آگے حق گوئی کے چراغوں کو بجھتے ہم نے خود دیکھے ہیں۔دروغ گوئی میں یکتا، ایسے ایسے وزرا سے واسطہ پڑا کہ حالات حاضرہ پر مکمل عبور رکھنے والے حضرات کو بھی اپنے علم اور واقفیت پر شک ہونے لگا۔حکومتی ارکان میں نامی گرامی ایک ایسے وزیر بھی تھے کہ جن کی دروغ گوئی کو خراج پیش کرنے کے لیئے جناب اعتزاز احسن نے انہیں 'ایم اے غلط بیانی' کے خطاب سے نوازا۔ایک اور عظیم المرتبت وزیر تھے طارق عظیم جنہوں نے اپنے اندازِ گفتگو سے کمپیر حضرات کے دل موہ لیئے اور سب ان کی شیریں بیانی میں اس طرح کھو جاتے کہ خیال ہی نہیں رہتا کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔ان دو حضرات کے برعکس ایسے بھی وزیر تھے جنہیں کرخت لہجے اور جارحانہ انداز سے اپنی بات منوانے کا فن آتا تھا۔اس میں پیش پیش تو وصی ظفر تھے لیکن شیر افگن بھی پیچھے نہ تھے جنہیں دو اور دو پانچ کرنے کا سلیقہ بھی آتا تھا۔اس کے لیئے وہ آئین کی کوئی بھی دو شقوں کا حوالہ دے کر کہہ دیتے کہ ان دونوں کو ملا کر پڑھو تو مطلب ان کے حسبِ منشا ہی آئے گا۔اب جہاں ایک شق یعنی شق نمبر ۶ ہی پڑنے کے لالے ہوں تو وہاں فلاں شق کو فلاں شق کے ساتھ

ملانے کی فرصت کہاں؟ چونکہ ان وزرا کی باگ دوڑ ایک غاصب کے ہاتھ میں تھی اس لیئے ان کے ساتھ تمام محبّ وطنوں کا رویہ بالکل ان کلینوں کا سا تھا جن کے مکان پر ڈاکوؤں نے قبضہ کر کے انہیں یرغمال بنا رکھا ہو اور وہ اس خوف سے مزاحمت کرنے سے گریزاں ہوں کہ لڑائی بھڑائی کی صورت میں کہیں کسی گھر والے کو کوئی گولی نہ لگ جائے، کوئی گزند نہ پہنچ جائے، کہیں املاک کا نقصان نہ ہو جائے۔ جبکہ ڈاکوؤں کو ایسا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ بس اس ہی خوف میں کہ سب سے پہلے پاکستان کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے تقریباً نو دس سال گذار دیئے۔ اور پھر غاصب سے جان چھوٹی بھی تو اسکی پالیسیاں کمبل ہو گئیں۔ سنا ہے کہ آج کی پالیسیاں بھی اس ہی کا تسلسل ہیں۔ پریز مشرف تو گیا لیکن پالیسیاں ہی نہیں عادات واطوار بھی چھوڑ گیا۔ جو حکومتی ارکان میں سرائیت کر گئی ہیں۔ اگر کوئی ریسرچ کرنا چاہے تو بتا سکتا ہے کس نے کس کی جگہ لے لی ہے۔ اگر پچھلے دور میں ملائم لہجے والے طارق عظیم تھے تو آج ان سے زیادہ نرم خو وزیر خارجہ ہیں۔ اس ایک مثال پر اکتفا کرتے ہوئے ہم یہ کام کسی رسرچر پر چھوڑتے ہیں جو بتا سکے گا کہ کس نے کس کو ری پلیس (Replace) کیا ہے۔ یقین جانیئے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ بس دو چار ٹاک شو دیکھیئے۔ دو تین بیانات سنیئے۔ دو تین تبصرے ملاحظہ کیجئے۔ ایک دو یوٹرنز (U-Turns) سے محظوظ ہونے کی کوشش کیجئے۔ انشااللہ محسوس ہی نہ ہوگا کہ ہم دورِ پرویزی سے نکل آئے ہیں۔ ہاں چہرے ضرور بدلے ہوئے لگیں گے۔ نہ صدارت میں فرق نہ وزارت میں۔ چند خواتین نے درانی، وصی اور شیرافگن کی جگہ اس طرح پُر کی ہے کہ ہمیں تو رشک ہی آتا ہے۔

بات شروع ہوئی تھی کمپیر حضرات کی مروت کی۔ جو پرویز دور میں تو مصلحت کے تحت مروت کرتے ہی تھے، لیکن نہ جانے اب کیا مجبوری ہے کہ بے چارے آج کے جمہوری دور میں بھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ 'کھا رہا ہے ظالم جھوٹی قسم' پھر بھی اعتبار کرنے کا تاثر دینے لگتے ہیں۔ اور اس کا مظاہرہ ہم نے خود دیکھا ہے پہلے پہل تو چیف جسٹس کی بحالی کے مطالبے کے وقت، جب وزرا نے کھلم کھلا مخالفت کرتے ہوئے جھوٹ کے انبار لگا دیئے کہ ان کی لیڈر نے کبھی اس کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ حد تو تب ہوئی جب وڈیو کلپ کی موجودگی میں مزید جھوٹ سامنے آئے اور بجائے وزرا کے اینکر پرسن بے بس نظر آئے۔ لطف تو یہ ہوا جب کہا گیا کہ ہم چارٹر آف ڈیموکریسی پر عمل تو کرنا چاہتے ہیں لیکن کچھ تکنکی باتیں آڑے آ رہی ہیں اس لیئے ایک آرڈر سے بحالی

ممکن نہیں۔ لیکن پھر بحالی بعد از خرابیء بسیار ایک آرڈر سے ہی ہوئی۔ لیکن کسی کمپیر نے بے مروتی کا سہارا لیکر شیخ رشید تک کو شرمندہ نہیں کیا جو کہتے تھے 'افتخار چودھری ایک گھنٹے کے لیئے بھی بحال نہ ہوگا'۔ یہ بھی سنتے رہے کہ بحالی نہیں ہو سکتی کیونکہ اب چیف کنٹرورشل ہو گئے ہیں۔ بوجہ مروت کسی نے نہیں پوچھا کہ بھئی یہ اچانک بحالی کیسے ہو گئی۔ ہاں وزرا نے خود ہی وضاحت کر دی کہ ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ آجکل پھر یہ مسئلہ درپیش ہے یعنی چارٹر آف ڈموکریسی کے تحت ستر ہویں ترمیم کا خاتمہ۔ لیکن سوال اٹھائے جا رہے ہیں کہ اس سے بیلنس آف پاور خراب ہو جائے گا اس لیئے کوئی درمیانی حل نکالنا ہوگا۔ وزرا دور کی کوڑی لا رہے ہیں کہ جمہوریت کی کشتیاں اس ہی وجہ سے ڈوبتی رہیں کہ کبھی وزیراعظم تو کبھی صدر مطلق العنان ہوتے تھے۔ جب انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ .C.O.D پر دستخط تو سب نے کیئے تھے پھر اب اس پر عمل کرنے میں کیا قباحت ہے تو پھر وہی رٹ کہ ہم کرنا تو چاہتے ہیں لیکن۔۔۔۔ اس ہی طرح مروت کا مظاہرہ اس وقت دیکھنے میں آتا ہے جب ٹاک شوز میں سیاستدان ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں کہ آپ لوگ تو ڈکٹیٹر کی گود میں پلے بڑے ہیں۔ اور ستم یہ کہ ساری ڈکٹیٹر شپ ضیاالحق پر ہی دم توڑ دیتی ہے یہ سن کر بھی کوئی اینکر پرسن یہ یاد نہیں دلاتا کہ بھئی اس سے پہلے ایوب نامی ڈکٹیٹر بھی گذرا ہے جس کے بطن سے بھی کچھ سیاستدان جنم لے چکے ہیں اور وہی تو ہے جس نے سیاست کو بانجھ کر دیا تھا اس ہی لیئے تو سیاستدانوں نے ڈکٹیٹروں کے گھر پیدا ہونا شروع کر دیا تھا۔ اینکر پرسن یا کمپیر حضرات اس وقت بھی خاموش رہتے ہیں جب کوئی مشرف کے احتساب کی بات کرتا ہے اور جواب ہوتا ہے کہ اگر احتساب ہی کرنا ہے تو پہلے ضیاء کا ہونا چاہیئے۔ نہ جانے کیوں یحییٰ اور ایوب کو استثناء مل جاتا ہے۔ حالانکہ ایوب نے پاکستان کو نہ صرف جمہوریت کی پٹڑی سے اتارا تھا بلکہ مادر ملت کی توہین کا بھی مرتکب ہوا تھا۔ اور کم از کم اس جرم میں ہی اسے اور اسکے ان تمام ساتھیوں کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیئے، جنہوں نے دھاندلی سے مادر ملت کو ہرانے میں کوئی کردار ادا کیا تھا۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ اسّی پرسنٹ سے زیادہ مادر ملت کے حامی بی ڈی ممبرز کی موجودگی میں ایوب کیسے جیت سکتا تھا۔

۶/جولائی ۲۰۰۹

نادرہ

نادرہ سے ہماری واقفیت ۱۹۵۰ کی دہائی سے ہے جب ڈائریکٹر محبوب کی فلم ''آن'' پاکستان کے سینماؤں میں ریلیز ہوئی تھی۔ ریلیز کے وقت کم عمری کے باعث فلم دیکھنے کی اجازت نہ تھی اس لیئے کافی عرصے بعد۔۔۔تقریباً چھ سات سال بعد فلم دیکھنے کا موقع ملا۔اس وقت تک اسکول میں ڈراموں میں حصہ لینے کے علاوہ کورس میں شامل شیکسپیر کے ڈراموں کے پڑھنے اور ان پر تنقیدی مضامین لکھنے کی وجہ سے کافی سوجھ بوجھ پیدا ہو چلی تھی۔اس لیئے فلم وغیرہ ہمیشہ تنقیدی نظروں سے ہی دیکھتے رہے۔آن میں فلم اسٹار نادرہ کو دیکھنے کے بعد ہمارا یہ ہی خیال تھا کہ ڈائریکٹر نے نادرہ کو ذہن میں رکھ کر فلم کا اسکرپٹ لکھوایا ہوگا۔ہمارا خیال اتنا غلط بھی نہ تھا کیونکہ آن کے علاوہ نادرہ کی کوئی فلم کامیاب نہ ہوسکی۔آن میں ایک مغرور رانی کے کردار میں واقعی خوب جچی ورنہ شکل صورت میں ہیروئین والی کوئی بات نہ تھی۔اداکاری بھی غرور اور تکبر میں چھپ کر رہ گئی تھی۔اگر اس کا کردار غرور کا آئینہ دار نہ ہوتا تو شائد فلم صرف نادرہ ہی کی وجہ سے باکس آفس پر ناکام ہوجاتی۔یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اگر فلمسٹار نرگس یہ رول کرنے سے انکار نہ کرتی تو نہ نادرہ کو یہ کردار ملتا اور نہ ہماری اس سے واقفیت ہوتی۔دوسری بار 'نادرہ' سے اس وقت پالا پڑا جب حکمرانوں نے ایک ایسے ادارے کی داغ بیل ڈالی جس کے نام کا مخفف نادرہ (N.A.D.R.A) ٹہرا۔محکمے کا نام نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی ہے۔جس کا مخفف کسی طرح بھی نادرہ نہیں بنتا۔انگریزی میں بھی 'National Data-base And Registration Authority' کا مخفف مروجہ اصولوں کے تحت 'N. D. A. R. A' یا 'ندارا' ہونا چاہیئے تھا لیکن ارباب اختیار نے شائد رنگین مزاج غاصب کی خوشنودی کی خاطر کھینچ تان کر اسے نسوانیت سے ہمکنار کر دیا۔حالانکہ نسوانیت تو فلم اسٹار نادرہ میں بھی صرف نام کی ہی مرہونِ منت تھی۔

کہتے ہیں ناموں کا اثر چال چلن پر بھی پڑتا ہے شائد یہ ہی وجہ ہے کہ اس محکمے کی سوچ میں بھی کافی زنانہ پن

غالب ہے۔ورنہ جس ملک کے وسائل محدود ہوں وہاں اسراف کا کیا کام۔ہمارے ملک میں ابھی تمام آبادی کے شناختی کارڈ بن نہ پائے تھے کہ نادرہ کا ظہور ہوگیا جس نے یکلخت نئے سرے سے کارڈز بنانے کا کام شروع کر دیا۔ہم نے بھی پہلی فرصت میں پوری فیملی کے کارڈز یہ سوچ کر بنوا لیئے کہ یہ الیکٹرانک کارڈز ہیں بس عمر بھر کی فرصت ہو جائے گی لیکن پہلا جھٹکا اس وقت لگا جب پاسپورٹ بھی الیکٹرانک درکار ہوئے اور ہم بیگم کے ساتھ نئے پاسپورٹ کے حصول کے لیئے پاسپورٹ آفس پہنچ گئے وہاں معلوم ہوا کہ صرف بیگم کا الیکٹرانک شناختی کارڈ ایکسپائر ہو چکا ہے۔یہ ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ شناختی کارڈ بھی ایکسپائر ہوسکتے ہیں۔اپنے اور بیوی کے کارڈز کا بغور مطالعہ کیا تو حیرت ہوئی۔۔ واقعی اجرا کی تاریخ ایک ہونے کے باوجود دونوں کی ایکسپائری کی تاریخوں میں فرق تھا۔خدا جانے کونسے فارمولے کے تحت ایسا کیا گیا تھا۔ہمارے لیئے تو یہ ہی عجیب تھا کہ ''شناخت'' بھی ایکسپائر ہوسکتی ہے۔ہمارا خیال ہے کہ شناخت تو مرنے کے بعد بھی ایکسپائر نہیں ہوتی۔(یہاں ہماری مراد جسمانی نہیں، بلکہ ولدیت، سرنیم، تاریخ و جائے پیدائش وغیرہ سے ہے)۔دوئم یہ بات بھی تعجب خیز تھی کہ جس ملک میں لوگ پہلی بار ہی کارڈ بنوانے سے گریزاں ہیں وہاں ان سے یہ امید کیسے رکھی گئی کہ وہ ایکسپائری پر بھی توجہ دیں گے۔ہاں کسی مجبوری کے تحت اور بات ہے۔ہمارا خیال ہے یہ سب اس زنانہ نام کا ہی اثر ہے کہ محکمے نے کمائی کا یہ گھماؤ پھراؤ کا طریقہ اپنایا ہے۔کمائی کے لیئے اس سے تو یہ بہتر ہوتا کہ کارڈ رینیو (Renew) کرانے کے لیئے ہر سال کارڈ پر ڈاکخانے سے ٹکٹ لگوانے کا اہتمام کر دیا جاتا۔نادرہ نے یہ نہیں سوچا کہ اٹھارہ کروڑ کے کارڈ بنتے بنتے آبادی میں قابل قدر اضافہ ہوجائے گا۔اس لیئے حاملِ کارڈ کو دوبارہ زحمت دینے سے فائدہ !! لیکن ٹہریئے ہوسکتا ہے نادرہ کو یہ فکر دامن گیر ہو کہ حکومت کہیں افزائش نسل پر پابندی نہ لگا دے یا بچوں کی پیدائش پر کوئی ٹیکس لگا کر گروتھ ریٹ نہ کم کر دے۔ ہوسکتا ہے اسے یہ خوف ہو کہ اس صورت میں اسکے (نادرہ کے) محکمے کے مستقبل کا کیا ہوگا۔اس ہی لیئے یہ ایکسپائری سسٹم بنا دیا گیا کہ ہر دو چار سال بعد ہر شخص دوبارہ نادرہ سے رجوع کرتا رہے گا۔نیا گاہک نہیں تو پرانا ہی سہی۔

نادرہ کے اس انداز فکر میں تو ہمیں اس خاتون کی سوچ کا پرتو نظر آرہا ہے جس نے اپنے شوہر کے پیر دباتے

ہوئے ٹسوے بہانے شروع کر دیئے تھے۔شوہر کے استفسار پر بڑی مشکل سے گویا ہوئی 'سرتاج مجھے تو یہ سوچ کر رونا آ گیا کہ آپ کے بعد میرا کیا ہوگا'۔سادہ لوح شوہر کا دل پسیج گیا کہ کتنی وفا شعار اور محبت کرنے والی بیوی ملی ہے۔بیچارے کو ایکبار بھی یہ خیال نہیں آیا کہ بیگم یہ طے کیئے بیٹھی ہے کہ جانا پہلے خاوند ہی کو ہے۔ارباب اختیار نے بھی شائد نادرہ کے بہتر مستقبل کے لیے یہ اہتمام کیا ہے کہ ایکسپائری کی صورت میں نادرہ کے لیئے ایک مستقل آمدنی کا بندوبست ہو جائے اور گلشن کا کروبار چلتا رہے۔

۲۱/جولائی ۲۰۰۹ء

آپ یقین کریں۔۔۔یا نہ کریں

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بھارت ایک بے اصولی ملک ہے۔ثبوت میں سینکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن ہم صرف ایک تازہ مثال پر اکتفا کریں گے، جو ہمیں ۲۲ جولائی ۲۰۰۹ کے اخبار سے ملی ہے۔خبر ہے کہ بھارت کے سابق صدر اور ایٹمی سائنسداں عبدالکلام کو دہلی ائیر پورٹ پر اس وقت ذہنی و جسمانی اذیت سے دوچار ہونا پڑا جب ایک نجی فضائی کمپنی نے سابق صدر کو وی۔وی ۔آئی۔پی کا پروٹوکول دینے سے انکار کرتے ہوئے ان کی جامع تلاشی لینے کے بہانے جوتے اتروا لیئے۔اب یہ معاملہ پارلمنٹ میں اٹھایا جائے گا۔اصولاً تو سابق صدر کو پورا پورا پروٹوکول ملنا چاہیئے تھا کیونکہ اس کے پڑوسی ملک میں یہ ہی رائج ہے کہ سابق صدر کو ہر قسم کی مراعات دی جاتی ہیں حتیٰ کہ وہ چاہے تو دورانِ صدارت ملے ہوئے تحائف بھی بیت المال میں جمع کرانے کے بجائے بغیر کرایہ دیئے اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے۔لے جاسکتا کیا وہ لے بھی گیا۔آخر ملک کا صدر تھا۔کوئی مذاق نہیں تھا!۔کیا ہوا اگر بونا فائڈ (Bonafide) نہ تھا۔مراعات تو صدور کا حق ہوتی ہیں ۔اس ہی لیئے ایک رعایت تو یہ ملی کہ اسے آئین توڑنے کے جرم پر عدالت میں نہیں گھسیٹا گیا۔سوچنے کی بات ہے اگر صدر کو بھی عوام کی طرح ٹریٹ کیا جائے تو صدر بننے کے لیئے کون راضی ہوگا۔

ہم نے بھارت کو بے اصولا اس لیئے کہا کہ اس نے صرف عبدالکلام کے ہی معاملے میں دو بار اصولوں کی خلاف ورزی کی۔پہلی بے اصولی تو یہ تھی کہ اس نے اپنے ایٹمی سائنسدان کو صدر بنوا دیا جبکہ اسے نظر بند ہونا چاہیئے تھا کہ اس کے پڑوسی ملک میں یہ ہی نظیر ملتی ہے۔دوسری بے اصولی جو اس سلسلے میں ہوئی ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔بھارت کا المیہ یہ ہے کہ اسے اچھے پڑوسیوں کی طرح رہنا نہیں آتا۔ورنہ اپنے پڑوسی ملک سے سیکھنے کے کئی مواقع ضائع نہیں کرتا۔آج اسے سابق صدر کے جوتے اتروانے کے سلسلے میں جس جگ ہنسائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، یہ اس کی اپنی حماقت کا نتیجہ ہے اگر وہ ہماری طرح اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے اپنے ایٹمی سائنسدان کو صدر بنوانے کی بجائے نظر بند کر دیتا تو کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہیں ملتا اور صدارت کی کرسی کسی دوسرے حقدار کو مل جاتی۔بھارت نے کبھی غور نہیں کیا اور ہمارے حکمرانوں سے سیکھنے کی کوشش نہیں کی

جب کہ ہمارے حکمرانوں نے تو بدنامِ زمانہ چانکیہ تک سے نہ صرف حکومت کرنے کے طریقے سیکھے بلکہ اس کے دیئے ہوئے اصولوں پر سختی سے کاربند بھی رہے۔ جبکہ چانکیائی اصولوں سے فائدہ اٹھانا تو بھارتی حکمرانوں کا حق تھا لیکن انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ چانکیائی اصول ہے کہ سب سے پہلے اپنے پر احسان کرنے والے، اور اپنے دستِ راست کو کھڈے لائن لگا دو۔ مثال کے طور پر جنرل ایوب خان نے اپنے دست راست جنرل اعظم کے علاوہ دیگر جنرلوں کو بڑی صفائی سے سفیر، مشیر یا گورنر بنا کر مین اسٹریم (Main Stream) سے دور رکھنے کی روایت ڈالدی جس کو آنے والے غاصبوں نے خوب نبھایا اور جنرل ضیاء نے اپنے ساتھی جنرلوں، جنرل چشتی وغیرہ اور پرویز مشرف نے اپنے ان جنرلوں کو جنہوں نے جہاز اغوا کا ڈرامہ رچایا تھا، دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ مشرف تو کچھ اور آگے بڑھ گیا اور محسن پاکستان کو بھی کچھ اس طرح رسوا کر گیا کہ اسکے جانے کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب اب تک اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کر پائے۔ سمجھ سے بالا ہے کہ موجودہ حکومت کی کیا مجبوری ہے ڈاکٹر صاحب کو انکا کھویا ہوا مقام نہیں دلا پا رہی۔ کھوئے ہوئے مقام کی بات تو ہم دنیاوی دکھاوے کے لیئے کہہ رہے ہیں ورنہ ڈاکٹر صاحب کی جو عزت قوم کے دل میں ہے وہ شائد قائداعظمؒ کے بعد صرف ڈاکٹر صاحب کے حصے میں ہی آئی ہے۔ بات شروع ہوئی تھی عبدالکلام کے جوتے اتروانے سے، لیکن ہم کچھ جذباتی ہو کر بہک گئے ورنہ یہ مضمون لکھنے کا مقصد تو بھارتیوں کو صرف یہ بتانا تھا کہ وہ خواہمخواہ اس معاملے کو پالیمنٹ میں لے جا رہے ہیں یہ تو اپنے گندے کپڑے چوراہے پر دھونے کے مترادف، اور اپنی روائیتی ہٹ دھرمی سے انحراف کے مصداق ہوگا۔ کیونکہ بھارتیوں کی ہٹ دھرمی تو اس 'پدی' کی طرح ہے جس کی ٹانگیں، اس کے لڑھکنے کی صورت میں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور وہ سیدھا نہیں ہو پاتا تو کہتا ہے 'کیا ہوا جو میں گر گیا لیکن میں نے آسمان کو تو گرنے سے روکا ہوا ہے'۔ بس بھارتی حکمرانوں کو چاہیئے کہ کہدیں کہ ڈاکٹر عبدالکلام کے جوتے تو فضائی کمپنی کے عملے نے جوشِ عقیدت میں اتروائے تھے کہ شائد اس بہانے انکے جوتے سیدھے کرنے اور چرن چھونے کا موقع مل جائے۔

۲۲/جولائی ۲۰۰۹ء

بے شرمی، تیرا ہی آسرا

مرزا غالب کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں کہ انہیں ساغر و مینا سے بڑی رغبت تھی اس لیئے قرض کی پینے میں بھی عار نہ تھا۔ ع

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اس کے باوجود نہ ان میں خود داری کی کمی تھی نہ ضمیر ہی مردہ ہوا تھا۔ اپنے اعمال پر شرمندہ رہتے تھے۔ بداعمالیوں پر فخر نہیں کرتے تھے۔ اس ہی لیئے تو کہا تھا۔ ع

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہ تو اعلیٰ ظرف لوگوں کی باتیں ہیں ورنہ ایسوں کی کب کمی ہے جو بانگِ دہل جرم کرتے ہیں اور شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ انکا تو نعرہ ہی یہ ہے کہ 'بے شرمی تیرا ہی آسرا'۔ کچھ لوگوں کا خیال ہوسکتا ہے کہ ایسے لوگوں کو سترہ اٹھارہ کروڑ عوام کی غریب آبادی میں ڈھونڈا جاسکتا ہے کیونکہ بھوک سے بلکتے ہوئے، غربت کے مارے لوگوں کی مجبوری میں کیسی شرم اور کہاں کی خودداری؟ بقول ساحرؔ لدھیانوی۔ 'بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی' لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خود داری اور حیا غریبوں میں ہی ملتی ہے جو انہیں خودکشی پر مجبور کر دیتی ہے۔ حالانکہ خودداری کی توقع تو پیٹ بھروں سے ہونی چاہیئے لیکن اب تو مقتدر اور صاحب ثروت ہستیوں نے شرم و حیا بھی کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن (K.E.S.C.)۔ حبیب بینک۔ پی ٹی سی ایل وغیرہ کی طرح بیچ کھائی ہے۔ اگر بروقت ٹوک نہ دیئے جاتے تو اب تک اسٹیل مل، ریلویز و دیگر منفعت بخش ادارے بھی مالِ مفت، دلِ بے رحم کے مصداق اونے پونے بیچ کر کھا گئے ہوتے۔ اللہ بھلا کرے چیف جسٹس کے از خود نوٹسوں کا، کہ یہ ادارے بکنے سے بچ گئے۔ گرچہ چیف کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی لیکن جیسے کہا گیا ہے کہ

رات کی تیرگی جب حد سے گذر جاتی ہے
ظلمت شب کے مٹانے کو سحر آتی ہے

بس اس ہی لیئے اللہ نے چیف جسٹس کو نمود سحر کا درجہ دے دیا اور ان سے کی گئی زیادتیاں، قوم کی نجات کے کام آ گئیں اور اٹھائی گیروں سے جان چھوٹ گئی (خوش فہمی ہے)۔ ہر سمجھدار آدمی سمجھ رہا تھا کہ الیکشن میں ہارنے کے بعد دورِ پرویزی کے وزرا مونہہ دکھانے سے بھی گریز کریں گے۔ لیکن آفرین ہے انہوں نے تو بے غیرتی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ بڑے طمطراق سے ٹاک شوز میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ پنڈی کے ایک فرزند نے تو الیکشن ہارنے کے بعد ق لیگ سے رسہ تڑوا کر اپنی ڈیڑھ نہیں بلکہ سوا اینٹ کی پارٹی بنالی۔ سیاسیات پر تبصرے اس طرح کرتے ہیں جیسے ماضی ہی نہیں مستقبل پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ چیف جسٹس کی بحالی سے پہلے کا بیان تو بھولے نہیں بھولتا، کیونکہ بڑی رعونت سے کہا تھا 'افتخار چودھری ایک گھنٹے (گھنٹے) کے لیئے بھی بحال نہیں ہوگا'۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ چیف کی بحالی کے بعد شرمندگی نام کو بھی نہ تھی۔ اپنی وزارت کے دوران ریلوے کا جو حال کیا اسے ٹھیک ہونے میں بیس تیس سال تو لگیں گے۔ مگر دم خم دیکھئے کہ آٹھ دس سال تک قوم کا خون چوسنے کے بعد گنگا نہا کر تقریباً روزانہ ہی دوسروں پر کیچڑ اچھالتے اور سیاست پر شیخیاں بگھارتے نظر آتے ہیں۔

'جس نے کی شرم، اس کے پھوٹے کرم اور جس نے کی بے حیائی اس نے کھائی دودھ ملائی' پر عمل کرنے میں یہ واحد نہیں۔ بلکہ دورِ مشرفی کی تمام باقیات اس ہی مقولے پر عمل پیرا ہے۔ جن میں سے اور دو چار کا ذکر کیئے دیتے ہیں۔ ایک خاتون ہیں 'ڈبل ایم'، وہ کیمرے کو اس طرح فیس کرتی ہیں جیسے جیسلمیر کا قلعہ فتح کر کے آئی ہیں۔ مجال ہے جو چہرے سے شرمندگی ٹپک پڑے۔ بلاوجہ مسکراتے ہوئے موقع بے موقع اس طرح بولتی ہیں جیسے دوسرے تمام ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ ایک اور ہیں، کچھ دن تو غائب رہے لیکن دوبارہ مصنوعی مسکراہٹ سجائے ایک کاغذ پنسل لیئے 'درانہ وار' میڈیا پر آ گئے اور آتے ہی نئے صوبوں کا اشوکھڑا کر دیا ہے۔ ایک اور عظیم المرتبت سابق وزیر ہیں وہ اس شان سے گل فشانی کرتے ہیں جیسے جبلا لطارق (Gibralter) انہوں نے ہی فتح کیا ہو۔ ایک آئین کے خود ساختہ ماہر بھی ہیں، مہارت کا یہ حال

ہے کہ آئین کی کسی شق کو علیحدہ نہیں پڑھ سکتے ہمیشہ فلاں شق کو فلاں شق کے ساتھ ملا کر پڑھتے ہیں اور اپنے مطلب کی تشریح کر لیتے ہیں۔ ایک سابق وزیر اعلیٰ تو تن من دھن سے صرف اپنی جگہ لینے والے کی عیب جوئی میں لگے ہوئے ہیں، اور ان کے بڑے کزن 'بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی' پر عمل پیرا ہیں۔

ان چند مثالوں کے بعد یہ عرض کرنا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے کیئے پر پشیمان نہیں۔ کسی ایک کے چہرے پر پچھتاوہ یا شرمندگی نہیں۔ بلکہ دورِ مشرفی کا ایک بچونگڑا تو ایسا ہے جو اعلانیہ کہتا ہے میں مشرف کے لیئے 'کچھ' بھی کر سکتا ہوں۔ اب اس کچھ کی تشریح کون کرے کہ خیر سے بیرسٹر ہے اور مشرف کے آخری دنوں میں عبوری وزیر بھی رہ چکا ہے عبوری ہونے کے باوجود قانون پر اتنا بھی عبور نہیں کہ جان سکے کہ چوکیدار اگر مالک بننا چاہے تو اس کی سزا کیا ہے۔ بالفرض محال اگر مالک غلط کاریوں میں ملوث ہو تو کیا چوکیدار ٹیک اوور کر سکتا ہے۔ نہ جانے کیا مجبوری ہے کہ کوئی بھی یہ سوال نہیں کرتا کہ بارہ اکتوبر کو مشرف نے کس حق کے تحت جمہوری حکومت کو چلتا کیا تھا۔ اگر وزیر اعظم قصوروار تھا تو اسمبلی کا کیا قصور تھا۔۔؟

۲۴/جولائی ۲۰۰۹ء

ہوشیار باش

ہم نے ایک کالم لکھا تھا ''ڈیفنس کا علی ہجویری''۔ جس میں ایک خطرے کی نشاندہی کی تھی۔ لیکن جیسا کہ ہماری قوم کا مزاج ہے کہ وہ یہ دیکھتی ہے 'کس نے کہا ہے' یہ نہیں دیکھتی کہ کیا کہا ہے۔ اس لیئے وہ کالم سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ کیونکہ وہ ہم جیسے غیر معروف نے لکھا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے عوام حوالے دینے کے لیئے تو بزرگانِ دین کا نام لیتے نہیں تھکتے لیکن عمل کرنے میں بھرپور تھکاوٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کئی لوگوں کے مونہہ سے سنا تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ 'یہ دیکھو کیا کہا گیا، یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے'۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ہماری کوشش ہوتی ہے بزرگان دین کا نام لیئے بغیر انکا قول دہرا دیں، کیونکہ ہم لوگ تو بزرگان دین کے ناموں کی آڑ میں ہی اپنی اپنی دفلی اپنا اپنا راگ الاپتے ہیں۔ ہر شخص یہ دیکھتا ہے 'کس نے کہا ہے'۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے۔ اکثر باتوں کی سند نہیں ملتی اور کوئی بات کسی سے منسوب کرنے میں غلطی کا امکان تو رہتا ہی ہے تو ہم اپنے گناہوں میں اضافہ کیوں کریں۔ ایک صاحب نے ایک عظیم ہستی (نام نہیں تحریر کر رہے ہیں) کا واقعہ سنایا کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ اتنا وقت عبادات میں لگا دیتے ہیں اگر (نعوذ باللہ) اللہ کا وجود نہ ہوا تو یہ سب رائیگاں جائیں گی۔ انہوں نے جواب دیا 'بالفرض ایسا ہے بھی تو مجھے کیا فرق پڑے گا لیکن اللہ کے وجود (جو کہ ہے) کی صورت میں تمہارا کیا ہوگا۔ بات ہمارے دل کو لگی اس لیئے ہم نے پلے باندھ لی اور اکثر کمپنی میں ٹریننگ دیتے ہوئے اس قول کے تناظر میں مثالیں دے کر اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتے۔ ہم سیلز اور مارکٹنگ کے ٹرینیز (Trainees) کو بتاتے کہ کسی سے کوئی معاملہ کرنے سے پہلے اس کو اس وقت تک اچھا سمجھو جب تک وہ غلط نہ ثابت ہو جائے۔ جبکہ دوسرا آپشن یہ ہے کہ ہر ایک کو غلط سمجھو حتیٰ کہ وہ صحیح نہ ثابت ہو جائے۔ ہمیں جن صاحب نے اس عظیم ہستی کا جو واقعہ سنایا تھا وہ ہم نے تو اپنے پلے باندھ لیا تھا لیکن ان صاحب کا یہ حال تھا کہ وہ اکثر فرقہ پرستی کے چکر میں چند بزرگان دین کو برا بھلا کہتے۔ ایک دفعہ ہم نے ایک بزرگ کا عزت و تکریم سے نام لیا تو ناراض ہو گئے۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ دیکھو تمہارے پاس ان کے اچھا یا برا ہونے کا کوئی ثبوت نہیں اس لیئے ان کو برا بھلا کہنے سے بہتر ہے کہ خاموش

رہو۔ اللہ تعالیٰ تم سے ان لوگوں کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرے گا تو کیوں گناہ مول لیتے ہو۔ جب وہ نہ مانے تو ہم نے ان ہی کا سنایا ہوا واقعہ دہراتے ہوئے کہا کہ یار اگر وہ واقعتاً غلط ہوئے تب تو تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ لیکن روز قیامت اگر وہ صحیح ثابت ہوئے تو پھر تم تہمت اور دروغ گوئی کے مجرم ٹھہرو گے، مارے جاؤ گے۔ اس لیئے بہتر ہے خاموشی اختیار کرو۔ کہنے لگے فلاں کتاب سے میری بات صحیح ثابت ہوتی ہے ہم نے سمجھایا یہ کوئی دلیل نہیں کہ ایسی کتابوں کی بھی کمی نہیں جو تمہارے دعوے کی نفی کرتی ہیں۔ پھر مثال دے کر بھی سمجھایا کہ دیکھو آج کل میڈیا اتنا تیز ہے پھر بھی آج کے دور میں پتہ نہیں چلتا کون صحیح ہے اور کون غلط۔ اگر ۳۰/۳۵ سال پہلے کے اخبارات اٹھا کر دیکھو گے تو چکرا جاؤ گے۔ مساوات اخبار دیکھو گے تو جو لیڈر شیطان نظر آتا ہے وہ جسارت اخبار کے بموجب فرشتہ ثابت ہوتا ہے، اور جسارت جسے شیطان گردانتا ہے وہ مساوات کے نزدیک فرشتہ ہے۔ اب تاریخ لکھنے والے تو ثبوت ان ہی اخبارات سے لیں گے۔ یہ تو ہمارے اپنے دور کی بات ہے۔ تو سینکڑوں سال پہلے کی باتوں کا کیا ٹھکانا؟ تو پھر کیوں نہ کسی کو اچھا یا برا کہنے کی بجائے خاموشی اختیار کریں۔ بات اس کی سمجھ میں آئی یا نہیں۔ لیکن ہم آج پھر عادت کے مطابق موضوع سے بہک گئے۔ ہم تو اس خطرے کی نشاندہی کرنے چلے تھے جس کا حوالہ ہم نے اپنے ایک مضمون میں دیا تھا کہ کس طرح اسلام دشمن ہم مسلمانوں کو حج، ذکواۃ اور قربانی سے پہلوتہی پر راغب کر رہے ہیں۔ اسے اتفاق سمجھئے کہ حال ہی میں تازکستان کے صدر نے بھی اپنی قوم سے حج پر جانے کی بجائے وہی رقم فلاحی کاموں پر خرچ کرنے کی اپیل کی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک ٹاک شو میں چند نام نہاد مذہبی اسکالرز یہ سمجھا رہے تھے کہ اسلام ایک فلاحی مذہب ہے اس لیئے آج کے تناظر میں قربانی کی بجائے وہی رقم غریبوں کو دیدی جائے۔ چند ایک این جی اوز کی موڈرن خواتین بھی اجتہاد فرماتے ہوئے قربانی اور حج کی بجائے فلاحی کاموں میں اللہ کی خوشنودی کا سندیسہ دے رہی ہیں۔ ظاہری طور پر بات بڑی اپیلنگ لگتی ہے لیکن خطرے کی بو ہم نے محسوس کر لی کہ اب طاغوتی قوتیں کچھ نام نہاد دانشوروں اور اسلامک اسکالرز کے ذریعے اس ہی ایجنڈے پر کام شروع کر چکی ہیں۔ حکومت بھی کچھ ایسے حالات پیدا کر رہی ہے کہ عوام مجبوراً حج اور قربانی سے دور ہو جائیں۔ حج کو اتنا مہنگا اور مشکل کیا جا رہا ہے کہ لوگ خود ہی نہ جانے کے بہانے تلاش کرنا شروع کر دیں گے۔ عوام کی برین واشنگ اور برین سیٹنگ

(Brain Setting)اس ہی طرح کی جاتی ہے کہ حسب منشاء نتائج حاصل ہو جاتے ہیں۔حال میں ایک کرمفرما نے ہمیں ایک قران پیش کیا۔ہم نے عقیدت سے چوما اور کھولا تو وہ فقط اردو میں تھا۔عربی ٹیکسٹ کے بغیر۔ہم چونکے تو فرمایا کہ رسول کا فرمان ہے کہ قران کو سمجھ کر پڑھو اس لیئے اردو میں پڑھنا جائز ہے۔ہم نے کہا وہ ٹھیک ہے لیکن اس سے شر کا خطرہ ہے۔اگر بغیر عربی ٹیکسٹ کے اردو کا قران رائج ہو گیا تو لوگ عربی سے دور ہو جائیں گے۔حافظ ناپید ہو جائیں گے۔کیا بھول گئے ،بائیبل میں کیسے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔پہلے عبرانی (Hebru) سے انگریزی میں منتقل کیا اور پھر آہستہ آہست ترامیم نے اصل کو گم کر دیا۔کیا یہ ہی چاہتے ہو۔سن کر ناراض ہوئے اور ہمیں کافر تک کہہ دیا کہ قران کے منکر ہو رہے ہو،ہم نے لاکھ سر پٹخا کہ بھئی ہم قران کے نہیں اردو ورژن کے خلاف ہیں لیکن مانتے کیسے؟ وہ تو کسی اور کے ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ یہ پہلی بار نہیں۔ٹرکی میں اتاترک نے ترکی زبان میں اذان کا سلسلہ شروع کرایا۔شائد ایوب خان نے بھی کوشش کی تھی۔لیکن قوم جاگ رہی تھی۔لیکن اب شکاری نئے جال لے کر آئے ہیں۔اللہ خیر کرے ۔سنا ہے (دروغ بر گردن راوی) کوئٹ میں ایک امریکن قران ''The True Furqan'' متعارف ہو چکا ہے۔شائد اس سے تسلی نہیں ہوئی اس لیئے اب جلد بازی کی بجائے ست روی کا راستہ اپنایا جا رہا ہے۔اگر ہماری قوم نے مخالفت نہ کی اور اردو کا قران رائج ہو گیا تو بیس پچیس سال میں حسب منشاء نتائج ملنا شروع ہو جائیں گے۔ہم تو صرف آگاہ کر رہے ہیں ویسے قران کی حفاظت کا ذمہ تو اللہ نے لے رکھا ہے۔لیکن پھر بھی ہم مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ ''ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟'' کی کیفیت سے نکل کر ہوشیار رہیں۔مقابلہ امریکن تھنک ٹینکس سے ہے اور ہماری قوم ہاتھی کے کان میں سونے کی عادی !!۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ہمارے لیڈروں نے خوب خوب بغلیں بجائیں اور جنگ جیتنے کا اتنا پروپیگنڈا کیا کہ قوم سو گئی۔دوسری طرف بھارتیوں نے سوچنا شروع کیا کہ وار کب ،کہاں اور کیسے کیا جائے۔ہماری کمزوریوں کو تلاش کیا۔ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کیا۔عصبیت کا بیج بویا اور چھ سال بعد پاکستان کو دولخت کر دیا۔اناللہ وانا علیہ راجعون۔۔۔۔

۳۰ر جولائی ۲۰۰۹

سٹھیایا ہوا بچہ

کچھ لوگوں کی کاٹھی ایسی ہوتی ہے کہ عمر سے کئی برس چھوٹے لگتے ہیں جبکہ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ کے دکھائی دیتے ہیں۔ویسے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو جتنے کے ہوتے ہیں اتنے کے ہی نظر بھی آتے ہیں۔ان تین کیٹگریوں کی بدولت اکثر دلچسپ صورت حال سے واسطہ پڑتا ہے۔ہمارے ایک کولیگ قاضی صاحب ہم سے عمر میں تو چھوٹے ہیں ،لیکن لگتے بڑے ہیں۔اس لیئے عمر کے کومپلیکس میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ہم اکثر انہیں عمر کے حوالے سے چھیڑتے رہتے ہیں تو فوراً دفاع کرنے لگتے ہیں۔اور مزید مذاق کا نشانہ بن جاتے ہیں لطف تو اس دن آیا جب ہم نے دوستوں کی محفل میں اوپر بیان کردہ کیٹگریوں کے حوالے سے کہا کہ ہم تو اپنی عمر سے کم دکھائی دیتے ہیں۔ہم ۶۵ کے ہیں لیکن لگتے ہیں ۵۵ کے۔جبکہ قاضی صاحب کی خوبی ہے کہ ۶۵ کے ہیں اور لگتے بھی ۶۵ کے ہی ہیں۔سن کر چڑ گئے اور کہنے لگے۔تم سے تو چھوٹا ہوں۔سب نے پوچھا وہ کیسے؟ تو فرمایا اس نے میٹرک ۶۰ء میں کیا تھا اور میں نے ۶۳ء میں۔جواباً ہم نے کہا بھئی اگر تم میٹرک میں تین بار فیل ہوئے تو اس سے کم عمر ہونا کب ثابت ہوتا ہے۔بہر حال عمر کے حوالے سے لطائف بھی جنم لیتے ہیں۔عمر چھپانے کے معاملے میں خواتین خواہ مخواہ بدنام ہیں جبکہ مرد حضرات بھی ان سے پیچھے نہیں۔خواتین کے لیئے کہا جاتا ہے کہ تقریبات میں بڑے بچوں کو گھر پر ہی چھوڑ جاتی ہیں اور چھوٹے بچے کو اپنا پہلوٹی کا بتاتی ہیں۔کچھ دوستوں کے بارے میں ہمیں اپنی رٹائرمنٹ کے بعد پتہ چلا کہ اسکول میں انہوں نے اپنی عمر کم لکھوائی تھی اس لیئے رٹائرمنٹ میں ابھی کافی وقت ہے۔کچھ لوگوں کی عمر کا اس وقت صحیح پتہ چلتا ہے جب وہ سٹھیا جاتے ہیں۔بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے ۶۰ برس کے ہو گئے ہیں۔ویسے سٹھیانے کے لیئے ۶۰ سال کا ہونا ایسا ضروری بھی نہیں۔عمر کے حوالے سے یہ تمہید اس لیئے ہے کہ ہم پرویز مشرف کے ایک بیرسٹر محمد علی سیف کو بچہ سمجھتے

تھے۔وجہ یہ تھی کہ شکل سے تو بچہ لگتا ہی تھا لیکن ٹاک شوز میں باتیں بھی بچکانہ کرتا تھا۔ہم سوچتے تھے کیا پرویز مشرف کی مت ماری گئی ہے جو دو پیرزادوں، ایک ملِک، ایک رانجھے کے ہوتے ہوئے بھی اس بچہ مار کہ بیرسٹر کو بھی اپنا وکیل بنا رکھا ہے۔مشرف اقتدار میں تھا اس لیئے اس کے وکیلوں اور وزیروں کی احمقانہ باتوں کو برداشت کر لیا جاتا تھا۔حیرت ہمیں اس لیئے تھی کہ اس میں ایسی کوئی خوبی نظر نہیں آتی تھی کہ اسے وکیل رکھا جائے۔ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اسے نگران کابینہ میں وزیر بنایا جانا تھا۔عبوری دور کے لیئے وزیر بننے کی وجہ سے یہ مشرف کا اتنا احسان مند ہوا کہ حال ہی میں ایک ٹاک شو میں برملا کہہ دیا کہ میں مشرف کے لیئے 'کچھ' بھی کرسکتا ہوں۔اور واقعی کر بھی دیا کہ جب شریفوں، ملِک اور رانجھا نے مشرف کو پیٹھ دکھائی تو یہ کہتے ہوئے لندن پہنچ گیا۔ع

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار، میں چیخوں کہ ہائے دل

اور وہاں جاتے ہی عدالتوں کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کرنے لگا۔اور پھر موکل اور وکیل دونوں نے نواز شریف کی نقالی میں عدالت میں جانے سے انکار کر دیا۔(نواز شریف نے تو ڈوگر کی عدالت میں جانے سے انکار کیا تھا جس کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے وہ غیر آئینی چیف جسٹس تھا)۔اور جب فیصلہ آ گیا اور ۳ نومبر کے اقدام کو غیر آئینی قرار دیدیا گیا تو بال ہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دیا کہ فیصلہ توقع کے مطابق اور انتقامی کارروائی ہے۔سبحان اللہ۔انکے اپنے ایک ساتھی رانجھا کا کہنا ہے کہ مشرف نے ۳ نومبر کے اقدام کو خود ہی غیر آئینی کہا تھا۔اس ضمن میں خود مشرف کا اپنا بیان ریکارڈ پر ہے۔اس لیئے عدالت نے غیر آئینی اقدام قرار دے کر کیا غلط کیا۔جیسا کے ہم نے کہا کہ محمد علی کو بچہ سمجھتے تھے کہ شکل سے ہی نہیں باتوں سے بھی بچپنا ٹپکتا تھا۔لیکن اس بیان کے بعد واضع ہوا کہ ایسا بیان بچکانہ ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ سٹھیائے جانے کا ثبوت ہے۔ہم، مشرف کی پیروی کے فیصلے اور اس بیان کہ ''میں مشرف کے لیئے کچھ بھی کرسکتا ہوں''، کو اس کا بچپنا ہی سمجھتے اگر وہ عدالتی فیصلے پر احمقانہ تبصرہ نہ کرتا۔اس کے سٹھیا جانے کو مزید تقویت لارڈ نذیر کے بارے میں اس کے اس الزام کہ 'لارڈ نذیر، نواز شریف کے پیسوں پر لندن میں عیش کر رہا ہے' اور اس عزم سے

بھی ملی کہ 'میں لارڈ کے خلاف لندن میں مقدمہ لڑونگا'۔واقعی یہ کچھ بھی کر بلکہ کہہ بھی سکتا ہے۔ع

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

پس ہماری بات صحیح ثابت ہوئی کہ کچھ لوگ عمر سے چھوٹے نظر آتے ہیں اور بہکی بہکی باتوں سے ان کی صحیح عمر کا پتہ لگ جاتا ہے۔اس بیرسٹر کے ساتھ بھی یہ ہی ہوا

وکھول کر رکھ دیا ہر راز میری باتوں نے

۲/اگست ۲۰۰۹ء

گلوکار!۔نغمہ نہیں(The Singer, not the Song)

داسنگر ناٹ دا سونگ یعنی گلوکار، نغمہ نہیں (The Singer, not the Song) ایک انگریزی فلم کا نام بھی ہے اور آخری ڈائیلاگ بھی جو پچاس سال گذرنے کے بعد بھی ذہن سے چپکا ہوا ہے۔فلم میں یہ جملہ فلم کا ہیرو جو ایک بدمعاش ہی نہیں منکرِ خدا بھی ہوتا ہے، مرتے وقت اس پادری سے کہتا ہے جو پوری فلم میں اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح اس منکرِ خدا کو مذہب کی طرف راغب کرلے۔اس دوران وہ تائب تو نہیں ہوتا لیکن دونوں کو ایک دوسرے سے انسیت ہوجاتی ہے۔آخر میں جب ایک پولس مقابلے میں بدمعاش کو گولی لگتی ہے تو پادری جو اس دوران اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے ایک بار پھر کہتا ہے 'اب تمہارا آخری وقت ہے اور تم مجھ سے کافی متاثر بھی ہو تو اب تم خدا کے وجود کو مان لو' اس کے جواب میں بدمعاش یہ جملہ کہتا ہے کہ میں گلوکار سے متاثر تھا۔ نغمے سے نہیں۔ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہے کہ ہم کبھی بھی جماعت اسلامی سے متاثر نہیں ہوئے لیکن نہ جانے کیا بات ہے مولانا مودودی۔میاں طفیل، چودھری رحمت الٰہی و دیگر کے علاوہ موجودہ امیر منور حسن کو ہم پسند کرتے ہیں۔شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت کی پالیسی، سیاست کا انداز ہماری فکر سے مطابقت نہیں رکھتے لیکن انفرادی طور پر اسکے ہر لیڈر کا کردار متاثر کن رہا ہے۔یونیورسٹی میں اسلامی جمیعت طلباء اور پھر عملی سیاست میں جماعت سے شکوہ رہا ہے کہ یہ ہمیشہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے اور دوسروں کی سوچ کو حقیر سمجھنے میں حد سے گذر جاتے ہیں۔اختلاف ٹھیک! لیکن یہ کیا کہ اپنے اختلاف کی وجہ سے قومی مفاد کا بھی خیال نہ رکھا جائے۔مثال کے طور پر ۳ نومبر کے حوالے سے عدالت کا فیصلہ لیجئے۔عدالت کے اس فیصلے سے بہتر کوئی فیصلہ نہیں کہ اس نے صرف عدالتی رٹ قائم رکھی اور قانون کے مطابق فیصلہ کیا اور سیاسی معاملات پارلیمنٹ کی صوابدید پر چھوڑ دیئے۔لیکن منور حسن نے بیان داغ دیا کہ ''اگر ڈوگر غیر آئینی تھے تو اس سے حلف لینے والا صدر کیسے آئینی ہو

گیا''۔اب ملاحظہ فرمایئے کیا صدر کو ڈوگر نے منتخب کیا تھا؟۔ارے حلف تو کوئی بھی اٹھوا سکتا ہے۔عدالت کے سامنے ۳ نومبر کے آرڈننس کا سوال تھا جسے عدالت نے آئین کے تحت غیر آئینی قرار دے دیا۔اب یہ پارلیمنٹ کا کام ہے کہ غیر آئینی آرڈننس کے تحت کیئے گئے اقدامات کو کالعدم قرار دے۔جماعت پر کیا موقوف ہمارے تو سارے ہی سیاستدانوں کا عجب حال ہے۔جب کبھی پرویز مشرف پر آرٹیکل چھ کے تحت مقدمہ چلانے کی بات ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے اس پر ہی کیوں؟ اس سے پہلے والوں سے شروع کرو۔۔اور پہلے میں فقط ضیاالحق پر سوئی رک جاتی ہے۔یحییٰ اور ایوب کا نام لیتے ہوئے زبان خشک ہوجاتی ہے۔قانون کی نظر سے دیکھا جائے تو ایک غاصب کے کیئے گئے تمام اقدام۔اچھے یا برے۔غلط ہیں لیکن نظام کو بچانا بھی تو ہے۔اگر ہم غلام محمد پر مٹی ڈال کر ایوب خان سے بھی شروع کریں تو سب کچھ ملیا میٹ ہوجائے گا۔۶۲ کا آئین غلط۔۶۵ کی جنگ غلط۔۔معاہدہ ءتاشقند غلط۔بیاس ستلج سمیت ۹ دریاؤں کا بیچا جانا غلط۔یحییٰ کے تقرر سے لیکر اسکے کروائے گئے الیکشن سمیت آج تک کے تمام اقدامات کا کیا ہوگا۔کیا وقت کا پہیہ الٹا چلایا جاسکتا ہے۔کیا ہم دوبارہ ۱۹۵۴ میں جاسکتے ہیں۔اگر نہیں تو پھر فی الحال پرویز مشرف کو تو کٹہرے میں لاؤ۔ماضیء بعید کو دفن کرو لیکن ماضیء قریب کا احتساب مستقبل کے بچانے کے لیئے ضروری ہے۔ورنہ ایسے اڈونچر جنم لیتے رہیں گے۔جن جن کا مفاد پرویز مشرف سے وابستہ ہے انکا استدلال ہے کہ پرویز مشرف کی بجائے سب سے پہلے غاصب اوّل سے شروع کیا جائے۔(تاکہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی)۔کیونکہ ایک اور گروپ کی خواہش ہے کہ اتنی دور جانے کی کیا ضرورت۔۔بس ضیاالحق سے شروع کرو کہ۔ع

'ظالم' نام لیتا تھا خدا کا اس زمانے میں

یحییٰ اور ایوب تو پرویز مشرف کی طرح موڈرن تھے۔پیتے بھی تھے پلاتے بھی تھے۔اگر ان سے شروعات ہوئی تو قبروں سے یہ کہتے ہوئے اٹھیں گے۔ع

داورِ حشر مرا نامہء اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں

یہ اور بات کہ ہم سب ہی اس پردہ نشین سے بخوبی واقف ہیں۔یہاں خواجہ ناظم الدین کا وہ انکشاف یاد آگیا جو

انہوں نے حیدرآباد میں مادرملت کے انتخابی جلسے میں کیا تھا کہ ایوب خاں نے ان سے جب وہ وزیراعظم تھے اسّی ہزار کا قرضہ مانگا تھا جسے انہوں نے رد کردیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرض مانگنے والا اتنا امیر کبیر کیسے ہو گیا۔ یہ ہی سوال مشرف سے بھی کیا جاسکتا ہے جس نے اپنی کتاب میں ایک بکسے کا ذکر کیا ہے کہ وہی ایک اثاثہ تھا جسکی حفاظت ان کے والد ہندوستان سے یہاں آتے ہوئے تن من سے کررہے تھے۔ کیا اس میں کسی خزانے کا نقشہ تھا جس کے طفیل وہ آج اربوں میں کھیل رہے ہیں۔ ورنہ ایک جنرل کی تنخواہ میں تو محل نہیں بن سکتے۔ آخر میں اپنے لیڈران سے گزارش ہے کہ وہ مشرف کو بچانے کے لیئے اس کے پیشروؤں کے احتساب کا سہارا لینا چھوڑ دیں ورنہ قاتل حضرات یہ کہنے میں حق بجانب ہونگے کہ ان پر مقدمہ چلانے سے پہلے دنیا کے پہلے قاتل (قابیل) کو کٹہرے میں لایا جائے۔

۴/اگست ۲۰۰۹ء

نوحہ غم ہی سہی

ایک خوشخبری ملی ہے۔ کیا ہوا جو اپنے ملک کے حوالے سے نہیں۔ امریکہ کے حوالے سے تو ہے۔ خبر ہے کہ جن دو صحافی خواتین کو شمالی کوریا نے گرفتار کر کے ملکی عدالت کے تحت ۱۲ سال کی قید سنائی تھی انہیں چھوڑ دیا۔ دونوں خواتین امریکی شہری تھیں اس لیئے امریکہ نے سر توڑ کوششیں کیں اور بالآخر انہیں رہائی دلوادی۔ اس کے لیئے کیا کھویا کیا پایا۔ یہ تو شائد معلوم نہ ہوسکے لیکن ہمارا خیال ہے کہ شمالی کوریا نے، جس کے تعلقات امریکہ سے کچھ ٹھیک نہیں ہیں، ایسے ہی تو نہیں چھوڑا ہوگا۔ اور دو چار ارب ڈالر بھی نہیں لیئے ہونگے کہ وہ دونوں خواتین انکی اپنی شہری تو تھیں نہیں کہ بیچ دیا اور پیسے کھرے کر لیئے اور فخریہ اپنی تاریخ یا سوانح عمری میں سنہرے الفاظ سے لکھ بھی دیا کہ ہم نے یہ کارنامہ سرانجام دے کر اتنے ڈالرز کمائے ہیں۔ ہمیں یقین ہے انہوں نے ضرور کوئی بڑی ڈیل کر کے امریکیوں کو گھٹنے ٹکوا دیئے ہونگے۔ ضرور اپنی قوم کے لیئے مراعات لی ہونگیں۔ یہ وعدہ بھی لیا ہوگا کہ آئندہ ہمارے کام میں مداخلت نہ کرنا ورنہ صحافی نہیں سفارتی اشخاص کو پکڑ لیں گے۔ اور پھر سابق صدر نہیں موجودہ صدر کو لینے آنا پڑے گا۔ کورین سمجھ گئے ہیں کہ امریکوں کی کمزوری انکے شہری ہیں، چاہے کالے ہوں یا گورے۔ کھڑی ناک یا چپٹی ناک سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اہمیت تو اس سے ہی واضع ہے کہ کلنٹن کو پورا جہاز لے کر جانا پڑا اور پھر دونوں خواتین کو اپنی حفاظت میں اس ہی خصوصی طیارے میں ان کے شہر پہنچانا پڑا۔ ظاہر ہے جب اہمیت اتنی ہو تو کوریا نے کیا کچھ نہیں حاصل کیا ہو گا۔ بس ہماری حکومت سے چوک ہوگئی ورنہ کورین کو سمجھا دیتے تو وہ اپنی منوائی ہوئی شرائط میں ایک کا اور اضافہ کرسکتا تھا کہ ہمارے دوست پاکستان کی ڈاکٹر عافیہ کو آزاد کرنا ہوگا۔ ہم تو سزایافتہ خواتین کو چھوڑ رہے ہیں۔ ڈاکٹر عافیہ پر تو ابھی فردِ جرم بھی عائد نہیں ہوئی۔ بہرحال ایک موقع گنوا دیا۔ اب عافیہ صدیقی کی رہائی کی کوئی امید نہیں۔ ویسے بھی ہم لوگ بیوقوف تو ہیں نہیں کہ ایک خاتون ڈاکٹر کو چھڑوانے بیٹھ جائیں۔ اور یہ

بھی تو ہوسکتا ہے مشرف نے کہہ دیا ہو کہ 'بیچا ہوا مال واپس نہیں ہوگا'۔ دوسری قباحت یہ بھی تو ہوسکتی ہے کہ اگر دباؤ ڈال کر (جو ناممکن ہے) واپسی ہو بھی تو قیمت کیسے اور کہاں سے لوٹائی جائیگی کیونکہ لینے والا تو 9/11 میں پوری قوم کو گروی رکھ کر اب 2 کا اضافہ کر کے نو دو گیارہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انا کا مسئلہ بھی آڑے آئے گا کہ ایک عام شہری کو لینے کون جائے۔ کیونکہ یہاں تو یہ حال ہے

تو بھی رانی ، میں بھی رانی ۔ کون بھرے گا پانی

اور وہاں سے سابق صدور بھی یہ کام انجام دینے کے لیئے تیار۔ برطانیہ سے تو ایک شہزادہ اپنے ایک پاکستانی نژاد برطانوی شہری کو لینے پاکستان آیا اور بلا معاوضہ چھڑوا کر لے گیا (اندرونِ خانہ یا کسی ذاتی اکاؤنٹ میں کچھ ڈال گیا ہو تو ہم لاعلم ہیں)۔ ہمارے سابق صدور یا تو مفرور یا مغفور ہو چکے ہیں۔ لے دے کر ایک دو ہیں بھی تو بیچارے نہ تین میں ہیں نہ تیرا میں۔ شائد کسی کو ان کے نام بھی نہ یاد ہو اس لیئے ہم ہی بتا دیتے ہیں کہ فاروق لغاری کے علاوہ جناب رفیق تاڑر بھی ہیں جن کی بے چارگی کا تو یہ حال ہے کہ انہیں سابق ہونے کا بھی اعزاز نہیں۔ آئینی صدر کو غیر آئینی طریقے سے ہٹانے پر سب خاموش ہیں اور غیر آئینی صدر کو گارڈ آف آنر ہی نہیں دوسری مراعات بھی حاصل ہیں۔ اگر کسی نے سوال اٹھایا بھی تو جواب ہوگا اس کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی کیونکہ آئینی طریقہ یہ ہی ہے۔ اور تو اور کوئی اینکر پرسن بھی انہیں نہیں بلاتا حالانکہ وہ (شائد) چیف جسٹس بھی رہ چکے ہیں۔ (یہاں ہمارا علم ناکارہ ہے۔ واللہ اعلم بقید حیات ہیں بھی یا نہیں) ہم لوگ آئینی قوم ہیں اس لیئے غیر آئینی ہتھکنڈوں سے قوم کو نقصان پہنچانا آسان ہے لیکن مجرم کو سزا دینے کے لیئے آئین کا سہارا لینا ضروری ہے ورنہ بحران پیدا ہوسکتا ہے۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ بمطابق قانون اگر کوئی چور آپ کا سامان لے جائے تو لے جاسکتا ہے اور اگر مسروکہ مال مل بھی جائے تو آپ آسانی سے واپس نہیں لے سکتے اس کے لیئے آپ کو عدالت کی خدمات حاصل کرنا ہونگیں۔ ہم نے وہ تمام رکاوٹیں جو اپنے لوگوں کو واپس لانے میں پڑسکتی ہیں مختصراً بیان کردی ہیں۔ اس ہی لیئے ہماری حکومت کوئی قدم نہیں اٹھا رہی کہ اتنی زیادہ تعداد میں بیچے گئے لوگوں کی واپسی گلے پڑسکتی ہے۔ لانے کے لیئے کس کو بھیجیں کہ امریکہ اور برطانیہ نے غلط روائت ڈالدی ہے پھر ہمارے لوگ پکڑے نہیں۔ بیچے گئے تھے اس لیئے

رقم واپس کرنی پڑی تو آئی ایم ایف سے مزید قرضہ لینا پڑے گا۔ ویسے ڈاکٹر عافیہ کے لیئے ایک طریقہ ہے کہ اگر ایران نے ابھی پکڑے گئے تین امریکی واپس نہیں کیئے تو وہ اپنی شرائط کی لسٹ میں ہماری ڈاکٹر کا نام شامل کرلے اور ہمیں بھی خوش ہونے کا موقع دے ورنہ ہم دوسروں کی خوشی میں بھی خوش ہیں اور تو اور ہم غموں میں بھی خوش رہنا جانتے ہیں۔ بقول شاعر۔ ع

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہء غم ہی سہی۔ نغمہء شادی نہ سہی

اس ہی لیئے ہمیں امریکن صحافیوں کی رہائی پر جو خوشی ہوئی ہے وہ بیان سے باہر ہے

۶/اگست ۲۰۰۹ء

بلاسفیمی ۔۔۔ایک قانون

ہم نے بلاسفیمی کے عنوان سے ایک کالم لکھا تھا جس میں اسکول کا ایک واقعہ تھا کہ کس طرح ایک عیسائی ٹیچر نے ایک لڑکی سے سپارہ چھین کر پھاڑ دیا تھا۔جس پر ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔طلباء نے اور پھر عوام نے خوب توڑ پھوڑ مچائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ٹیچر اردو اور عربی سے نابلد تھی اور یہ سمجھی تھی کہ طالبہ کلاس میں کوئی کہانی پڑھ رہی ہے۔معافی تلافی سے معاملہ رفع ہوا۔تقسیم ہند سے پہلے ایک ہندو نے جب حضور پاک ﷺ کی شان میں گستاخی کی تھی تو ایک نوجوان علم دین نے قانون ہاتھ میں لیتے ہوئے اس شاتمِ رسول کو جہنم رسید کر دیا اور نتیجے میں پھانسی پا کر شہادت کے درجے پر فائز ہوا۔ایسے اور بھی واقعات ہوئے اور توہین رسالتؐ کے کسی قانون کی عدم موجودگی میں لوگ قانون اپنے ہاتھ میں لیتے رہے۔بعدازاں ایک ایسا قانون بنا جس کے تحت توہینِ رسالت کا قانون نافظ ہوا۔قانون شائد جلدی میں پاس ہوا تھا اس لیئے مسلمانوں اوراقلیت کو پوری طرح آگاہی نہ ہوسکی۔اس لیئے مخالفت شروع ہوگئی۔اقلیت کی مخالفت تو سمجھ آتی ہے لیکن کچھ مسلمانوں نے بھی اپنے آپکو روشن خیال ثابت کرنے کے چکر میں اس کی مخالفت شروع کردی۔کوششیں تو بہرحال کی گئیں کہ سب کو اس قانون کے بارے میں بتایا جائے کہ اس سے اقلیت کا تحفظ مقصود ہے۔لیکن مخالفوں نے یہ ہوا دی کہ اس سے اقلیتوں کے حقوق سلب ہو جائیں گے۔اقلیتوں اور نام نہاد روشن خیالوں نے اس قانون کو تسلیم نہیں کیا اور وقتاً فوقتاً اس قانون کے خاتمے کے لیئے مہم چلاتے رہے۔حکومت کا خیال تھا کہ ایسے قانون کے نہ ہونے سے مسلمان کسی بھی توہین رسالت کے مرتکب کو خود ہی سزا دینے کی کوشش میں حد سے گذر جاتے ہیں۔جبکہ مخالفین کا خیال تھا کے اس قانون کا غلط استعمال ہونا شروع ہو جائے گا۔کسی حد تک دونوں درست تھے کہ غازی علم دین شہید کا واقعہ اس ہی بات کی نشان دہی کرتا ہے۔اگر کوئی قانون ہوتا اور اس پر درست عمل ہوتا تو حکومت شاتم کو موت کی سزا دیتی اور علم دین پھانسی نہ چڑھتا۔اسکول کی ٹیچر

والے معاملے میں بھی یہ ہوا۔اگر معاملہ عدالت میں پہنچتا تو بیانات کے بعد واضع ہوجاتا کہ ٹیچر بے قصور ہے اور سارا معاملہ معافی کے بعد ختم ہوجاتا اور جو توڑ پھوڑ اور پکڑ دھکڑ ہوئی تھی اس سے بچا جاسکتا تھا۔لیکن کوئی قانون نہ تھا اس لیئے عوام نے اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق عیسائیوں کے چرچ کو نقصان پہنچایا اور پکڑے گئے اور خوار ہوئے۔دوسرا رخ یہ ہے کہ قانون توہینِ رسالت کے بعد بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔عوام میں شعور اور علم کی کمی کی وجہ سے اب بھی لوگ ایسے کسی واقعہ پر جذباتی ہوجاتے ہیں اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے سے گریز نہیں کرتے۔حال ہی میں سکھر میں ایک ہندو ڈاکٹر نے ایک معاملے میں حضورؐ کا نام استعمال کرتے ہوئے کسی کو طعنہ دیا کہ تم نے تو فلاں شخص کو (نعوزباللہ) پیغمبر ہی سمجھ لیا ہے۔بس پھر کیا تھا اس کا کلینک جلا دیا گیا اور بات بڑھ گئی۔بات تو واقعی قابل اعتراض تھی لیکن کسی نے یہ نہ سوچا کہ یہ ڈاکٹر کی حماقت بھی تو ہوسکتی ہمارے خیال میں ڈاکٹر کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا مرتکب ہورہا ہے۔اگر بلاسفیمی کے قانون کے تحت مقدمہ ہوتا تو شائد اتنے نقصانات نہ ہوتے جو ہڑتال وغیرہ سے ہوئے۔اور ڈاکٹر کو خاطر خواہ سزا بھی مل گئی ہوتی۔ایک موؤذن بھی ایک بار لوگوں کے عتاب کا نشانہ بن گیا تھا جب وہ چند پھٹے ہوئے قرآنی اوراق کو تلف کرنے کی نیت سے دریا میں بہانے کی بجائے، جلاتے ہوئے پکڑا گیا۔ہمارا خیال ہے اس کے ذہن میں بھی نہ ہوگا کہ وہ ایک غلط کام کررہا ہے۔اپنی دانست میں وہ ان اوراق کو بے ادبی سے بچانے جارہا تھا۔ان مثالوں سے ہمارا مقصد یہ واضع کرنا ہے لوگ دانستہ ہی یہ جرم نہیں کرتے۔اس کے علاوہ چند مثالیں ایسی بھی ہیں جن میں لوگوں نے جھوٹے الزام لگا کر قانون ہاتھ میں لیا۔اس میں مسلمان اوراقلیت دونوں ہی کم نہ تھے۔کسی نے اپنا کوئی بدلہ لینے کے لیئے الزام لگا دیا کہ اس نے قران کی توہین کی ہے۔عیسائی اور ہندو بھائیوں نے بھی کبھی رقم کے لین دین کو یا کسی اور جھگڑے کو مذہبی رنگ دے کر اپنی قوم کی ہمدردی حاصل کرلی۔اوراصل معاملے کو پس پشت ڈالدیا۔ایسے ہی ایک واقعہ کے ہم بھی گواہ ہیں۔ہمارے پڑوسی کا ایک عیسائی خاک روب سے اس بات پر جھگڑا ہوگیا کہ وہ مہینے دو مہینے بعد بھی مشکل سے صفائی کرنے آتا تھا۔بات ہاتھا پائی تک پہنچی تو اسنے اپنی کمیونٹی میں رپورٹ کردی کہ مجھے عیسائی ہونے کی سزا مل رہی ہے بس پھر کیا تھا ساری قوم جھاڑو لے کر نکل آئی۔ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ہمارے پڑوسی

کی جان مشکل میں آ گئی۔ بات بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھی کہ اقلیتوں نے قانون توہین رسالت کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جب بھی ایسا کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہوتا ہے تو تان اس ہی مطالبے پر ٹوٹتی ہے۔ اور اس میں پیش پیش چند این۔ جی۔ اوز بشمول ہیومن رائٹس کی تنظیمیں بھی ہوتی ہیں۔ ابھی حال ہی میں گوجرہ میں ہونے والے واقعہ کے بعد بھی یہ ہی مطالبہ سامنے آ رہا ہے۔ ٹی وی کے اینکر پرسن بھی پورا زور لگا رہے ہیں کہ یہ سب کچھ اس ہی قانون کا کیا دھرا ہے۔

وہ لوگ جو رشدی ملعون، تسلیمہ نسرین، ڈنمارک کے خاکوں پر خاموش رہے۔ جنہوں نے بی بی سی پر دکھائی جانے والی کلپ (جس میں ایک فاحشہ عورت اور پاکستانی فنکار سلمان احمد کو قران کا مذاق اڑاتے دکھایا گیا ہے) کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ جو لوگ، جرمنی میں ایک مسلمان عورت پر، جسے صرف حجاب استعمال کرنے کی وجہ سے شہید کر دیا گیا، کوئی پروگرام نہ کر سکے۔ وہ گوجرہ کے واقعہ پر سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح بلاسفیمی کا یہ قانون منسوخ ہو جائے۔ ہم مانتے ہیں کہ قانون میں کچھ سقم ہے۔ تو بھئی اسے دور کرواؤ۔ قانون پر عمل کرواؤ۔ اگر لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں تو ان کو سزا دلواؤ۔۔ نہ کہ قانون ہی منسوخ کروانے کے چکر میں پڑ جاؤ۔ چند دن پہلے لوگوں نے موبائل یا موٹر سائکل چھیننے والوں کو زندہ جلانا شروع کیا تو ان ہی لوگوں نے قانون ہاتھ میں لینے والوں کی مذمت تو کی لیکن کسی نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ڈکیتی وغیرہ کا موجودہ قانون منسوخ کیا جائے۔ ہمیں افسوس تو ہیومن رائٹس کمیشن۔ انصار برنی، عاصمہ جہانگیر وغیرہ پر ہوتا ہے جو حقوق کی جنگ تو لڑتے ہیں لیکن اپنی پسند کی۔ انصار برنی کشمیر سنگھ کو چھڑوانے میں پیش پیش تھے لیکن سعودی عرب میں گرفتار خاندان کے لیئے کچھ نہیں کر پا رہے۔ ہیومن رائٹس کمیشن کی موجودگی میں محترمہ جنجوعہ صاحبہ کو ڈفینس آف ہیومن رائیٹس کی ضرورت پڑ گئی۔ مختاراں مائی کے لیئے لڑنے والوں کو ڈاکٹر عافیہ کا نام گلے میں اٹکتا محسوس ہوتا ہے۔ ہمیں ہنسی اس وقت آتی ہے جب یہ تنظیمیں مجرموں کے حقوق کے لیئے آواز اٹھاتی ہیں۔ بخدا ہم مجرموں کے حقوق کے خلاف نہیں لیکن پہلے ملزموں کو تو انصاف دلواؤ۔ اور اس سے بھی پہلے مظلوموں کی دادرسی تو کرو، پھر وقت ملے تو مجرموں کے حق میں آواز اٹھانے سے روکنے والے ہم کون؟ مضمون کی طوالت کے خوف سے بچنے کے لیئے اختصار سے کام لینے میں یہ مشکل ہوتی

ہے کہ بات مبہم رہ جاتی ہے۔۔ اور وہ بات جس کا ذکر ہی نہیں ہوتا وہ بات گلے پڑ جاتی ہے۔ پھر بھی ہم مختلف این۔ جی۔ اوز کی روشن خیال کرتا دھرتاؤں سے یہ ضرور کہیں گے کہ خدارا اپنے تئیں مجتہد بننے کی کوشش نہ کریں۔ اگر اللہ اور رسول ﷺ اور قران کی بات پسند نہیں تو اپنے اندر مورل کریج پیدا کریں اور آدھے تیتر پر ہی گزارا کریں۔ یہ ہم ان خواتین سے کہہ رہے ہیں جو مختلف چینلز پر اس طرح جلوہ گر ہوتی ہیں کہ سر پر دوپٹے کی تہمت لگائے بغیر، باقاعدہ قران اور احادیث کی تشریح کرتے ہوئے اجتہاد فرماتی ہیں اور مجتہد ہونے کی دلیل اپنا پنج وقتہ نمازی ہونا سمجھتی ہیں۔

۱۳/اگست ۲۰۰۹ء

جمہوریت اور آمریت

کچھ لوگ جو عموماً ہاتھی کے کان میں سوئے ہوتے ہیں انہیں ایسی کسی بات پر یقین نہیں آتا جس کے کسی بھی پہلو سے مسلمانوں، خصوصاً پاکستانی مسلمانوں کی بڑائی کا تاثر ملتا ہو۔ ہاں کوئی بات اس کے برعکس ہو تو یقین ہی نہیں کرتے بلکہ اس بات کو خوب خوب اچھالتے بھی ہیں۔ پاکستان مخالف دانشوروں کو مہمان بنا کر ٹی وی پر محفلیں بھی سجائی جاتی ہیں۔ اگر ہم ایسے واقعات کی صرف نشاندہی کرنے بیٹھ جائیں تو کاغذ کے کاغذ سیاہ ہو جائیں گے۔ اور ہمارا آج کا موضوع دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ یہ بات اس لیئے نکل آئی کہ برطانوی اخبار ڈیلی ٹیلیگراف کے بقول نواز شریف نے برطانیہ کے پولیٹیکل ڈائرکٹر سر مارک لائل گرانٹ کی اس درخواست کو مسترد کر دیا جس میں اس نے استدعا کی تھی وہ طالبان سے جاری جنگ پر توجہ دیں، پرویز مشرف کے ٹرائیل پر زور نہ دیں۔ ظاہر ہے یہ بات حلق سے اترنے سے رہی لیکن اس ہی خبر میں ایک اور خبر بھی ہے کہ برطانوی حکام نے کہا ہے مارک لائل نے ایسی کوئی بات نہیں کی تاہم پاکستان ہی نہیں خطے کے استحکام کے لیئے ضروری ہے کہ مشرف کے خلاف قرارداد جیسے مسئلے نہ اٹھائے جائیں۔ ہمارے استحکام کے لیئے کیا ضروری ہے یہ ہمیں سابق ایسٹ انڈیا کمپنی بتا رہی ہے۔ جبکہ نواز شریف کا خیال ہے کہ پاکستان کے استحکام کے لیئے آمریت کا روکنا ضروری ہے اور اس کے لیئے مشرف کا ٹرائیل اولین شرط ہے۔ ڈیلی ٹیلگراف، مارک لائل اور برطانوی حکام نے شائد ہوم ورک صحیح طور پر نہیں کیا اور ان کے بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ سچائی پر مبنی نواز شریف کا بیان ہے باقی قلابازیاں ہیں۔ مارک لائل کے جس بیان کی تردید برطانوی حکام کر رہے ہیں وہی بات دوسرے انداز میں خود کہہ رہے ہیں۔ پاکستانی نام نہاد دانشوروں کو تو برطانوی حکام ہی سچّے لگیں گے لیکن ہم دانشور نہیں ہیں اور محبّ وطن بھی ہیں، اس لیئے نواز شریف کی بات ہی سچّی ہے۔ ویسے بھی ان کے سچّے ہونے کی ایک سند ایک امریکی جنرل کی کتاب سے بھی ملتی ہے جسے ہمارے دانشوروں اور مبصروں نے کوئی اہمیت نہیں دی کیونکہ اس سے پاکستانیوں کا وقار بلند ہونے کا خطرہ تھا۔ اس

جنرل نے لکھا ہے کہ جب بھارت نے ایٹمی دھماکہ کر دیا تو کلنٹن کو تشویش ہوئی کہ کہیں پاکستان جوابی غزل نہ عرض کر دے اس لیئے کتاب کے مصنف جنرل اور ایک (شائد) سیکریٹری اسٹیٹ کو حکم ہوا کے فوراً نواز شریف سے ملو اور اگر اس کا ایسا کوئی ارادہ ہے تو اسے روکنے کی کوشش کرو۔ دونوں حضرات ابھی اڑنے کے منتظر تھے کہ پر کترنے کے لیئے نواز شریف کا پیغام موصول ہوا کے آپ لوگ آنے کی زحمت نہ کریں۔ سیکریٹری صاحب پریشان ہوئے کہ کلنٹن کو کیا مونہہ دکھائیں گے اس لیئے جنرل سے پوچھا کہ کیا تمہارا کوئی پاکستانی جنرل دوست نہیں۔ بس پھر روشنی کی کرن ہاتھ آئی اور ایک جنرل سے رابطہ ہو گیا اور کچھ ہی دیر بعد دونوں محو پرواز تھے۔ (اگر پرویز سربراہ ہوتا تو پرواز کی زحمت سے بچ جاتے اور ایک ٹیلیفونک مار کافی ہوتی)۔ قصہ مختصر جب دونوں پاکستان پہنچے تو دیر ہو چکی تھی۔ پاکستان ساتواں ایٹمی ملک بن چکا تھا۔ چھٹا ایٹمی ملک ہونے کے باوجود بھارت کی گھگی بندھ چکی تھی۔ غیر ممالک میں بسے پاکستانیوں کو دوسرے ممالک کے لوگ جس طرح ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے وہ ایک الگ داستان ہے۔ بھارتی دھماکے اور پاکستانی دھماکوں کے درمیانی وقفے میں بھارت نے جس چھچھورپن کا مظاہرہ کیا تھا وہ واہگہ پر موم بتیاں جلانے کے خواہشمندوں کے لیئے ایک سبق ہے (مگر غیرتمندوں کے لیئے) اور پھر بڑھکیں مارنے والے بھارت کی ہوا نکلتے تو ساری دنیا نے دیکھا۔ بس اسکے بعد ہم پاکستانی تو آسودہ خاطر (complacent) ہو گئے اور دشمن نے کام شروع کر دیا کہ پاکستانیوں کو دبانے کے لیئے جمہوریت نہیں آمریت کا ہونا ضروری۔ ایسے عقل کے اندھوں کو کون بتلائے کہ ۱۹۴۸ میں جمہوری حکومت تھی اس لیئے آج تک آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کی اصطلاح استعمال ہو رہی ہے۔ ۹ دریاؤں کا پانی اور رن کچھ کی '85%' زمین آمریت کے دور میں گئی۔ مشرقی پاکستان اور سیاچن بھی آمریت کی بھینٹ چڑھے۔ کارگل، گو کہ جمہوری دور میں رسوائی کا باعث بنا لیکن یہ سب ہی جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ چار جنرلوں کی حماقت تھی جس سے نہ صرف وزیراعظم کو لاعلم رکھا گیا بلکہ ایئر فورس کو بھی اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ اگر چین سے مشرف کی پاکستان میں جنرل عزیز سے گفتگو بھارت رکارڈ نہ کرتا تو شائد کوئی یقین نہ کرتا کہ وزیر اعظم اس ایڈونچر سے لاعلم تھے۔ (سوچنے کی بات تو یہ بھی ہے یہ گفتگو کو ڈورڈز میں کیوں نہ تھی)۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۲ اکتوبر کو مشرف قبضہ نہ کرتا تو چاروں جنرلوں کا کورٹ مارشل تیار تھا۔ امریکی جنرل نے اپنی تصنیف میں شائد

یہ ہی بتانے کی کوشش کی ہے کہ جمہوری حکومت آمر کے مقابلے میں بہادر ہوتی ہے۔اس ضمن میں اس نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ۹/۱۱ کے بعد بش نے نہیں، فقط سیکرٹری آف اسٹیٹ نے مشرف سے فون پر گفتگو کی تھی نتیجے میں وہ اس طرح بیٹھ گیا جیسے پانی میں بتاشہ۔بش کو حیرانی ہوئی کہ مشرف نے ایک دو نہیں ساری باتیں مان کر اپنی بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا اور پھر جب یہ معلوم ہوجائے کہ سامنے والا کتنا کمزور ہے تو پھر 'ڈو مور' (Do More) کہنے اور ڈرون حملے کرنے سے کون روک سکتا ہے۔ہوسکتا ہے آپنے بھی غور کیا ہو کہ مشرف جب کیمرے کے سامنے آتا تھا تو سانس روک کر اور پیٹ اندر کھینچ کر اپنے فٹ ہونے کا جھوٹا مظاہرہ بالکل اس انداز سے کرتا تھا جیسے کوئی کوتاہ قد اپنے آپ کو طویل قامت ثابت کرنے کے لیئے پنجوں پر اچھلتا ہے۔ویسے آپس کی بات ہے ہمیں تو اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں لقا کبوتر ہی یاد آیا۔۔۔

۱۵/اگست ۲۰۰۹ء

کند ہم جنس۔۔

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، کی فینٹا سیز (Fantasies) کے بعد ہمیں کوئی اور جچی ہی نہیں۔ہاں مزاحیہ ادب میں اور بھی بہت سے نام ہیں جنکے ہم دلدادہ ہیں مثلاً کرنل محمد خان۔شوکت تھانوی۔عظیم بیگ چغتائی ۔مشتاق احمد یوسفی وغیرہ لیکن نہ جانے کیوں ہم ڈاکٹر صاحب کے سحر سے نہ نکل سکے۔اب خدا جانے کیا ہوا کہ پچھلے دنوں پاکستان کو لُوٹنے والے ایک شخص کا انٹریو پڑھ کر ہماری ہنسی رکنے کا نام نہیں لے رہی۔اس سے پہلے کہ گھر والے ہمیں پاگل سمجھنے لگیں ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ہم اس انٹریو پر کچھ لکھنے بیٹھ جائیں۔ہم نے کہیں پڑھا، یا سنا تھا کہ کہہ دینے یا لکھ دینے سے غم ہلکا ہوجاتا ہے (غم بانٹنے سے کم ہوجاتا ہے) تو کوئی وجہ نہیں کہ اس انٹریو پر تبصرہ کرنے سے ہماری ہنسی میں افاقہ نہ ہو۔اور واقعی اس ارادے کے ساتھ ہی ہماری ہنسی میں کافی کمی ہونے لگی ہے۔لندن میں دیئے جانے والے اس انٹریو میں اسے سابق وزیراعظم لکھا گیا ہے جبکہ ہم نے اسے وزیراعظم کبھی بھی نہیں مانا۔حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑا کیونکہ ہمارے ہر سیاستدان نے ہی نہیں ہر پاکستانی نے یہ ماننے کے باوجود کے ۱۲ اکتوبر کے بعد آنے والا قابض ٹولہ غیر آئینی تھا۔صدر سے لیکر وزیروں تک کو صدر، وزیراعظم اور وزیر ہی کہہ کر پکارا۔ایک ہم ہی تھے جو یا تو ذکر کرتے ہوئے ان کا نام بغیر منصب کے لیتے یا غیر آئینی کا لاحقہ استعمال کرتے تھے۔(لیکن نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے)۔اس شخص کا انتخاب میں کھڑا ہونا اور حلقے کے مجموعی ووٹوں سے زیادہ ووٹ لے کر جیتنا ہی جگ ہنسائی کے لیئے کافی تھا۔لیکن مملکت خداداد کو اندھیر نگری میں بدلنے کے بعد تو چوپٹ راجہ ہی راج کرسکتا ہے۔انٹریو پر ہنسنے کی وجہ شوکت عزیز کا پرویز مشرف کے لیئے یہ مشورہ تھا کہ سیاست سب کے لیئے نہیں ہوتی اور یہ کہ 'سابق صدر' کا سیاست میں آنے کا فیصلہ اپنا ہے۔ملاحظہ فرمایا 'من ترا حاجی بگویم' والی بات ہوئی کہ میں تجھے سابق صدر کہوں تو مجھے سابق وزیراعظم کہہ۔۔قہقہہ تو ہمارا اسوقت نکلا جب ہم نے یہ پڑھا کہ ان پر ملک سے فرار ہونے کا

الزام غلط ہے کیونکہ انکا گھر بار شروع سے ہی بیرونِ ملک ہے۔ظاہر ہے وہ تو کمانے کھانے پاکستان آئے تھے۔کمایا بھی کھایا بھی جو کچھ ہاتھ لگا وہ لوٹا بھی اور سینے پر اسٹیل مل کا غم لیکر 'سابق صدر' کی اجازت اور آشیر باد سے تمام اثاثے بشمول غیر ملکی تحفے تحائف سمیٹ کر فرار ہونے کی بجائے سیکیورٹی گارڈز کی حفاظت میں روانہ ہو گئے۔بینکر تو تھے ہی اس لیئے تمام کالی کمائی کا ایسا انتظام کیا کہ پکڑ میں نہ آ سکے۔کالی کمائی کو سفید کرنے کے لیئے دونوں 'سابقین' نے لیکچرر بننے کا ایسا انتظام کیا کہ کوئی لیکچر سنے یا نہ سنے لیکچر فیس کی مد میں ایک جیب سے کالی کمائی نکال کر دوسری جیب میں اس طرح ڈالی جائے کہ وہ سفید ہو جائے۔عقل کی داد دینی پڑتی ہے کسی بزنس کے کرنے میں دال آٹے کے بھاؤ کا ہی پتہ نہیں لگتا بلکہ گیہوں چینی کا حساب بھی گلے پڑ جاتا ہے۔گیہوں چینی پر یاد آیا کہ پاکستان سے سستا گیہوں ایکسپورٹ کرنے کے بعد مہنگا امپورٹ کرنے پر کافی تھوتھو اس لیئے ہوئی تھی کہ نہ کسی نے گیہوں باہر جاتے دیکھا نہ آتے دیکھا۔دروغ بر گردن راوی۔سنا ہے یہ سب کاغذات پر ہوا تھا۔ع

آئے بھی وہ گئے بھی وہ، ختم فسانہ ہو گیا

بس یہاں فرق یہ ہے کہ پہلے گیہوں گیا پھر آیا اور اس آنے جانے کے بعد بھی فسانہ ختم نہیں ہوا بلکہ جو نقصان ہوا وہ اس غریب قوم کو سہنا پڑا۔دوسرا نقصان یہ ہوا کہ موصوف آنے والے حکمرانوں کو ایک نئی راہ دکھا گیا۔اب خوف ہے کہ ہماری دوسری اجناس مثلاً چینی، چاول، نمک اور کوئلہ بھی باہر جانے اور پھر آنے میں نہ لگ جائے۔یہاں وہ لطیفہ صادق آتا ہے جس میں ایک ایسے شخص کا ذکر ہے جس کا اپنے باپ کے انتقال پر رونا دھونا بند ہی نہیں ہو رہا تھا۔لوگ حیرت کر رہے تھے کہ آج کے دور میں بھی ایسوں کی کمی نہیں جو اپنے بوڑھے باپ کا اتنا غم کرتے ہیں۔وہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف کو باپ کے مرنے کا نہیں بلکہ یہ غم تھا کہ موت نے گھر دیکھ لیا ہے۔ہاں تو انٹرویو پر ہنستے ہنستے ایک لمحے کو ہماری سٹی اس وقت گم ہو گئی جب یہ پڑھا کہ موصوف پاکستان آنا چاہتے ہیں۔آنے تک تو ٹھیک ہے کہ انٹرپول کی خدمت حاصل کرنے سے ہم لوگ بچ جائیں گے لیکن یہ فرمانا کہ وہ پہلے کی طرح ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، ہمیں دہلانے کے لیئے کافی ہے۔بس یہ کہہ سکتے ہیں ''بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا''۔انٹرویو میں موصوف نے اپنے ایک حمائتی کا ذکر

کرتے ہوئے کہا کہ چودھری شجاعت لندن آتے جاتے ہیں اور انہوں نے ہمیشہ موصوف کی حمائت کی ہے۔ اس پر ہمیں اس لیئے اعتراض نہیں کہ اس بیان سے ہمیں اپنے اس مضمون کو عنوان مل گیا۔جو کچھ یوں ہے۔ع

کند ہم جنس بہ ہم جنس پرواز

کبوتر بہ کبوتر۔باز بہ باز

انٹرویو میں یہ اعتراف بھی دلچسپ ہے کہ ملنے والے تحفے تحائف میں زیادہ اندرون ملک سے ملے تھے۔شائد یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اندرون ملک ملے ہوئے تحفے ذاتی ملکیت ہوتے ہیں اس لیئے وہ خزانے میں کیوں جمع کرائیں۔جبکہ ڈیڑھ سو تحائف وہ خزانے میں جمع کرا چکے ہیں۔یہ وضاحت نہیں کی کہ لے کتنے گئے تھے۔ہاں یہ اقرار ضرور کیا کہ کچھ مہنگے گفٹ ضرور لے گیا تھا (ہوسکتا ہے شگون کے طور پر)۔شائد اس ڈیڑھ سو تحائف میں اجرک۔ٹوپی اور کلاہ وغیرہ رہے ہوں جو انہوں نے بوجھ سمجھ کر خزانے پر ڈالدیا ہو۔انٹرویو میں ایک بات خوفناک بھی ہے کہ وہ کچھ دوست ممالک کی بلا معاوضہ مدد کر رہے ہیں۔خوفناک بات یہ ہے کہ دوست ممالک کا نام نہیں بتایا تو ہم انہیں ہوشیار کیسے کریں گے۔بس دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ انہیں اپنی امان میں رکھے اور شوکت ہی نہیں پرویز مشرف سے بھی محفوظ رکھے۔ان ممالک میں امریکہ انگلینڈ تو ہو نہیں سکتے کہ دونوں ہوشیار ہیں اور گرتی ہوئی دیوار کو دھکا دینے میں ماہر۔بس یہ تو مسلمان ملکوں کا وتیرہ ہے کہ اڑتے تیر کو پکڑنے بیٹھ جاتے ہیں۔۔اللہ خیر کرے

۵/اگست ۲۰۰۹ء

سوری جسونت سنگھ

تقسیم ہند سے پہلے قائداعظمؒ نے سکھوں کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش تو بہت کی ۔لیکن ماسٹر تارا سنگھ کو سمجھ نہ آئی۔ہاں نچلی ذات کے ایک رہنما 'جناب منڈل' نے مسلم لیگ کا ساتھ ضرور دیا یہ اور بات کہ قائد کے بعد ہمارے حکومتی اراکین نے (ہمارے لیڈر نہیں، کیونکہ ہمارے لیڈروں کا اختیار تو غلام محمد اینڈ کمپنی نے ہائی جیک کرلیا تھا) قائد کی پالیسیوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے جناب منڈل کو بددل کردیا ورنہ وہ بھی ابوالکلام آزاد۔فخرالدین علی احمد یا ڈاکٹر عبدالکلام کی طرح ہمارا صدر یا اسپیکر بننے کے کام آتے ۔ بھارتی خوش قسمت تھے کہ گاندھی کے بعد انہیں نہرو کے علاوہ بھی کئی اور لیڈر ہی نہیں ملے بلکہ کچھ مسلمان شو بوائیز (Show boys) بھی ہاتھ آئے جنہیں بھارت نے خوب خوب استعمال کیا۔ہم بدقسمت رہے کہ قائد اور لیاقت علی خان کے بعد ہی ہمارے جینوئن لیڈر مثلاً خواجہ ناظم الدین اور نشتر جیسے رہنما بیدخل ہو گئے ۔ پاکستان کو ایک حکومتی ٹولہ میسر آ گیا۔جو بھیس بدل بدل کر آج تک حکومت کر رہا ہے۔شروع شروع میں اتنا تو خیال رکھا گیا کہ فرنٹ لائن پر کبھی سہروردی کو تو کبھی چندریگر کو رکھا لیکن بعد میں یہ تکلف بھی ختم ہوا اور اسکندر مرزا کے بعد پس پردہ اداکار دھڑلے سے سامنے آنا شروع ہوگئے ۔کبھی آئین توڑا تو کبھی لپیٹ کر رکھ دیا۔کبھی نافظ کردیا اگر کوئی رکاوٹ پیش آئی تو نیا آئین بنالیا پھر بھی مشکل پڑی تو ترامیم کر ڈالیں اور سارے کام آئین کے تحت ہی ہوتے رہے۔ایک حکمران کو کچھ ممبروں کی کمی پڑی تو آئین میں فلور کراسنگ کی شق کو چند دنوں کے لیئے معطل کیا۔نفری پوری ہوگئی تو وہی شق بحال کردی کہ اب آ تو گئے ہو جانہیں سکتے۔چلو شکر ہے ہر کام آئین کے ہی تحت ہوتا ہے۔ہماری قوم غیر آئینی اقدامات سے بچی ہوئی ہے۔سنا ہے (واللہ اعلم) کہ اگر آئین بھی توڑنا ہو تو آئین کے تحت ہی توڑا جاتا ہے اور نئی حکومت پچھلے غاصب کو عزت واحترام سے رخصت کرتی ہے کہ آخر ایک دن انہیں بھی تو جانا ہے۔ویسے بھی آخرت کا خیال تو پیش

نظر ہونا ہی چاہئے ۔یہ ساری باتیں ذہن میں اس لیئے آ گئیں کہ ہم جناب جسونت سنگھ کے نام سے دھوکہ کھا گئے اور انہیں تارا سنگھ کی طرح سکھ سمجھ بیٹھے۔اور سمجھنا بھی چاہیئے کہ جس ماسٹر تارا سنگھ نے قائداعظم کی بات نہ مانی اور اتنی بڑی غارت گری کا سبب بنا وہ بعد میں یہ ماننے پر مجبور ہوا کہ اس سے غلطی ہوئی تھی کہ اس نے قائد کی پیشکش کو نہیں اپنایا اور جن ہندوؤں کی خاطر سکھوں اور مسلمانوں کے خون کا ذمہ دار ٹھہرا انہوں نے ہی گولڈن ٹمپل کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور سینکڑوں سکھوں کو بھی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔اس کے برعکس پاکستان میں سکھوں کی عبادت گاہیں محفوظ ہیں۔تارا سنگھ کے پچھتاوے کو سکھوں سے منسوب حماقتوں میں سے ایک گردانا جاتا ہے کہ یہ کرتے پہلے ہیں سوچتے بعد میں ہیں۔اگر پہلے سوچ لیتے تو اپنا نقصان بھی نہ کرتے اور پاکستان بھی ایک بڑے نقصان سے بچ جاتا۔ماؤنٹ بیٹن اور ریڈکلف کی سازشیں بھی ناکام ہوتیں۔باسٹھ سال کے بعد جسونت سنگھ کو قائد میں خوبیاں نظر آئیں تو ہم اس دیر کی وجہ سے انہیں سکھ سمجھ بیٹھے کہ انہیں صحیح بات کا ادراک ذرا دیر سے ہی ہوتا ہے۔بہرحال دیر آئد درست آئد۔ہمیں خوشی ہے کہ جسونت سنگھ نے قائد پر کتاب لکھ کر ہمیں شکریئے کا موقع فراہم کیا ہے۔پھر بھی ہمارا خیال ہے اس پر کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم تعریف کرنے بیٹھ جائیں اور بعد میں معلوم ہو کہ یہ تو شکر میں لپٹی کڑوی گولی تھی۔پھر بھی اس بات سے ڈھارس ہوتی ہے کہ جناب جسونت سنگھ کو کتاب لکھنے کی پاداش میں بی جے پی سے ہاتھ دھونا پڑے۔مگر کیا معلوم کل کلاں کو کیا ہو۔بھارت کے معاملے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہی ہے (It is too early to say) ہوسکتا ہے کل یہ بیان آ جائے کہ ہم نے تو جسونت کو جناح کے بارے میں کتاب لکھنے اور انکی تعریف کرنے پر نہیں بلکہ اس لیئے نکالا ہے کہ انہوں نے جناح کو دیئے گئے بلبل ہند سروجنی نائڈو کے ٹائیٹل 'The Ambassador of Hindu Muslim Unity'' کو گوکھلے سے منسوب کردیا ہے۔ہم اپنی اس نادانی پر شرمسار ہیں کہ غلطی سے جناب جسونت سنگھ کو سکھ سمجھ بیٹھے جس کے لیئے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں۔'Sorry Jaswant Singh' !! ۔اس کے علاوہ ہم پاکستانیوں کو احتیاط سے کام لیتے ہوئے بھارتیوں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی بجائے۔جناب جسونت سنگھ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے اور انہیں پاکستانی شہریت کی آفر کرنی چاہیئے ۔اگر ہندوستان چاہے تو بدلے میں ہم

دس بیس ایسے پاکستانی دے سکتے ہیں جنہیں قائداعظمؒ ، پاکستان ،ڈاکٹر قدیر خان اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ایک تو نام نہاد مورخ ہیں جن کا کہنا ہے کہ وہ ۴۷ء میں ہوتے تو پاکستان کے خلاف ووٹ دیتے۔ایک یونیورسٹی کے فزکس کے لیکچرر ہیں۔بیس تیس سال سے کورس پڑھاتے پڑھاتے اپنے آپ کو سائنٹسٹ سمجھنے لگے ہیں اس لیئے انہیں پاکستان کے ایٹم بم پر اعتراض ہے اور انہیں یہ خدشہ لاحق ہے کہ یہ غلط ہاتھوں میں جا سکتا ہے۔شائد موصوف ایٹم بم کو ماؤزر یا ٹی ٹی سمجھتے ہیں کہ کسی کے بھی ہاتھ لگ سکتا ہے۔کچھ اور بھی ہیں جنہیں وا ہگہ سرحد پر دیئے جلانے کا شوق ہے۔اور چند ایک ہندوستانی فلموں کے سحر میں کچھ اسطرح گرفتار ہیں کہ انہیں پاکستان کی چربہ سازی تو نظر آجاتی ہے لیکن بھارت میں کی گئی ہماری فلموں اور گانوں کی نقالی نظر نہیں آتی۔ہندوستان میں آپ کسی بھی گھر میں پاکستانی چینلز نہیں دیکھ سکتے لیکن اس میں تعجب کیسا کہ پاکستانی چینلز اکثر پاکستانی گھروں میں بھی نظر نہیں آتے بلکہ اب تو پاکستانی فلمیں بھی پاکستانی سنیما گھروں میں نہیں لگتیں۔امید ہے اگر بھارت راضی ہو گیا تو بی جی پی کو ایک جسونت سنگھ کے بدلے کئی دوسرے مل جائیں گے اور پھر بی جی پی کو دشمن رکھنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔۔کیونکہ یہ جس تھالی میں کھاتے ہیں اس ہی میں چھید کرنے کے عادی ہیں۔لہٰذا امید کامل ہے کہ ہماری تھالی محفوظ ہو جائے گی۔۔

۲۰/اگست ۲۰۰۹ء

بحران ہی بحران

میڈیکل سائینس میں بالخصوص دوائیوں کے حوالے سے دو الفاظ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔سنرجزم (synergism) اور پوٹینسی ایشن (Potentiation)۔عام قاری کی دلچسپی کے لیئے اتنا بتانا کافی ہے کہ کبھی کبھی ڈاکٹر کو دو ایسی دوائیں تجویز کرنا پڑتی ہیں، جن کا اثر تو ایک جیسا ہوتا ہے۔لیکن دونوں مل کر دہرا فائدہ دیتی ہیں۔یعنی ایک جمع ایک برابر دو کے۔اس سے مقصد دونوں دواؤں سے پورا فائدہ اٹھانا ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی ان کے مضر اثرات سے بچنا بھی ہوتا ہے جو کہ کبھی کبھی ایک ہی دوا کی ڈبل مقدار کے لینے سے ہو سکتے ہیں۔اس کے مقابلے میں پوٹینسی ایشن سے مراد وہ کیفیت ہے جس میں دو دوائیں مل کر ڈبل سے زیادہ اثر کرتی ہیں۔یعنی ایک جمع ایک کا اثر دو سے زیادہ۔ان دواؤں کی خاصیت ہوتی ہے کہ یہ مل کر زیادہ اثر دکھاتی ہیں۔چونکہ دواؤں کے حوالے سے ہمیں علم تھا کہ دو چیزیں مل کر کبھی دوہرا اثر کرتی ہیں اور کبھی کبھی دو دوائیں مل کر زیادہ موثر ہو جاتی ہیں۔اس لیئے ہمیں ڈاکٹر شیرافگن کی باتوں پر کبھی تعجب نہیں ہوتا جب وہ فرمایا کرتے تھے کہ آئین کی فلاں شق کو فلاں شق کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے یہ ہی مطلب نکلتا ہے۔غور فرمایا آپ نے!! اگر دونوں شقوں کو علیحدہ علیحدہ پڑھیں گے تو بات مخالفین کے حق میں چلی جائے گی لیکن ملا کر پڑھنے سے بات اپنے مطلب کی ہو جائے گی۔ہوسکتا ہے دوسروں کو ڈاکٹر صاحب کی بات ماننے میں تامل ہو لیکن ہم اسے پوٹینسی ایشن کا کمال سمجھتے تھے کہ جو چیز میڈیسن میں ہوسکتی ہے وہ آئین میں کیوں نہیں ہوسکتی جبکہ بے چارے ڈاکٹر صاحب بات میں زور پیدا کرنے کے لیئے 'جان' تک کا زور لگا کر آئین کو 'ہا ہین' کہنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔اور واقعی یہ ان ہی کا کمال تھا کہ کبھی کسی شق کو علیحدہ نہیں پڑھا۔اور ہمیشہ دو چار شقوں کو ملا کر پڑھنے سے ثابت کر دیا کہ وردی میں ملبوس صدر کو دس بیس بار منتخب کرنا ہا ہین (آئین) کے عین مطابق ہے بات تو ڈاکٹر صاحب بالکل ٹھیک ہی کرتے تھے کہ جب سب کچھ آئین کے مطابق ہی کرنا ہے تو

پھر نئے لوگوں کو امتحان میں ڈالنے سے بہتر ہے کہ سسٹم کو چلنے دیا جائے۔ نیا آنے والا بھی تو اس ہی آئین سے مطلب براری کرے گا۔ تو موجودہ سیٹ اپ کیا برا ہے؟ ہمارا آئین گرچہ تحریری ہے لیکن اس میں انگلینڈ کہ اَن رِٹن کانسٹی ٹیوشن (Un written Constitution) سے زیادہ لچک ہے۔ اسے آپ جتنا چاہیں توڑ مڑور سکتے ہیں۔ جتنا چاہے کھینچ سکتے ہیں۔ یہ بیک وقت آرٹیکل چھ کے تحت کارروائی کی اجازت دیتا بھی ہے اور نہیں بھی دیتا۔ اگر آپ حزب اختلاف میں ہیں تو اجازت ہے بسم اللہ۔ کس نے روکا ہے؟۔ اور اقتدار میں ہیں تو آرٹیکل چھ کی شق ایک کو دو کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو غاصب کا ساتھ دینے والے دس بیس ہزار کو شامل کرنا ہوگا کہ آئین توڑنا اکیلے بندے کے بس کا روگ نہیں۔ تو پھر صرف اکیلے بندے کا ٹرائیل کیسا؟ اس کے علاوہ بین السطور بھی پڑھیئے تو واضع ہو جائے گا کہ اس سے پہلے اس ہی قسم کے گناہوں کے مرتکب لوگوں کا ٹرائیل کرنا پڑے گا۔ بس پھر نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا کو زحمت دی جائے گی۔ ہاں استاد حامد علی خان کے ساتھ 'لاگی رے۔۔' گانے کی اجازت ہے! (ایک کیسٹ میں مشرف نے یہ کمال کر کے دکھایا ہے۔ اور حامد علی خان سے داد بھی پائی ہے)۔ سینر جزم کا عملی مظاہرہ تو اس وقت ہوا جب اچانک چینی کی قیمت آسمان سے بات کرنے لگی اور جناب وٹو صاحب نے مل مالکان کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ انٹرنیشل مارکٹ میں ریٹ بڑھیں گے تو پھر اس کا اثر لازمی طور پر یہاں بھی ہوگا۔ دیکھا آپ نے پاکستان میں موجود چینی کے اسٹاک پر آئندہ درآمد کی جانے والی چینی کی قیمت کا سنرجیٹک افیکٹ (synergetic effect)۔ ہماری چینی کی موجودہ قیمت ۴۰ سے بڑھ کر انٹرنیشنل کے مدمقابل آ گئی۔ کہتے ہیں کہ مریض کو موت دکھا دی جائے تو بخار پر بھی راضی ہو جاتا ہے۔ ہمارے وزیر خوراک کو بھی چاہیئے کہ شوکت عزیز کے پیدا کیئے ہوئے آٹے کے بحران کا حوالہ دینا شروع کر دیں انشا اللہ عوام ۶۵ روپے فی کلو پر راضی ہو جائیں گے۔ پھر لوگ چینی کے حصول کے چکر میں قیمت اور کوالٹی دونوں کو بھول جائیں گے۔ جیسا کہ آٹے کی مد میں ہو رہا ہے۔ ایسے میں کسی اور وزیر نے آٹے، چینی کے بعد گھی اور تیل کا بحران کھڑا کر دیا تو لوگ آٹے کو چینی اور چین کو گھی کے ساتھ ملا کر دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے۔ کھاد کا بحران تو سر پر کھڑا ہے اب اگر دال چاول بھی زد میں آ گئے تو عوام کو دال آٹے کے بھاؤ کا صحیح پتہ لگ جائے گا۔ پھر شائد عقل آ جائے اور وہ تیل بھی دیکھنے لگیں اور تیل

کی دھار بھی۔ مہنگائی کوئی بحران نہیں۔ بحران تو اجناس کی امپورٹ کا دوسرا نام ہے۔ گندم کی طرح پہلے سستی ایکسپورٹ اور پھر مہنگی امپورٹ ہو تو مرضی ہے 'سونے پہ سہاگہ' کہیں یا 'کڑوا وہ بھی نیم چڑھا' بجلی اور پانی سے اتنا ڈرایا جا چکا ہے کہ اب آنسو بہاتے بھی ڈرتے ہیں کہ ڈی ہائڈریشن (Dehydration) نہ ہو جائے۔ کمال تو یہ ہے کہ حزب اقتدار کی سنو تو لگتا ہے ملک میں کوئی بحران نہیں ہے۔ مہنگائی تو ہے ہی نہیں۔ بس ذرا معیار زندگی بلند ہو گیا ہے۔ حزب اختلاف کی سنو تو بحران ہی بحران ہے۔ اس لیئے ہم نے تو اب آئین کی شقوں کی طرح دونوں کے بیانات کو ملا کر پڑھنا شروع کر دیا ہے اور واقعی نتیجتاً کہنے لگے ہیں ۔ع

؎ اف نہ کریں گے، لب سی لیں گے آنسو پی لیں گے
غم سے اب گھبرانا کیسا ؟ غم سو بار ملا

۲۲/اگست ۲۰۰۹

یادِ ماضی

جب بھی ماضی کا ذکر ہو تو نہ جانے کیوں یہ شعر زبان پر آ جاتا ہے ع

یادِ ماضی، عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ویسے ہم اس شعر سے بچنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ اور اگر سہواً بھی یہ زبان پر آ جاتا ہے تو فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں کہ کہیں قبولیت کا وقت نہ ہو اور حافظہ جاتا رہے۔ اور پھر صحیح معنوں میں عذاب شروع ہو جائے۔ اپنے لیئے بھی اور لواحقین کے لیئے بھی! اس کے علاوہ ایک پرانا گانا بھی ہے جس کی موسیقی ، گلوکاری اور شاعری ہمیں بہت پسند ہے لیکن اس کے ایک مکھڑے کی وجہ سے ہم اس سے پرہیز کرتے ہیں ۔ پرہیز کرتے ہیں لیکن سننے سے باز بھی نہیں آتے بالکل اس ہی طرح جیسے شوگر کے مریض میٹھا کھانے سے نہیں بچ پاتے۔ مکھڑا ہے زندگی دینے والے سن، تیری دنیا سے جی بھر گیا ہمیں اس میں سراسر ناشکری نظر آتی ہے اس لیئے لاحول پڑھ پڑھ کر سنتے ہیں۔ گانے کا اتنا مسئلہ نہیں لیکن ماضی کے حوالے سے یہ شعر تو مسلسل جان کو لگا رہتا ہے کہ عمر کے اس حصے میں یادش بخیر (nostalgia) ہی ایک سہارا ہے اور کہیں حافظہ ساتھ چھوڑ گیا تو 'تیری دنیا سے جی بھر گیا' والی کیفیت ہو سکتی ہے۔ گانے کو تو چھوڑیئے لیکن آج کل یہ شعر کچھ زیادہ ہی یاد آ رہا ہے کہ تقریباً روزانہ ہی ٹی وی پروگراموں میں کوئی نہ کوئی لال بجھکڑ ماضی پر مٹی ڈالنے کا مشورہ دیتا نظر آتا۔ جب سے آئین کے آرٹیکل چھ کا پتھر عدالت نے پارلیمنٹ کو تھمایا ہے۔ ہر آمریت کا ساتھ دینے والے کو اپنے سر کی فکر پڑ گئی ہے۔ اور وہ بڑی اچھی اچھی باتیں کرنے لگے ہیں کہ بھئی گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ ؟۔۔ اسلام بھی درگذر سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے!!۔ بدلے سے معاف کرنا افضل ہے!! جمہوریت سب سے اچھا انتقام ہے (ہمیں گمان ہے کہ اگر خدانخواستہ پھر کسی غاصب نے قبضہ کیا تو

'اسلام وعلیکم ہم وطنو' کے بعد اس کا پہلا جملہ ہوگا کہ ''جمہوریت کے خلاف سب سے بہترین انتقام آمریت ہے''

کچھ تو ایسے بھی ہیں جو مشرف کا ٹرائیل تو چاہتے ہیں لیکن اس سے پہلے آنے والے آمروں کے ٹرائیل کے بعد۔ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں زیادہ آگے جانے کی ضرورت نہیں بس ضیا الحق تک ٹھیک ہے۔ چند ایک کا خیال ہے کہ احتساب شروع ہوا تو پینڈورا بکس کھل جائے گا۔ دیکھا کتنے محبِّ وطن ہیں۔۔ آمروں نے آئین توڑتے وقت ایسا کچھ نہیں سوچا۔ بس توڑ دیا۔ یہ بے چارے پینڈورا بکس کی فکر میں پڑ گئے ہیں۔ ارے ایک بار کھولدو جان چھوٹے گی۔ مشاہد جیسے سابق وزرا کا بھی خیال ہے کہ ہمیں آگے کی طرف دیکھنا چاہیئے۔ ماضی کو چھوڑو۔ جو ہوا سو ہوا۔ کیوں کھایا پیا اگلوانے کے چکر میں ہو۔ ارے بھئی آگے کی طرف دیکھو۔ ان خیالات کی وجہ سے ہمیں یقین ہے اگر سب نے آگے کی طرف دیکھنا شروع کیا تو مندرجہ صورت حال کے لیئے تیار رہنا چاہیئے۔

(۱) ہوم ورک نہ کر کے آنے والا طالب علم کہے گا ''جناب آگے کی طرف دیکھیئے۔ رات گئی بات گئی''

(۲) قتل عمد کا مجرم کہے گا۔ جناب کیا گڑے مردے اکھاڑ رہے ہو۔ اور اگر اتنا ہی شوق ہے تو پہلے قابیل پر بعد از مرگ مقدمہ چلاؤ کہ قاتلوں کا سرغنہ تو وہی تھا۔

(۳) ۱۰۷ اور ۱۱۷ کے تحت گرفتار ہونے والا بلوائی کہے گا یہ کام اکیلے کا تو تھا نہیں ہزار پانچ سو تو رہے ہونگے پہلے انہیں لاؤ پھر مجھے ہاتھ لگانا۔

(۴) یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر آمر کا آئین توڑنا غلط ہے تو پھر اس کا ہر اقدام غلط۔۔ چلو مان لیا کہ سب کچھ الٹا بھی دیا تو بنگلہ دیش کو مشرقی پاکستان کیسے بناؤ گے۔ اس لیئے مٹی پاؤ۔ ہمارے خیال سے ماضی بھول کر آگے کی طرف دیکھنے کا ایک فائدہ بھی ہے۔ نہ پولس کی ضرورت نہ تھانے کی۔ نہ وکیل کی حاجت نہ عدلیہ کی۔ ہر طرف چین ہی چین ہوگا۔ قتل کر دیا چلو مٹی ڈالو۔ ڈاکہ پڑ گیا چلو ہٹاؤ۔ زمین پر قبضہ کر لیا۔ چھوڑو اس کی قسمت۔۔۔ سب کچھ لوٹ لیا۔ معاف کر دو یہ ہی افضل ہے۔۔۔ چینی غائب۔ جا پانی پی کر سو جا۔ صبر کر۔۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔۔ گندم غائب۔ تو کیا ہوا۔ اللہ نے تو پہلے ہی منع کیا تھا کہ قریب نہ جانا۔ نہیں مانے تو

وہ خود غائب ہوگئی۔ دو چار سابق وزرا بشمول شیخ رشید اور شیر افگن کی یہ بات بڑی اچھی لگتی ہے کہ قوم کو مشرف کے ٹرائیل سے دلچسپی نہیں وہ تو روٹی کپڑا مکان چاہتے ہیں۔ یہ وہی وزرا ہیں جو کہا کرتے تھے عوام کو عدلیہ کی بحالی نہیں انکے مسائل کا حل چاہیئے۔ گویا کہ مسئلے کا حل بھی کوئی اور ہے۔

؎ گویا کہ قیامت کا ابھی دن ہے کوئی اور

عوام کو انتظار ہے اس وقت کا جب حکمران مشورے دینے لگیں کہ روٹی نہیں ملتی تو کیک کھاؤ۔ چینی نہیں ہے شہد سے کام چلاؤ۔ پھر انشا اللہ ماضی کو بھلانے کا مشورہ دینے والوں کو ماضی سے سبق مل جائے گا۔ انقلاب فرانس طوفان نوحؑ سے پہلے کی بات تو نہیں کہ عوام کو یاد نہ ہو۔ بس بھس میں چنگاری لگنے کی دیر ہے۔۔

۲۵/اگست ۲۰۰۹ء

کریڈے بلیٹی (credibility)

قائداعظمؒ کے بعد ہماری دانست میں دو ایسے اشخاص پاکستان کی تاریخ میں داخل ہوئے ہیں جن سے محبت کرنے والے یا جن کی عزت و احترام کرنے والے، چاہے کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، سرخ رو ہوئے جبکہ عناد، بغض رکھنے یا مخالفت کرنے والے ذلیل و خوار ہوئے۔ یہ بھی اتفاق ہے ان ذلیل ہونے والوں نے ان دونوں کی تذلیل کرنے کی کوشش میں کوئی کثر نہیں چھوڑی تھی۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب ہیں اور دوسرے چیف جسٹس آف پاکستان جناب افتخار محمد چودھری۔ سچ ہے کہ اللہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت۔ قائداعظم نہ مولوی تھے نہ مولانا۔ نہ پیر نہ سجادہ نشین لیکن آج بھی انہیں ہر شریف اور ذی شعور رحمت اللہ علیہ لکھتا اور کہتا ہے۔ جتنی فاتح خوانی ان کے مزار پر ہوتی ہے وہ اچھے اچھے مولویوں کو نصیب نہیں۔ جتنی قرآن خوانی ان کے مزار پر ہم نے ہوتے دیکھی۔ اتنی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ہم شاہجہاں کے تاج محل پر گئے ہمایوں اور اکبر اور جہانگیر جیسے بادشاہوں کے مقبرے پر گئے مگر وہاں ہزار ہا حاضرین میں اکا دکا کو ہی ہاتھ اٹھاتے دیکھا۔ نہ جانے کیوں اکبر کی قبر پر ہمارے ہاتھ بھی دعا کے لیئے نہیں اٹھے۔ بھارت میں تحریک آزادی کے دوران قائداعظم کی مخالفت اور انہیں کافر گردانے والے دو ایک مولویوں کی قبروں پر جانا ہوا لیکن وہاں بھی افسوس ہوا کہ صورت حال ملکہ نور جہاں کی قبر سے مختلف نہ تھی۔ یعنی ؎ بر مزارِ ما غریباں نے چراغان نے گلے

نے پرِ پروانہ سوزن نے صدائے بلبلے

یہ تو تھا قائد کے مخالفین کا حال۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اور چیف صاحب کے مخالفین کے سربراہ کو رسوا ہوتے تو سب ہی دیکھ رہے ہیں اور ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔ مشرف کا کیا ذکر اس کے چیلوں کا حال بھی سامنے ہے۔ شیخ رشید ہو یا شیر افگن۔ محمد علی درانی ہو یا محمد علی سیف، عبدالقیوم ہو یا پیرزادہ۔ چودھری

برادران ہوں یا شہدا بہاولپور کے صاحبزدگان ان کو پوچھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔فی الحال شائد تفنن طبع کے لیئے اینکر پرسن شیخ رشید کو بلوا لیتے ہیں۔اور یک ممبری پارٹی کا سربراہ اسے اپنے لیئے باعث افتخار سمجھتا ہے۔ع

اغیار کو یہ ناز کہ بدنام کیا ہے
میں خوش ہوں کہ اخبار میں تصویر چھپی ہے

اللہ تعالی کا نظام کچھ ایسا ہے کہ جس نے جتنی ہرزہ سرائی کی تھی اتنا ہی وہ رسوا ہو رہا ہے۔لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے اللہ تعالی دلوں پر مہر لگا دیتا ہے اور عقل سلب ہو جاتی اس ہی لیئے آج بھی کچھ کم عقل پرویز مشرف کو بچانے کے لیئے ہاتھ پیر مار رہے ہیں اور دلدل میں پھنستے جا رہے ہیں۔عجیب وغریب تاویلیں پیش کر رہے ہیں۔مشرف نے نو دس سال حکومت کی تھی اور مال مفت بری طرح لٹایا بھی تھا تو اس کا مراعات یافتہ طبقہ اس کی محبت میں نہیں بلکہ اس خوف میں کہ'' تیرا کیا ہوگا کالیا'' اسے بچانے کے لیئے سازشیں کر رہا ہے۔جیسے ہی اس پر کیس بننا شروع ہوئے اچانک یکے بعد دیگرے انکے ایجنٹ وکیلوں نے الٹی سیدھی حرکتیں شروع کر دیں۔پولس والے کو مارا۔دوسرے دن صحافیوں کی شامت آئی۔ایک دن جج کے کمرے میں توڑ پھوڑ مچائی۔تاکہ وکلاء کی ساکھ کو نقصان پہنچایا جا سکے۔پھر وکیل رکے تو پولس والے شروع ہو گئے۔چند سپاہیوں نے ایک بچی کے ساتھ زیادتی کی اور لاش نالے میں ڈالدی۔پھر چند ایک نے ایک عورت کو اغوا کیا اور ہوٹل میں لے گئے اور مالک ہوٹل نے بھی انکا ساتھ دیا۔ایسے تین چار واقعات کے علاوہ تین چار مسلم لیگ ن کے صوبائی اسمبلی کے ممبران نے بھی نام پیدا کیا۔ایسا لگتا تھا کہ یہ سب کچھ کسی اسکرپٹ کے تحت ہو رہا ہے۔اور اسٹیج صرف ایک ہی صوبے میں لگایا گیا ہے۔ہر ڈرامہ چاہے وکلاء کا ہو یا پولس کا۔یا ممبران اسمبلی کا۔۔کم از کم دو یا تین واقعات پر مبنی تھا۔بیڑیوں میں مقید لوگوں کی برآمدگی کا ڈرامہ بھی کچھ دن چلا۔کم سن لڑکیوں کی شادی بھی ڈھڑا دھڑ ہوئیں اور پھر فیڈ آؤٹ ہو گئیں۔اگر کوائف جمع کیئے جائیں تو محسوس ہوگا یہ سب کچھ کسی سوچے سمجھے طریقے سے وکلاء، پولس، اور صوبائی حکومت کو بدنام کرنے اور اس کی ساکھ ختم کرنے کے لیئے کیا جا رہا ہے۔اس کے لیئے لائحہ عمل کونسا اختیار رہوتا ہے۔حکمت عملی کیا ہوتی ہے۔یہ تو کرتا دھرتا جانیں لیکن اس سارے معاملے میں ٹائمنگ سب سے اہم ہے۔بریگیڈیر امتیاز اور جنرل نصیر اختر کی ایم

کیو ایم کے خلاف کی گئی سازش آنکھیں کھولنے کے لیئے کافی ہے۔جس نے اس محاورے کے معنی ہی بدل دیئے کہ جہاں دھواں ہوتا ہے۔وہاں آگ ضرور ہوتی ہے۔کیسا دھواں اور کیسی آگ۔خود ہی جناح پور کا نقشہ بنایا اور خود ہی قتل اور غارت گیری کا بازار گرم کر کے ہزاروں بے گناہوں کو شہید کر ڈالا اور اب پارسا بن رہے ہیں کہ جانتے ہیں یہاں احتساب تو ہونا نہیں اور ہوا بھی تو پہلے ایوب خان سے شروع کرنا ہوگا۔جنرل آصف نواز سے ہوتے ہوئے بریگیڈیر امتیاز تک پہنچنے میں کئی نصیر اللہ بابر اور جنرل نصیر اختر آڑے آئیں گے۔بہر حال ہمیں امید ہے کہ مشرف کی باقیات اپنی سازش میں ناکام ہوگی اور ہمارے اداروں کی ساکھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔انشا اللہ پرویز مشرف کا ٹرائیل ہوگا اس پر دونوں بڑی پارٹیاں متفق ہیں بس طریقہ کار پر اختلاف ہے اور یہ کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں کیونکہ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔دونوں پارٹیاں چیف جسٹس کی بحالی چاہتی تھیں بس طریقہ کار پر اختلاف تھا اور عوام اختلاف ختم کرانے کے ماہر ہیں۔یہ دنیا دیکھ چکی ہے

۲۵/اگست ۲۰۰۹ء

معاوضہ

ایک چینل سے ایک دلچسپ پروگرام پیش ہوتا ہے جس کا میزبان کسی بھی مشہور شخصیت کا ایک دن کا مہمان ہوتا ہے۔ یہ شخصیت کوئی بھی ہوسکتی ہے فلمی، سیاسی، مذہبی یا ادبی۔ کبھی کبھی یہ میزبان کسی بڑے ادارے کے کسی بڑے افسر کا بھی مہمان ہوتا ہے۔ حاضر اسٹاک حکمران تو خیر ہوتے ہی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی سابق حکمرانوں میں سے بھی کوئی شرفِ میزبانی حاصل کر لیتا ہے۔ اس پروگرام کی انفرادیت یہ ہے کہ پروگرام کا میزبان، مہمان بن کر صاحب خانہ کے ساتھ پورا دن ہی نہیں گذارتا بلکہ صاحب خانہ کے بارے میں کما حقہٗ معلومات حاصل کر کے ناظرین کو پیش بھی کرتا ہے۔ پروگرام کی ایک خصوصیت اسکے میزبان کا انوکھا انداز ہے۔ جب وہ سوالات کرتا ہے تو اس میں بھول پن اتنا نمایاں ہوتا ہے کہ پوچھے جانے والے انسان کو سوال کی چبھن تک محسوس نہیں ہوتی۔ بس یوں سمجھئے کہ ع

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

بات اس شعر سے بھی واضع نہیں ہوئی تو ابھی ہم ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ہم نے اکثر دیکھا کہ سوال میں چھپی ہوئی برچھیوں سے چھیدے جانے کے باوجود لوگ مسکراتے رہتے ہیں۔ بات طویل کرنے سے بہتر ہے کہ یہ مثال پیش کر دی جائے۔ ہوا یہ کہ میزبان ایک مشہور (بدنام) زمانہ اسٹیج و فلمی اداکارہ کے گھر مہمان تھا۔ ایکٹرس کا تعارف یہ ہے کہ عریاں ڈانس پیش کرنے میں ثانی نہیں رکھتی۔ کئی بار اس کے اسٹیج ڈراموں پر چھاپے بھی پڑے اور ڈرامے بین (Bann) بھی ہوئے۔ غیر تصدیق شدہ یہ خبر بھی اسکے کھاتے میں ہے جب ایک چھاپے کے بعد اس کا سر مونڈ وادیا گیا تھا۔ اور اسے زلفوں کے سر ہونے تک بیرون ملک رہنا پڑا تھا۔ واللہ اعلم۔۔ موصوفہ ایک ڈانسنگ اسکول کی مالکہ بھی ہے اور

قوم کی بیٹیوں کی تربیت بھی کر رہی ہے کہ روشن خیال حکمرانوں کی کلچر سے محبت کا تقاضہ بھی یہ ہی ہے۔ خیر دن بھر اداکارہ کے ساتھ وقت گذارنے اور اس کی مصروفیات سے واقف ہونے کے بعد ٹی وی کے میزبان نے اداکارہ کی امارت سے متاثر ہوتے ہوئے بڑے بھول پن سے پوچھا ''میڈم! کیا یہ کروڑوں کی کوٹھی، شاندار کاروں کی ریل پیل اور اتنا ہائی اسٹنڈرڈ آف لِونگ (High standard of living)، صرف آپ کی ڈانس کی کمائی کے مرہونِ منت ہیں''۔ سوال کی کاٹ اور اس میں چھپے طنز کو ہم نے محسوس تو کیا لیکن جواب میں رقاصہ کے لبوں پر رقصاں مسکراہٹ دیکھ کر ہمارے حلق میں کچھ ایسی کڑواہٹ محسوس ہوئی کہ چینل بدلنا پڑا آج یہ انٹرویو ہمیں اس لیئے یاد آیا کہ کچھ ہی دیر پہلے ایک چھوٹی سی خبر نظروں سی گذری جس کے مطابق پرویز مشرف کو فی لیکچر دو سے ڈھائی ہزار ڈالرز ملتے ہیں۔ ماشا اللہ۔ اتنی قیمت ایک ایسے انسان کے لیکچرز کی ہے۔ جس نے حکومت اپنی حکمت عملی سے نہیں کی بلکہ فوج کے بل بوتے پر کی۔ وردی کے اترتے ہی ساری کراری دھری رہ گئی۔ ایک ایسے فوجی کے لیکچرز کی اتنی قیمت جو کہ ناکام ترین جنرل تھا۔ جس کو جنرل کی حیثیت سے صرف ایک جنگ لڑنا پڑی تو اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ رونا تو یہ ہے یہ جنگ تھوپی نہیں گئی تھی بلکہ موصوف نے خود شروع کی تھی۔ پھر بھی جیت نہ سکا۔ اگر ایک ناکام شخص کے لیکچرز کی اتنی قیمت ہے تو کسی کامیاب سیاستدان یا کسی کامیاب جنرل کا معاوضہ اس سے کہیں زیادہ ہونا چاہیئے۔ مشرف نے لکھا تھا کہ ہجرت کے وقت سامان سفر میں ایک بکس بھی تھا جس کی حفاظت اس کے والد اپنی جان سے زیادہ کر رہے تھے۔ اس بکس میں سات لاکھ روپے تھے۔ اگر ان روپوں میں جنرل کی دوران ملازمت ساری تنخواہ بشمول صدارتی تنخواہ اور الاؤنس کے جمع کر دیئے جائیں تب بھی اس کی موجودہ جائداد کی قیمت نہیں چکائی جاسکتی۔ یہ ہم اس لیئے کہہ رہے ہیں کہ ہماری اپنی تنخواہ بھی کچھ کم نہ تھی اور ہمارے گوشوارے کے مطابق ہمارے پاس کم از کم مکان کے علاوہ دس لاکھ کی بچت ہونی چاہیئے۔ جبکہ ہمارا ابھی سے یہ حال ہے جو سکندر کا دنیا سے جاتے وقت تھا۔ ہمیں اس وقت ایک اینکر مبشر لقمان کا یہ گلہ یاد آرہا ہے جو اس نے فیصل صالح حیات سے کیا تھا کہ میں بھی ایک فوجی کا بیٹا ہوں اور میرے گھر میں جو ریل پیل ہے وہ میں ہی جانتا ہوں پھر یہ ہمایوں اختر عبدالرحمن کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی؟ فیصل صالح کے پاس اس کا کیا جواب! یہ کہہ کر

جان چھڑائی کہ یہ آپ ان ہی سے پوچھئے۔ ویسے ٹی وی کے وہ میزبان جو ایک دن کے لیئے مہمان بنتے رہتے ہیں اگر مشرف کے مہمان بنیں تو بھولپن میں رقاصہ سے پوچھے گئے سوال کی طرح پوچھ سکتے ہیں۔ 'جنرل صاحب! آپ کو جن لیکچر کے ڈھائی ہزار ڈالر ملتے ہیں، ان میں ایسی کیا انوکھی بات ہوتی ہے۔ کہیں یہ ان پاکستانیوں کا معاوضہ تو نہیں جن کو آپ نے امریکہ کے حوالے کیا تھا۔ کیونکہ فی لیکچر یہ پیسے بہت زیادہ ہیں۔ لیکن فی گمشدہ پاکستانی بہت کم ہیں'۔۔ ہمیں یقین ہے مشرف کے چہرے پر بھی وہی مسکراہٹ رقصاں ہوگی جو رقاصہ کے چہرے پر دیکھ کر ہمیں چینل بدلنا پڑا تھا۔

۲۷/اگست ۲۰۰۹ء

جام اٹھانے سے حیا آتی ہے

ہمارے ایک دوست تھے تو اکلوتی بیوی کے شوہر لیکن جب کبھی دوستوں کی محفل میں بیوی کا ذکر آجاتا تو اسکا ذکر 'ہماری پہلی بیوی' کہہ کر ہی کرتے تھے۔ استدلال یہ ہی ہوتا تھا کہ واقعتاً وہ ہے ہی پہلی۔ دوسری نہیں۔ تو پھر اسے صرف بیوی کیوں کہوں؟ ان کی بات ہمارے دل کو ایسی لگی کہ ہم ایوب خان کو ہی پہلا مستند ڈکٹیٹر کہتے ہیں گرچہ ہمارا استدلال ذرا مختلف ہے۔ ہمارا خیال ہے غلام محمد اور اسکندر مرزا بھی ڈکٹیٹر سے کم تو نہ تھے لیکن انہوں نے اوڑھنی پارلمنٹری فارم (Parliamantary Form) کی اوڑھ رکھی تھی اور باقاعدہ وزیراعظم وغیرہ بھی رکھتے تھے۔ جب کہ ایوب نے تو باقاعدہ آئین کو توڑ تاڑ مارشل لاء نافظ کر دیا۔ خود ساختہ صدر ہی نہیں فیلڈ ماشل بھی بن گیا۔ ایبڈو کے تحت ساری سیاسی پارٹیوں کو بین (bann) کر دیا۔

ملک کے اس سب سے پہلے مستند ڈکٹیٹر ایوب خان نے بعد میں ایک نیا آئین بھی بنایا اور ایک اسمبلی بھی وجود میں آئی جس میں حزب اختلاف بھی تھی۔ بہت مختصر۔ مگر بہت ہی مضبوط۔ جس میں مولوی فرید اور باقی بلوچ جیسے دبنگ ممبران نے جمہوریت کی روایات کو زندہ رکھا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ ایوب خان کے بھائی سردار بہادر خان بھی تھے جو نہ صرف قائد حزب اختلاف تھے بلکہ شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ اسمبلی کے ایک اجلاس میں تو گویا حزب اقتدار کے وزرا کی دم پر پیر ہی رکھ دیا جب انہوں حزب اقتدار کی بنچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ مصرعہ پڑھا۔ ع

ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے، انجامِ گلستاں کیا ہوگا

بڑی لے دے ہوئی اور جیسا کہ حزب اقدار کا وتیرہ ہے کہ جواب ہو نہ ہو۔ دینا ضرور ہے چاہے جواب کتنا ہی بھونڈا کیوں نہ ہو۔ اس میں اس کی قید نہیں کہ جواب دینے والا ایوب خان کا عبدالوحید ہے یا مشرف کا محمد علی

یدرانی یا آج کی فوزیہ ارباب اقتدار۔ بہرحال عبدالوحید نے جواب میں مندرجہ ذیل بھرتی کے دو مصرعے پڑھ کر سارا مزہ کرکرا کر دیا

؎ جب شاخ پہ الو بیٹھے تھے گلشن کی ہوائیں روتی تھیں
اب شاخ پہ بلبل بیٹھے ہیں انجام گلستاں کیا ہوگا

حزب اقتدار نے اس پر خوب خوب بغلیں (ڈیسک) بجائیں لیکن جب طوفان بدتمیزی ٹھہرا تو فقط نو (۹) ممبران کی اسمبلی میں سے کسی نے 'واہ رے بلبل' کہہ کر دوبارہ محفل کو لوٹ لیا۔ اور ان اشعار کی بازگشت ایک عرصے تک گونجتی رہی۔ اس ایک واقعے سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت کی حزب اختلاف کے ذوق کا معیار کیا تھا۔ لیکن حزب اقتدار کا معیار، دورِ مشرفی یا دورِ حاضر سے مختلف نہ تھا کہ اس وقت بھی وزرا جھوٹ بولنے میں محمد علی غلط بیانی سے کم نہ تھے۔ ۹ ممبران کی حزب اختلاف کہاں تک جھوٹ کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوشش کرتی۔ اس ہی لیئے سردار بہادر خان نے اسمبلی میں خاموشی اختیار کر لی۔

ایک سیشن میں جب انہیں بولنے پر آمادہ کیا بھی تو انہوں نے یہ شعر پڑھنے پر کتفا کی۔ ع

؎ جب سے جانا ہے کہ ہیں نا اہل بادہ بکف
اب مجھے جام اٹھانے سے حیا آتی ہے

اور واقعی یہ شعر فی زمانہ اہل دل کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ سب کچھ ویسا ہی ہے کچھ نہیں بدلہ۔ وہی لوٹ کھسوٹ۔ وہی اقربا پروری۔ وہی جھوٹ، فریب، مکاری۔ وہی مال مفت وہی دل بے رحم۔ وہی سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہنا۔ قوم پہلے بھی دھوکہ کھانے کی عادی تھی آج بھی ہے۔ ایک ہی سوراخ سے ڈسے جانے کی اب تو تعداد بھی یاد نہیں۔ وہی حبس کا عالم ہے۔ اس میں ایک خوشگوار جھونکا ایٹمی دھماکے سے پیدا ہوا تھا تو اس کا لطف بھی قوم نہ لے سکی کیونکہ اس دھماکے کے خالق اور ملک کو ناقابل تسخیر بنانے والے ڈاکٹر قدیر کو عزت و تکریم کی بجائے قید تنہائی نصیب ہوئی۔ اندھیرے اور حبس میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب اسٹیل مل بیچ کر ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کی کوششوں کو خاک میں ملانے والے چیف جسٹس کو خاندان سمیت نظر بند کر دیا گیا۔ چیف کی بحالی پر پھر روشنی کی کرن نظر آئی مگر چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات والی بات

ہوئی۔ ایوب خان کو روکنے والے ۹ ممبران بھی بددل ہو گئے تھے لیکن اب تو وہ ۹ بھی نہیں ہیں۔ ہاں ایک لمبی چوڑی حزب اختلاف ہے تو صحیح لیکن ؎ ''ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے''۔ کیوں کہ سنا ہے فرینڈلی ہے۔

اب ایک عدلیہ سے کیا کیا توقع کریں۔ یہاں تو آوا کا آوا ہی خراب ہے۔ اس ہی اندھیرے سے ڈر کر کچھ کالم سپرد قلم کیئے تو جی کچھ ہلکا ہوا۔ لیکن پھر ایک بار جھوٹ، فریب، الزام۔ پھر جوابی الزامات کا ایک نیا سلسلہ ایک ریٹائرڈ بریگیڈیر نے شروع کرا دیا۔ اس نے تو ایسا گھناؤنا وار کیا ہے کہ ہر ایک کی ساکھ (credibility) داؤ پر ہے۔ ڈور ایسی الجھ گئی ہے کہ سرا ہی نہیں ملتا۔ ہر شخص اپنی صفائی کے چکر میں مزید گند ڈال رہا ہے۔ کوئی بھی اس آگ کو بجھانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ کسی کو یہ خیال نہیں دس پندرہ سال بعد بریگیڈیر کا ضمیر کوما (coma) سے باہر کس انجکشن کی وجہ سے آیا اور یہ انجکشن اس وقت کیونکر کارآمد ہوا جب مشرف پر مقدمات کی بھرمار ہوئی۔ این آر او پر زد پڑی۔ دودھ کا دودھ ہونے کی امید ہوئی تو اداروں کو مشکوک بنانے کا کام شروع ہو گیا۔ جب کوئی ٹاک شو دیکھنے بیٹھو تو جھوٹ کے وہ وہ ڈونگرے برستے ہیں کہ چینل بدلنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔ بس ایسے میں یہ ہی تو کہنے کو دل چاہتا ہے کہ ع۔

؎ اب مجھے جام اٹھانے سے حیا آتی ہے

۳۰/اگست ۲۰۰۹ء

کون کہہ رہا ہے

کہا جاتا ہے کہ یہ دیکھو کیا کہا جا رہا ہے یہ مت دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے۔لیکن المیہ یہ ہے کہ بات کوئی نہیں سنتا۔سب یہ دیکھتے ہیں کہنے والا کون ہے۔کوئی امیر کبیر، کوئی معروف شخصیت یا کوئی صاحبِ اقتدار۔ہم نے دو کالم لکھے تھے۔ایک 'بینظیر، بیت اللہ محسود اور بریگیڈیر چیمہ (BB, BM, & BC)' اور دوسرا ' شرلاک ہومز اور اسکاٹ لینڈ یارڈ'۔ظاہر ہے ہم مندرجہ بالا صفات میں سے کسی ایک کے بھی حامل نہیں، اس لیئے 'نوائے وقت' جیسے مشہور و معروف اخبار میں جگہ پانے کے باوجود شائد اربابِ اقتدار کی توجہ نہ حاصل کر سکے۔ہم یہ بات اتنے وسوق سے اس لیئے کہہ رہے ہیں کہ اگر پڑھ لیئے گئے ہوتے تو بی بی قتل کیس کی تحقیقات کے لیئے پہلے اسکاٹ لینڈ یارڈ اور پھر اقوام متحدہ کی ٹیم کو زحمت نہ دی جاتی اور قوم کا پیسہ (یا ہو سکتا ہے بی بی کا اپنا پیسہ) اس مد میں ضائع ہونے سے بچ جاتا۔اور قوم کے (یا بی بی کے لواحقین) کے کام آتا۔کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اقوام متحدہ کی ٹیم کے اچھے بھی اس سازش کو بے نقاب نہیں کر سکتے۔ہمارا ایسا سمجھنے کی کئی وجوہات ہیں۔ایک تو ہم جناب ابن صفی مرحوم کی دو ڈھائی سو کتابوں کو کم از کم ۱۵، ۲۰ بار پڑھکر ماشااللہ اتنے قابل تو ہو گئے ہیں کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ اور اقوام متحدہ کے تفتیشی افسروں کی تحقیقاتی سرگرمیاں دیکھ کر یہ کہہ سکیں کہ بھئی یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔یہ تو ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ جائے حادثہ کا معائینہ اور وہ بھی اتنے عرصے بعد' کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتا ہے'۔بالفرض اگر یہ معائینہ واردات کے ایک آدھ دن بعد بھی ہوتا تو کچھ حاصل نہ ہوتا کیونکہ جائے حادثہ کی دھلائی بڑی تندہی سے کی جا چکی تھی۔امریکن فلموں میں بھی جائے حادثہ کو رسیوں کے ذریعے گھیرے میں لیتے دیکھا ہے۔چاک سے بھی کچھ نشانات لگائے جاتے ہیں۔صفائی ستھرائی کا اہتمام ہماری نظروں سے کبھی نہیں گذرا۔دوسری وجہ یہ کہ اسکاٹ لینڈ والے بھی جائے حادثے کی تصاویر بناتے رہے تھے۔جب ہم انہیں تصویر بناتے دیکھ رہے تھے تو گمان ہوا شائد انکے پاس وہ

کیمرے ہیں جو ماضی میں رونما ہونے والے واقعات کی عکس بندی کر سکتے ہیں۔اس لیئے اب قاتل کی نشاندھی ہو جائے گی اور پھر پس پردہ سازشی تک پہنچنے کے لیئے ہماری پولس کا ڈرائنگ روم مددگار ثابت ہوگا لیکن نتیجہ ڈھاک کے تین پات! آج تک یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ وہ لوگ کیا تیر مار گئے تھے۔کیا ہی اچھا ہوتا کہ کسی کو گرفتار کروا دیتے اور دوران تفتیش تھرڈ ڈگری برداشت نہ کرتے ہوئے وہ 'مومو' کرتے ہوئے جاں بحق ہو جاتا۔اب بیٹھے عقلی گھوڑے دوڑائے جاتے کہ وہ مومو کرتے ہوئے کہنا چاہتا تھا کہ 'موجھے نہیں معلوم' یا پھر ایک لسٹ بن جاتی کہ 'مو' سے کون کون سے نام ہو سکتے ہیں۔

اس سے کم از کم ایک فائدہ ضرور ہوتا کہ اونچے ایوانوں میں بیٹھے 'م' سے شروع ہونے والے نام کے حامل حضرات مرتے دم تک لرزہ براندام رہتے کہ مرتے ہوئے انسان کے آخری الفاظ اہم ہوتے ہیں۔اور پھر کون جانے کہ پندرہ سولہ سال بعد کسی رٹائرڈ کا ضمیر انگڑائی لیکر اٹھ بیٹھے اور پینڈورا بکس کھل جائے۔ان دونوں بڑے اداروں کی ناکامی کا ہمیں اس لیئے بھی یقین ہے کہ عموماً بڑے اداروں کی نظر چھوٹی چھوٹی چیزوں پر نہیں پڑتی۔وہ زیادہ گہرائی میں جھانکنے یا زیادہ دور کی کوڑی لانے میں قریبی مشکوک چیزوں پر توجہ نہیں دیتے بالکل اس طرح جیسے چیکنگ کے دوران کار کے اندر اصلحہ تلاش کرنے والوں کو کار کی چھت پر رکھی توپ نظر نہیں آتی۔اس کے علاوہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ یہ لوگ پوسٹ مارٹم رپورٹ کی عدم موجودگی میں موت کی وجہ کا کیسے تعین کریں گے۔ہماری سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا کہ وہ جائے وقوع پر کیا دیکھنے جاتے ہیں۔اور وہاں سے حاصل کیا ہوتا ہے۔کہیں یہ اس بندر کی طرح ٹوپیوں کا بتانے کی بجائے اپنی پھرتیاں دکھانے کے چکر میں تو نہیں پڑ گئے کہ تفتیش کی مد میں ملنے والی رقم کو حلال کر سکیں۔اگر واقعی یہ ادارے اتنے فعال ہوتے تو کینیڈی کے قتل کی سازش اب تک طشت از بام ہو چکی ہوتی۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں خوامخواہ بدگمانی ہو رہی ہو۔تفتیشی افسران آرتھر کانن ڈائل کے شرلاک ہومز کے اسکول آف تھوٹ (School of thought) سے تعلق رکھتے ہوں۔بس ڈاکٹر واٹسن جیسا کوئی اسسٹنٹ مل گیا تو قاتل کو حاضر کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ہمارے ذہن میں ایک آئیڈیا آ رہا ہے۔اگر اقوام متحدہ والے ناکام ہو جاتے ہیں جسکا ہمیں تو سو فی صد یقین ہے تو ان کو دی ہوئی فیس (جو واپس ملنے سے تو رہی) کے عیوض ایک اور کام لے لیا جائے۔ان سے پوچھا جائے کہ تحقیق کر

کے بتائیں اقوام متحدہ میں شامل وہ کونسی قوم ہے جو ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسے جانے پر شرمندہ نہیں ہوتی اور جسکے حکمران سو جوتے اور سو پیاز کھانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

۲ ستمبر ۲۰۰۹ء

واپسی

واپسی کو انگریزی میں ریٹرن (Return) کہتے ہیں۔اس کے علاوہ واپسی کو ود ڈرآل (With Drawl) کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔اب اس میں کیا فرق ہے یہ تو ماہرِ لسانیات جانیں۔ہم تو مثالوں کے ذریعے فرق سمجھانے کی کوشش کریں گے۔انشااللہ فرق واضع ہو جائے گا۔ہمارے تعلیمی دور میں ایسی فلمیں بھی ہوا کرتی تھیں، جو کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے بعد دوبارہ اس طرح جلوہ گر ہوتی کہ فلم کے نام یا فلم کے مرکزی کردار کے گرد ایک نئی کہانی بُنی گئی ہوتی۔اور نئی فلم 'ریٹرن' کے لاحقے کے ساتھ لوگوں کی توجہ حاصل کر لیتی۔اس طرح عموماً پہلی فلم کی کامیابی کے بل بوتے پر یہ باکس آفس پر ہٹ ہو جاتی تھی، ویسے کبھی کبھار یہ وہ کامیابی نہ حاصل کر پاتی جس کی امید فلمساز کو ہوتی تھی۔ایک فلم ٹارزن کامیاب ہوئی تو فلمساز نے دا ریٹرن آف ٹارزن (The Return of Tarzan) پیش کر دی۔اس ہی طرح زورو (ZORRO) اور پھر ریٹرن آف زورو (Return of Zorro) تھیں۔کبھی کبھار یہ سلسلہ دو فلموں کے بعد منقطع ہو جاتا۔اس کی مثال پیٹن پلیس (Peyton Place) اور ریٹرن ٹو پیٹن پلیس سے دی جاسکتی ہے۔ایسا بھی ہوا کہ کسی فلم کا کوئی کردار ہٹ ہو گیا تو اس کے نام پر ایک سیریز شروع کر دی اس کی بہترین مثال سپر مین (Super Man) میں ملتی ہے 'واپسی' یا ریٹرن پر فلم بنانے کی دو مستند وجوہات ہیں۔پہلی ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ فلم کامیاب ہوئی تو اس کامیابی کو مزید کیش (Cash) کرا لیا۔ہوسکتا ہے اس کی کوئی اندرونِ خانہ وجوہات بھی ہوں مثلاً پہلی فلم کے کچھ زائد سین جو عکس بند تو ہو چکے ہوں لیکن بوجہ استعمال ہونے سے رہ گئے ہوں۔ہم ان تکنکی وجوہات میں جانا نہیں چاہتے کہ یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ہاں یہ ضرور عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ 'اندرونِ خانہ وجوہات' کے بامعنی الفاظ (Phrase) کو ذہن میں رکھیئے گا ، شائد یہ سمجھنے سمجھانے کے کام آجائے۔ہم بھی اس ہی 'اندرونِ خانہ وجوہات' کے تحت ہی تو اپنے کالم میں

طویل تمہید باندھتے ہیں اور اصل موضوع کو جلدی سے چند الفاظ میں لپیٹ دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں۔ع

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

حالانکہ سمجھنے والے غضب کی سمجھ رکھتے ہیں۔اب اس مجبوری کے تحت کہ تمہید فلمی ہے کیوں نہ ایک فلمی نغمے کے اس مکھڑے کو شامل کر کے کچھ دلچسپی پیدا کی جائے ع

سمجھنے والے سمجھ گئے ہیں، نہ سمجھے وہ اناڑی ہے

واپس موضوع کی طرف آتے ہوئے بتاتے چلیں کہ واپسی یا ریٹرن پر فلم بنانے کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ پہلی فلم میں فلساز کی دانست میں کوئی تشنگی رہ جاتی یا کوئی کوتاہی ہوتی ہے جس کے ازالے کے لیئے 'واپسی' یعنی ریڑن کا سہارا لیکر ایک اور فلم بن جاتی ہے۔یہ بات ہماری سمجھ میں تو آتی ہے لیکن دوسری واپسی یعنی وڈرال ہماری سمجھ سے باہر ہے جس کا مظاہرہ بڑی شدومد سے ہمارے حکمران کرتے نہیں تھکتے۔ایک دن ایک آرڈننس یا بیان آتا ہے۔اس پر تبصرے ہوتے ہیں۔کچھ خوشی کے اظہار میں بہت آگے چلے جاتے ہیں کہ انکی واپسی (Return) کی امید نظر نہیں آتی۔کچھ دوسرے ناراضگی میں ساری حدود پھلانگ جاتے ہیں۔مصروں کی بن آتی ہے۔لمبی لمبی چھوڑتے ہیں۔کوئی اس کے دوررس نتائج کی نوید دیتا ہے تو کوئی مضر اثرات سے دہلا دیتا ہے۔ایک فریق اسے حکمرانوں کی بصیرت کا کارنامہ گردانتا ہے تو دوسرا احمقانہ اقدام۔یہ سلسلہ چوبیس گھنٹے بھی پورے نہیں کر پاتا کہ آرڈننس یا بیان کی واپسی براستہ تردید ہو جاتی ہے۔اب بیان پر تبصرے کرنے والے اپنے اپنے کہے ہوئے پہ شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔بلکہ اس 'آرڈیننس یا بیان کی واپسی' (withdrawl of the ordinance) پر مزید گلفشانیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ایسی ایسی دور نزدیک کی کوڑیاں لاتے ہیں کہ عقل دنگ رہجاتی ہے۔مگر ایک بات بہت اچھی دیکھنے میں آئی ہے کہ کوئی بھی تبصرہ نگار، دانشور یا سیاستدان، حزب اقتدار کا ہو یا حزب اختلاف کا اپنے کہے پہ شرمندہ نہیں ہوتا۔حکومت تو اپنا کہا، اپنا آرڈننس، اپنی قرارداد واپس لے لیتی ہے لیکن یہ لوگ اپنے الفاظ واپس نہیں لیتے بلکہ اپنی غلط باتوں کی تائید میں مزید غلط بیانیاں کرنے لگتے ہیں۔یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا ہے جب تک حکومت کسی نان ایشو کو ایشو بنانے کے لیئے کوئی بیان نہیں دیدیتی، کوئی آرڈننس نافظ نہیں کر دیتی یا کسی متفقہ قرارداد کی فرمائش نہیں کر دیتی۔لیجئے نیا سلسلہ شروع۔۔۔''متفقہ

کی کیا ضرورت۔بس سادہ اکثریت ہی کافی ہے''۔'سادہ اکثریت کیا؟ قرارداد کی بھی ضرورت نہیں'۔کہیں سے آواز آتی ہے 'ہم تو خود بھی وہی چاہتے ہیں جو حزب اختلاف چاہتی ہے۔بس طریقہ کار پر اختلاف ہے۔یہ ہی عدلیہ کی بحالی پر ہوا تھا، ہم جس طرح چاہتے تھے ویسے نہیں کرنے دیا۔بادل ناخواستہ کرنا پڑا۔ہماری سب کی منزل تو ایک ہے بس راستہ مختلف ہے۔ع

نہ ترا خدا کوئی اور ہے نہ میرا خدا کوئی اور ہے
یہ جو راستے ہیں جدا جدا، یہ معاملہ کوئی اور ہے

بس آپ لوگ لانگ مارچ کرتے جاؤ ہم آپ کی بات مانتے رہیں گے۔آخر ہم بھی تو کسی کو جوابدہ ہیں۔ہمیں بھی تو اپنے ووٹروں کے پاس واپس جانا ہے۔آخر ''دا ریٹرن آف دا پارٹی'' بھی تو ہونا ہے۔۔

۵ستمبر۲۰۰۹ء

پیمانہء مقبولیت

دو سیاستداں جن میں سے ایک سابقہ حکومت کا نمائندہ تھا جبکہ دوسرا موجودہ حکومت کا حصہ، تفریح کرتے کرتے کچھ زیادہ دور نکل گئے۔ بس یوں سمجھئے مزے میں آ کر موت کو بھول گئے۔ آپ کے ذہن میں سوال تو ضرور اٹھ رہا ہوگا کہ موجودہ کا سابقہ سے کیا تعلق۔ تو عرض ہے کہ سیاست میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہر آنے والا جانے والے کا اندرون خانہ دوست ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک دن اسے بھی جانا ہوتا ہے۔ عوام انہیں ایک دوسرے کا دشمن سمجھتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ اقتدار ہمیشہ ایک ہی طبقے کے پاس رہتا ہے۔ بس یوں جانئے کہ اقتدار باری باری کزنز (Cousins) کے پاس آتا ہے۔ بس یہ رشتہ داری ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اس لیئے لڑتے جھگڑتے بھی رہتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی کوئی نالائق فیملی ممبر حقیقتاً بھی دشمنی کر بیٹھتا ہے۔ بہر حال ہم فیملی میٹرز میں الجھنے کی بجائے آگے چلتے ہیں کہ وقت کا تقاضہ بھی یہ ہی ہے کہ گڑے مردے اکھاڑنے کی بجائے قوم کو آگے لگانا۔۔ معاف کیجئے آگے لے جانا ہے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھے دو سیاستدانوں کی جو تفریح کرتے کرتے دور نکل گئے۔ دونوں کے ہوش ٹھکانے تو اس وقت آئے جب اچانک ایک شیر سامنے آ گیا۔ ہاتھ پاؤں پھولنے تو تھے ہی لیکن سابقہ حکمران تجربے کار اور گھاگ تھا اس لیئے اطمینان سے دوڑ لگانے کی پوزیشن میں آ گیا۔ یہ دیکھ کر نئے حکمران نے پوچھا کیا تم شیر سے آگے نکل سکو گے۔ گھاگ سیاستدان نے اسٹارٹ لیتے ہوئے کہا۔ 'نہیں! دراصل جب شیر پیچھا کرے گا تو مجھے تم سے آگے رہنا ہوگا۔ شیر سے نہیں'۔ ظاہر ہے یہ کہانی من گھڑت ہے کیونکہ آجکل کوئی بھی حکمران بغیر پروٹوکول ور بلٹ پروف گاڑی کے باہر نہیں نکلتا۔ ایسے میں اتنی لمبی واک کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ جس میں شہر کی حدود ختم ہو جائے اور شیر کی راجدھانی شروع ہو جائے۔ اور پھر ایک سابق حکمران کے ساتھ جانے کی تو کوئی تک بھی نہیں بنتی۔ اس قسم کی بے تکی کہانیوں کا استعمال حقیقتاً ادب عالیہ کی وجہ سے ہے جس نے علامتی افسانے کو فروغ دے کر اس قسم کی علامتی کہانیوں کی ہمت افزائی کی۔ ایسی کہانیوں میں ایک آدھ کردار کو تو پہچاننا آسان ہوتا ہے لیکن کہانی کے

تانے بانے اس طرح بنے جاتے ہیں کہ کچھ پلے نہیں پڑتا کہ شیر کون ہے، اور حکمران کون؟ سابق حکمران کو اس کی اصلی خود غرضی کی بدولت تو پہچانا جا سکتا ہے لیکن جنگل سے کیا مراد ہے۔ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ یہ بھی سمجھ سے باہر ہے کہ کیا شیر پیچھے رہ جانے والے کو ہی دبوچے گا۔ کیا دونوں کو چٹ نہیں کرے گا۔ اب ظاہر ہے یہ کالم ہے کوئی جیوگرافک چینل نہیں کہ شیر کی نفسیات سے واقفیت ضروری ہو۔ یہ تو شیر پر ریسرچ کرنے والا ہی بتا سکتا ہے کہ شیر کی دور کی نظر خراب ہوتی ہے۔ اس لیئے اپنے سے آگے سے آگے والے کو نہیں پکڑ سکتا۔ شیر کی یہ کہانی ایک لطیفے کے طور پر سامنے آئی لیکن اسے حسن اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ عین اس وقت ایک بیان ہمارے سابق غاصب حکمران کا سامنے آیا جو اس نے لندن میں دی گئی افطار پارٹیوں میں بلائے گئے مہمانوں میں اپنی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو محسوس کرتے ہوئے داغ دیا کہ لندن میں پاکستانی کمیونٹی جس طرح پزیرائی کر رہی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میں موجودہ حکمرانوں سے زیادہ مقبول ہوں۔ موصوف نے یہ وضاحت نہیں کی کہ موجودہ پاکستانی یا برطانوی حکمران۔ اگر ان کا اشارہ پاکستانی حکمرانوں سے ہے تو انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ لندن میں پاکستانی کمیونیٹی بھی کتنے کروڑ پر مشتمل ہے۔ تاکہ صحیح تقابلی جائزہ لیا جا سکے۔ ایک غور طلب مسئلہ یہ بھی ہے کہ موصوف کو دی گئی افطاریوں کا اہتمام ان کے دوست کر رہے ہیں۔ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ خرچ کون برداشت کرتا ہے۔ اور ہر پارٹی میں مدعوین بدلتے رہتے ہیں یا وہی کامن فرینڈز ہوتے ہیں۔ خرچ کا ہم نے اس لیئے پوچھا کہ ہمارے ایک غیر مقبول یونیورسٹی فیلو ہر سال دو تین افطاریاں اپنے اعزاز میں خود دیتے تھے۔ طریقہ یہ ہوتا کہ خرچہ انکا اپنا ہوتا تھا لیکن میزبانی مختلف دوستوں کے حصے میں آتی تھی۔ یہ راز کھلنے تک ہم ان کی مقبولیت پر رشک کرتے تھے کہ ہر سال موصوف کے اعزاز میں دو تین پارٹیاں ہو جاتیں جبکہ ہم ان سے زیادہ مقبول ہونے کے باوجود ایک سے بھی محرومی رہتے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ راز جلد ہی افشا ہو گیا ورنہ ہم احساس محرومی کا شکار ہو سکتے تھے۔ ہمیں امید ہے کہ شیر کے لطیفے، پیمانہء مقبولیت اور افطاریوں کے ذکر کے بعد آپ اس سادہ لوح کی طرح (جس نے ایک لطیفہ سننے کے بعد پوچھا تھا پھر کیا ہوا) یہ نہیں پوچھیں گے ان تینوں واقعات میں ربط کیا ہے۔

۶ ستمبر ۲۰۰۹ء

ناشکری قوم

بچپن میں دیکھی گئی فلموں میں سے جو یادداشت میں چپک کر رہ گئی ہیں ان میں سے ایک فلم کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ ایک انگریز ایک ہندوستانی مزدور کی کسی غلطی پر کوڑوں سے پٹائی کر رہا ہوتا ہے۔ مزدور کی آہ و بقا سن کر ایک شہسوار آتا ہے اور ظلم دیکھ کر اپنا خنجر نکالتا ہے اور انگریز کو مار دیتا ہے۔ یہ دیکھ کر مزدور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے 'حضور یہ آپ نے کیا کیا؟ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ نواب سراج الدولہ کی راجدھانی میں کسی کو قتل کرنا ناقابل معافی جرم ہے'۔ یہ سن کر وہ شخص غصے میں اچھل کر گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کہتا ہے۔ 'اگر کوئی پوچھے کہ یہ قتل کس نے کیا ہے تو کہہ دینا۔ قتل کرنے والا خود نواب سراج الدولہ ہے'۔ اس کے بعد نواب انگریزوں سے برسرِ پیکار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ انگریزوں کو شکست فاش ہوتی، میر جعفر لالچ میں آ کر غداری کا مرتکب ہوتا ہے اور نواب کے قتل کے ساتھ ساتھ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے کی راہ بھی ہموار کر دیتا ہے۔ اس کہانی کے یاد آنے کی وجہ وہ خبر بنی جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام آباد میں ایک امریکی تنظیم کے نمائندوں نے ایک پاکستانی کی اس لیئے پٹائی کر دی کہ اس نے اپنی کار غلطی سے امریکیوں کی کار کے آگے کھڑی کر دی تھی۔ افسوس ہوا کہ اسلام آباد میں کیا نواب سراج الدولہ کی ٹکر کا کوئی حکمران نہیں تھا جو اس امریکی کو سبق سکھا سکتا اور جاتے جاتے اپنا تعارف بھی کروا جاتا۔ اس واقعہ کو ایک معروف کالم نگار نے اپنے کالم میں قلم بند کیا ہے۔ اس لیئے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ پڑھ کر دکھ ہوا اور زبان سے نکلا۔ ع

اپنے وطن میں آ کر غریب الوطن ہوئے

اور پھر نواب سراج الدولہ و میر جعفر اور ٹیپو سلطان و میر صادق یاد آ گئے۔ دن بھر کڑھتے رہنے کے بعد سوچ نے جست لگائی اور خیال آیا کہ نواب سراج الدولہ نے جو کچھ کیا، کیا وہ صحیح تھا، یا میر جعفر کا اقدام

درست تھا۔ ٹیپو سلطان صحیح تھے یا میر صادق!! اگر نواب اور ٹیپو انگریزوں کے لیئے 'دیدہ و دل فرشِ راہ' بن جاتے تو شائد دونوں قتل ہونے سے بچ جاتے اور آنے والے حکمران دونوں کو گارڈ آف آنر بھی پیش کرتے اور سیف ایکزٹ بھی فراہم کرتے۔ اور پھر دونوں آکسفورڈ اور کیمبرج میں لیکچر دیتے اور خوب کمائی کرتے۔ انگریز ہمارے لیئے دودھ کی نہریں بہا دیتے جیسے امریکیوں نے '9/11' کے بعد اس وقت کے میر جعفر کے اقدامات کے جواب میں کیا۔ اور پاکستان کو خوش حال پاکستان اور اسلام کو اینلائٹنڈ اسلام بنا دیا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ ہماری قوم کتنی ناشکری ہے کہ خوشحالی کے باوجود خوش نہیں۔ پہلے بینکوں سے قرضے مل مالکان، زمیندار اور سیاستدان لیا کرتے تھے اب ماشا اللہ ہر پاکستانی بینک سے قرضہ لیکر کار، بنگلہ یا موٹر سائکل خرید سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر اسلامی نظام نافظ ہو جائے اور لوگ زکواۃ صحیح طور پر ادا کرنے لگیں تو کوئی زکواۃ لینے والا نہیں ملے گا۔ اب اسلامی نظام کی ضرورت نہیں رہی کہ ہم خود گواہ ہیں کہ موجودہ نظام میں بینک والے قرضہ دینے کے لیئے پھر رہے ہیں اور لینے والا کوئی نہیں۔ ہمیں خود دن بھر ایسی فون کالز ملتی ہیں جن میں بینک سے قرضہ لینے کی آفرز ہوتی ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ کان ہی نہیں دھرتے۔

خوشحالی اس سے بھی ظاہر ہے کہ جو بکرے کا گوشت ہم دو سو میں بڑی مشکل سے خرید پاتے تھے اب آسانی سے ساڑھے تین سو میں لے آتے ہیں۔ آسانی سے یوں کہ پہلے گوشت خریدنے میں دو تین گھنٹے ضائع ہو جاتے تھے اب نہیں ہوتے۔ یہ ہی حال دوسری اجناس کا ہے۔ پہلے امیر غریب سب عام دکانوں سے خریدتے تھے۔ اب غریبوں کو یوٹیلیٹی اسٹور کی راہ دکھا کر عام دکانوں سے خریدنے والوں کے لیئے آسانیاں پیدا کر دی گئیں ہیں آٹے اور چینی کی عدم فراہمی کی وجہ جو بتائی جاتی ہے وہ قطعئی نہیں ہے۔ اصل وجہ صرف ناشکری قوم کو احساس دلانا ہے جو اتنی آسائشوں کے باوجود امریکیوں کے خلاف ہے۔ ناشکری یہ ہی نہیں بلکہ بیجا اسراف بھی ناشکری ہی کی مد میں آتا ہے۔ اس لیئے حکمران کہتے ہیں چینی کم خرچ کرو۔ بجلی کا استعمال بھی کم کرو۔ ہماری تونگری تو اس سے بھی ظاہر ہے کہ ہم اپنی معدنیات تک خود نہیں نکالتے۔ اب کون مزدوری کرے اس لیئے یہ کام امریکی اور آسٹریلوی کر رہے ہیں۔ دروغ بر گردن راوی سندک (بلوچستان) میں یہ ہی ہو رہا ہے۔ خیر سگالی کے طور پر برٹش پٹرولیم (BPL) بھی ہماری او۔ جی۔ ڈی۔ سی (OGDC) کا

بوجھ ہلکا کر رہی ہے۔اگر یہ کام ہمارے پاکستانی کرنے لگیں تو پھر دبئی ،سعودی عربیہ اور یونان کون جائے گا۔آخر جن کی موت کنٹینروں میں لکھی ہے اس کو بھی تو پورا ہونا ہے۔قدرت کے کاموں میں مداخلت کون کرسکتا ہے۔چین سے کوئلے کی کانوں میں اموات کی خبریں اتنی زیادہ آتی ہیں کہ ایک آسودہ قوم کو زیب نہیں دیتا کہ اپنے لوگوں کو ایسے جوکھم میں ڈالے۔آخر ہمارے کوئلے کے ذخائر دنیا میں پانچویں نمبر پر ہیں تو کیا ضرورت کے خود ہی نکالنے بیٹھ جائیں۔یہ کام بھی امریکیوں کو دے کر اس کی گرتی ہوئی معیشت کو سہارا دیا جاسکتا ہے ان ساری باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اور نواب سراج الدولہ و ٹیپو سلطان کے انجام سے سبق لیتے ہوئے اب ہمارا خیال ہے کہ ہمیں اسلام آباد کے ایک رہائیشی کی امریکیوں کے ہاتھوں پٹائی پر چراغ پا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کی پٹائی کو پاکستان کی خاطر 'دوسری' قربانی کا درجہ دیدینا چاہیئے ۔تاکہ قوم میں ایسی قربانی کا جذبہ پیدا ہوسکے۔دوسری اس لیئے کہ پہلی تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان ناکردہ گناہ کی معافی مانگ کر دے چکے ہیں۔۔

۲۳ ستمبر ۲۰۰۹ء

۔۔۔۔ تناظر میں

بہت پہلے ایک شعر سنا تھا جو ہمیں پسند نہیں آیا تھا اس لیئے شعر یاد بھی نہ ہوسکا لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں اس کا مفہوم ہماری یادداشت میں آج بھی محفوظ ہے۔مفہوم کے حوالے سے آج وہ شعر غلط سلط جیسا اور جتنا یاد آرہا ہے پیش کیئے دیتے ہیں۔ہوسکتا ہے کہ شعر صحیح طور پر ہی یاد آرہا ہو۔بہرحال کچھ یوں ہے۔ع

ہوں ناتواں اتنا کہ ہو کفن بھی ہلکا

ڈالدو تم سایہ اپنے آنچل کا

قارئیں میں سے کسی کو صحیح یاد ہو تو تصحیح فرمالیں۔وگرنہ اس ہی پر اکتفا کریں۔اس سے آج کے موضوع پر قطعئی فرق نہیں پڑے گا۔یہاں شعر نہیں بلکہ اسکے مفہوم کے تناظر میں کچھ عرض کرنا ہے اس لیئے شعر کی صحت پر بحث لاحاصل!! ہمیں شعر پسند نہ آنے کی وجہ شعر میں حقیقت کا فقدان ہی رہا ہوگا۔آنچل کے سائے کا کفن ہماری سمجھ سے بالا تھا۔مفہوم کی نسبت سے اسکا یاد آنا، ایک وزیر مملکت کے بیان کا مرہونِ منت ہے۔جو انہوں نے دہشتگردوں کے جی ایچ کیو پر حملے کے بعد دیا تھا۔حملے کے بعد مختلف آراء سامنے آرہی تھیں۔کچھ کا خیال تھا کہ یہ القائدہ کا کام ہے تو کچھ کہہ رہے تھے کہ یہ طالبان کا کیا دھرا ہے۔کچھ کہہ رہے تھے کہ بھارت اس کا ذمہ دار ہے۔کچھ سمجھ رہے تھے یہ حال ہی میں ہونے والے آپریشنز کا 'ری ایکشن' ہے۔ایسے میں کسی ذی حس نے کہہ دیا کہ یہ تو بلیک واٹر کا کام لگتا ہے۔بس یہ بات میڈیا میں کیا آئی، مذکورہ وزیر مملکت نے فوراً سے پیشتر خبردار کردیا کہ ایسا سوچنا بھی نہایت خطرناک ہے۔ملاخطہ فرمایا آپ نے!! یہ بیان تو اوپر بیان کردہ شعر سے بھی بازی لے گیا کیوں کہ آنچل کا سایہ پردہ رکھے یا نہ رکھے کم ازکم نظر تو آتا ہے جبکہ 'سوچ' تو نظر ہی نہیں آتی۔اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ نظر نہ آنے والی چیز کیسے خطرناک ہوسکتی ہے۔اس لیئے اس وزیر کو داد دینی پڑتی ہے جس نے بروقت آگاہ کردیا کہ بلیک واٹر کے بارے میں سوچنا بھی خطرناک ہوسکتا ہے۔اب اس کی وضاحت کون کرے گا کہ ایسا سوچنا خطرناک کیوں ہے۔خاص کر کے حکومتی حلقوں

کے اس بیان کے بعد کہ پاکستان میں بلیک واٹر کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اگر وجود نہیں ہے تو پھر خوف کیسا؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ایک بھوت نے افغانستان سے گذرتے ہوئے دوسرے بھوت سے کہا تھا ''بیٹا ڈرنے کی ضرورت نہیں، یہ طالبان والبان کچھ نہیں ہوتے''۔ حکومت کی تردید کے باوجود خدا جانے میڈیا کیسے کہتا ہے کہ بلیک واٹر والوں نے کرائے پر مکانات لے لیئے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے بلیک واٹر نے نام بدل لیا ہے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ کہہ سکتے ہیں ''کس نام سے پکاروں، کیا نام ہے تمہارا؟'' مشہور ہے گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو گلاب گلاب ہی رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے بلیک واٹر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو کہ وہ کسی اور ہی نام سے دندنا رہے ہوں ورنہ وزیر مملکت یہ کیوں کہتے کہ ایسا سوچنا بھی خطرناک ہے کہ یہ بلیک واٹر کا کام ہے۔ اب یہ تو وزیر صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ جس کا کوئی وجود ہی نہ ہو وہ خطرناک کیونکر ہوسکتا ہے۔ بہر حال 'ہلکے کفن' والے شعر کے تناظر میں اس 'سوچ' والے بیان نے ہماری سوچ کو ایک نئی سوچ دیدی ہے۔ اب ہم ہر بات کو کسی نہ کسی تناظر میں دیکھنے لگے ہیں۔ چاہے وہ شعر ہو یا لطیفہ۔ اب ہم آپ کی توجہ ان سرکاری بیانات کی جانب مبذول کرانا چاہیں گے۔ جن میں وقتاً فوقتاً بتایا جاتا ہے۔ 'ایک مشکوک گاڑی شہر میں داخل ہوگئی ہے'۔ یا 'سات دہشت گرد شہر میں داخل ہوچکے ہیں'۔ یا 'ایک سفید وین میں دھماکہ خیز مواد کی موجودگی کی اطلاع ہے'۔ ان بیانات سے ہمیں تو بڑا حوصلہ ہوتا ہے کہ اب ہماری انٹیلی جنس کافی چوکس ہوگئی ہے۔ بروقت بتادیتی ہے کہ کتنے دہشت گرد اور کتنی گاڑیاں شہر میں داخل ہوگئیں ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم لوگ اچھی باتوں کو بھی نہیں سراہتے۔ قنوطی حضرات بجائے سراہنے کے تنقید کرتے ہیں کہ جب معلوم ہو گیا تو پکڑا کیوں نہیں۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ پکڑنا انٹیلی جنس کا کام نہیں۔ یہ ذمہ داری دوسرے محکمے کی ہے۔ اب ان سے کوتاہی ہوجائے تو اس میں کسی کا کیا دوش؟ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن جب ہم ایسی اطلاعات سنتے ہیں جن میں بتایا جاتا ہے کہ دہشتگردوں کا اگلا نشانہ کون ہوگا تو ہماری سانسیں بند ہونے لگتی ہیں۔ اس ضمن میں جن ٹارگیٹس کی نشاندہی کی جاتی ہیں وہ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ہم کیا کوئی بھی نہیں سوچ سکتا کہ ان اداروں کو بھی ٹارگیٹ کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ یہ ٹارگیٹس تو حملہ آوروں کے ذہن میں بھی نہیں ہوتے ہونگے۔ لیکن اطلاعات کا (source) اتنا معتبر ہوتا ہے کہ یقین کرتے ہی بنتی ہے۔ اور

پھر چند دنوں بعد اس وقت حیرت ہوتی ہے جب واقعتاً بتائے گئے اداروں سے ملتے جلتے کسی ادارے پر حملہ ہو جاتا ہے۔ پولس ٹریننگ سینٹر، ایف آئی اے کے دفاتر اور پولس چوکیوں سے ہوتے ہوئے اب دہشت گرد حساس اداروں کے گیٹس پر پہنچ رہے ہیں۔ پھر وزرا کے یہ بیانات بھی کم اہم نہیں کہ ہم نے تو پہلے ہی اس بات کی نشاندہی کردی تھی۔ کوئی کہتا ہے یہ تو ہم نے چھ ماہ پہلے بتادیا تھا۔ یہ سن سن کر ہمیں اپنی بے بسی کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ یہ دہشت گرد اتنے مضبوط ہیں کہ پیشگی اطلاع کے باوجود پکڑ میں نہیں آتے۔ اور ہم کفِ افسوس ملتے رہ جاتے ہیں۔ کالم لکھ کر اپنا دل ہلکا کرتے ہیں اور قارئین کو ایک آدھ شعر یا کوئی لطیفہ سنا کر غم بانٹتے ہیں۔

۱۷/اکتوبر ۲۰۰۹ء

تھنک ٹینکس بمقابلہ ہمارے دانشور

پہلے تو یہ وضاحت ہو جائے کہ تھنک ٹینکس کیا ہیں اور ہمارے دانشور کون ہیں۔ ہماری عقل کے مطابق تھنک ٹینکس (ThinkTanks) وہ لوگ کہلاتے ہیں جو کوئی مقصد (objective) سامنے رکھ کر غور و فکر کرتے ہیں۔ سارے عوامل کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ماضی کے تناظر میں حال کو دیکھتے ہیں۔ پھر قوم کے سامنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیئے مستقبل کی پلاننگ کرتے ہیں۔ مقصد براری کے لیئے حکمت عملی (Strategy) کیا ہوگی اور لائحہ عمل (Tactics) کیا ہونگے۔ یہ سارا کام بڑی باریک بینی سے کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پلان فیل ہونے کی صورت میں متبادل پلان بھی تیار رہتا ہے۔ تھنک ٹینکس سوچتے ہیں غور کرتے ہیں اور عمل کرنے کے لیئے اپنی حکومت کو پلان مہیا کرتے ہیں۔ ایسے تھنک ٹینکس امریکہ کے علاوہ بھارت میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں نہیں ہوتے۔ سنا ہے اب ہونگے۔ انکے مقابلے میں ہمارے پاس دانشور ہیں جو نہ سوچتے ہیں نہ غور کرتے ہیں نہ پلان کرتے ہیں۔ صرف بولتے ہیں اور وہ بھی ٹاک شوز میں! یہ رونما ہو چکنے والے واقعات کا تجزیہ کرتے ہیں جسے ادبی زبان میں 'بعد از مرگ واویلا' کہا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے غیر ادبی زبان یا عوامی زبان میں 'گدھے کے پیچھے پنج' بھی کہا جاتا ہو۔ واللہ اعلم! ہاں ان دانشوروں کی خوبی ہے کہ یہ سانپ کے نکل جانے کے بعد لکیر ہی پیٹتے رہ جاتے ہیں۔ بادی النظر میں غیروں کے تھنک ٹینکس اور ہمارے دانشوروں میں کوئی فرق نہیں۔ اوہو!! غلطی ہو گئی۔ معافی چاہتے ہیں۔ دراصل ہم یہاں نام نہاد دانشوروں کا ذکر کر رہے ہیں تو گذارش ہے کہ جب بھی یہاں دانشور یا تجزیہ نگار کا ذکر ہو تو آپ اس میں 'نام نہاد' کا لاحقہ ضرور استعمال کر لیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے یہاں نام نہاد دانشوروں کی تعداد زیادہ ہے۔ جینوئین ایک تو آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ دوئم یہ کہ انہیں ٹاک شوز میں شاذ و نادر ہی مدعو کیا جاتا ہو۔ اس وضاحت کے بعد عرض ہے کہ اگر تھنک ٹینکس اور دانشوری کا فرق واضح نہیں تو ہم ایک دو مثالوں

سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۹۶۵ کی جنگ (قطع نظر اس کے کون جیتا تھا کون ہارا تھا یا یہ جنگ کس نے شروع کی تھی)، سے صرف ایک مثال لینا چاہتے تھے تا کہ تھنک ٹینکس سمجھ میں آ جائیں۔ لیکن اب ۱۹۶۵ کی جنگ کا ذکر نکل ہی آیا ہے تو چلئے اس پر بھی بات کر لیتے ہیں کہ شائد اس سے ہمارے دانشور اور تجزیہ نگار بھی سمجھ آ جائیں کیوں کہ ہمارے دانشوروں اور تجزیہ نگاروں میں سے چند کا خیال ہے کہ یہ جنگ پاکستان جیت تو گیا تھا، لیکن تاشقند میں مذاکرات کی میز پر ہار گیا تھا۔ کچھ کا خیال ہے پاکستان کو شکست ہوئی تھی اور چند ایک زیادہ ہوشیار ہیں کہ انکے سیاسی بیان کے مطابق نہ کوئی ہارا، نہ کوئی جیتا تھا۔

ہمارے دانشور زیادہ تر ریٹائرڈ فوجی ہیں یا رٹائرڈ سفارت کار۔ کچھ صحافی بھی ہیں لیکن 'سینئر' کے لاحقے کیساتھ۔ ویسے اور بھی ہیں جنہیں ٹی وی کے اینکر پرسنز نے 'معروف دانشور یا مشہور تجزیہ نگار بنا دیا ہے'۔ یاد آیا کچھ 'مذہبی اسکالرز' کے دم چھلے کے ساتھ بھی آتے ہیں۔ ہنسی اس وقت آتی ہے جب کسی دینی پروگرام مثلاً 'اسلام میں پردے کے احکامات' یا 'معاشرے میں عورت کے حقوق' پر تبصرہ کرنے کے لیئے فلمی دنیا سے کسی ڈریس ڈزائنر یا کسی بیوٹی پارلر کی مالکہ کو بلوایا جاتا ہے اور تعارف اس طرح کرایا جاتا ہے جیسے موصوفہ کوئی بہت بڑی دینی شخصیت ہیں۔ پھر ظاہر ہے پردے کی مخالفت میں وہ وہ باتیں سننے کو ملتی ہیں جس سے کان نا آشنا ہی رہتے اگر میڈیا آزاد نہ ہوتا۔ یہ خواتین اپنے پیشے کو مدنظر رکھتے ہوئے حجاب کی مخالفت میں قران و احادیث کے حوالے بھی دیتی ہیں۔ اور ان کی تائید کرنے کے لیئے ایک آدھ مذہبی اسکالر بھی موجود ہوتا ہے، جو قران سے ثابت کرتا ہے کہ اسلام میں پردہ ضروری نہیں کیونکہ قران میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ واللہ عالم۔ ویسے دیکھا جائے تو اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کیونکہ اگر کسی ناچنے گانے والے سے پوچھا جائے کہ اسلام میں ناچ گانے کے بارے میں کیا حکم ہے تو ظاہر ہے اس کا بیان ناچ گانے کی مخالفت میں تو ہونے سے رہا۔ پھر وہ اپنے بیان کی تائید میں 'دف' کی اسلام میں اجازت ہونے کی مثال دیتے ہوئے امیر خسرو تک پہنچ جائے گا، جنہوں نے شائد طبلہ ایجاد کیا تھا۔ ایسی بھرپور سند کے بعد تو اچھے اچھے قائل ہو جائیں گے کہ اسلام میں ناچ گانے کی ممانعت نہیں ورنہ 'تو سے نینا ملائیکے اور ہری ہری چوڑیاں' جیسے گیت کی تخلیق کیونکر ہوتی۔ اس ہی پر کیا اکتفا کیونکہ ایک رٹائرڈ جسٹس (جو ماشاللہ اب دانشور بھی ہیں) تو اپنے عظیم باپ کی لاج بھی نہیں رکھتے۔ کہتے

ہیں' اسلام میں شراب کی نہیں، بہکنے کی ممانعت ہے'۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہمارے دانشوروں کی ایک اور خوبی ہے وہ اپنے افکار پیش کرتے ہوئے پاکستان یا اسلام کے مفاد کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ بھی اس سے متفق ہیں کہ سچ کہنا لازمی ہے۔ مگر انکے نزدیک امریکا یا بھارت کا کوئی معاملہ ہو، تو تھوڑی سی غلط بیانی کی جاسکتی ہے کیونکہ بقول انکے اسلام میں مروت کی اجازت ہے۔ کسی کا دل نہیں دکھانا چاہیئے اس لئے دل میں تو اللہ تعالیٰ رہتے ہیں۔ اس لیئے یہ لوگ بھارت یا امریکہ کی دل آزاری نہیں چاہتے۔ ہاں، پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی میں کوئی حرج نہیں۔ سنا ہے کہ اب ائر مارشل اصغر خان بھی دانشور ہو گئے ہیں۔ اس ہی لیئے تو کہہ رہے ہیں کہ ۶۵ کی جنگ، ہندوستان نے نہیں پاکستان نے شروع کی تھی۔ ہمارے دانشور اور مبصر اتنا سچ بولنے لگیں ہیں کہ بھارت کو موقع مل رہا ہے یہ کہنے کا کہ ''ہم تو پہلے ہی یہ کہتے تھے کہ سب کچھ پاکستان کا کیا دھرا ہے''۔ پاکستان کا شروع سے یہ موقف ہے کہ جنگ بھارت نے چھیڑی تھی جبکہ بھارت کا کہنا تھا کہ جنگ اس پر تھوپی گئی تھی۔ اب رٹائرڈ اصغر خان نے بھارت کی تائید کر کے ثابت کر دیا کہ بھارت ہی سچا تھا۔

دانشور اور تجزیہ نگار کھیلوں میں بھی ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال کرکٹ کے ماہرین سے بھی لی جاسکتی ہے جن سے پوچھا جائے کہ آپ کے خیال میں آج کون جیتے گا۔ تو ماہرانہ رائے ہوتی ہے۔ 'جو آج اچھا کھیلے گا وہ ہی جیتے گا'۔ دیکھا! کتنی زبردست ماہرانہ رائے ہے۔ ایسے ہی کسی کے آؤٹ ہونے پر عوام کے علم میں اضافے کے لیئے کہتے ہیں' اگر اس شارٹ کو ایسے نہیں کھیلتا تو آؤٹ ہونے سے بچا جاسکتا تھا'۔

اب تھنک ٹینکس کی سنئے۔ ۱۹۶۵ کی جنگ کے بعد جنرل مانک شا (نام ٹھیک سے یاد نہیں) نے جیت ہار کے جھمیلے میں پڑنے کی بجائے ہماری قوم کے مضبوط اور کمزور پہلوؤں کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ جنگ میں قوم کی یکجہتی پر غور کیا گیا۔ یہ بھی زیرِ غور آیا کہ جنگ کے دوران چوروں نے چوریاں تک چھوڑ دی تھیں۔ جرائم نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ ساری قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی تھی۔ تھنک ٹینکس کی رپورٹ تھی یہ سب اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اس لیئے اتحاد کو ختم کرنا چاہیئے۔ اتحاد ختم ہوا تو، یقین محکم کو ختم کرنے میں آسانی ہوگی۔ اور ان دونوں کی غیر موجودگی میں کیسا ڈسپلن، کہاں کی تنظیم؟ قائدِ اعظم نے یونیٹی، فیتھ اور ڈسپلن (Unity,Faith,Discipline) کا درس دیا تھا۔ ہماری قوم نے اسے پس پشت ڈال دیا اور دانشوروں کو بحث

کے لیئے ایک موضوع ہاتھ آ گیا کہ قائد نے پہلے کیا کہا تھا 'فیتھ' یا 'یونیٹی'۔ دور دور کی کوڑی لائی گئی کہ پہلے یقین محکم ہوگا تو اتحاد بھی ہوگا۔ دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ اتحاد ہوگا تو یقین خود بخود ہو جائے گا۔ ہمارے دانشور اس چکر میں پڑے رہے۔ وہاں ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیئے کام شروع کر دیا گیا۔ ہماری قوم میں سے میر جعفروں کو ہی تلاش نہیں کیا گیا بلکہ اپنے ایجنٹ بھی اس طرح ہماری قوم میں داخل کر دیئے کہ خود ساختہ فیلڈ مارشل سے بنگالیوں کو خوش رکھنے کے لیئے حکم دلوا دیا کہ اب خبروں میں مشرقی کی بجائے پوربو پاکستان کہا جائے اور مغربی کے بجائے پچھمی پاکستان۔ پھر مزید خوش کرنے کے لیئے ہر چیز میں انکے لیئے '56%' اور پچھمی پاکستان کے لیئے '46%' کا کوٹہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد تعصب کا وہ بیج بویا گیا کہ سب کچھ ملیامیٹ ہو گیا۔ نتیجتاً ۷۱ کی جنگ میں ہارنے یا جیتنے کا تذبذب ختم اور شکست کو لاؤڈ اینڈ کلیر (loud & clear) کر دیا اور پوربو پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ پاکستان آدھا رہ گیا۔ لیکن رونا قوم کے لیئے چھوڑ کر، حکمرانوں اور نام نہاد دانشوروں نے بغلیں بجانا شروع کر دی۔ 'آج دو قومی نظریہ اور مضبوط ہو گیا اور ایک نیا پاکستان وجود میں آ گیا۔ اب ہمیں اس کی ترقی کے لیئے کام کرنا چاہیئے۔ قائد بھی یہ ہی چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک اسٹیٹ کی بات نہیں کی تھی، وغیرہ وغیرہ'۔

پھر نئے پاکستان میں پاکستانیوں کی بجائے سندھی، پنجابی، بلوچ اور پٹھان نظر آنے لگے۔ جن کے پاس زبان تو تھی زمین نہ تھی انکا رونا بھی شروع ہو گیا۔ سن آف دی سوئل (Son of the soil) ہونا باعث افتخار ٹھہرا۔ سب بھول گئے کہ مسلمان تو ابوتراب (زمین کا باپ) ہوتا ہے۔ تھنک ٹینکس نے زبان کی بنیاد پر علیحدہ تشخص کے لیئے لوگوں کو ایکسپلوائٹ (Exploit) کرنا شروع کر دیا۔ زبان اور کلچر اہم ہوئے۔ مذہب ثانوی ٹھہرا۔ نفاق کا بیج بویا گیا۔ دانشوروں نے آبیاری کی۔ ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگے کہ مذہب کو اپنے گھروں تک محدود رکھو۔ اجتماعی معاملات میں سیکیولرزم کی اہمیت جتانے کے لیئے قائداعظمؒ کی ایک تقریر سے انہیں سیکیولر ثابت کرتے وقت بھول جاتے ہیں کہ بیسیوں دفعہ قائد نے قران اور مسلم اسٹیٹ کی بات کی تھی۔ اس ضمن میں قائد کی جس تقریر کا حوالہ دیا جاتا ہے، اس کا مفہوم تھا کہ پاکستان بن گیا اب ہم سب پاکستانی ہیں اس لیئے کیا ہندو کیا مسلمان ہم سب کو مل جل کر اس کی تعمیر میں حصہ لینا چاہیئے۔ ہمارے دانشور

شائد چاہتے ہیں کہ قائد کو بحیثیت گورنر جنرل یہ کہنا چاہیئے تھا۔'اب پاکستان بن گیا ہے اس لیئے مسلمانوں کو چاہیئے تمام اقلیتوں کو نیست و نابود کر دیں'۔ ہمارے دانشوروں کو اس تقریر کے بعد کی گئی وہ تقریر یاد نہیں جس میں انہوں نے ماؤنٹ بیٹن سے کہہ دیا تھا کہ اسے ہمارے آئین کے لیئے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمیں ہمارے رسول ﷺ نے چودہ سو سال پہلے ہی قرآن کی صورت میں ایک آئین دے دیا ہے۔

اس ہی طرح امریکی تھنک ٹینکس ہیں جو پاکستان کے ایٹمی قوت بنتے ہی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ان کے سامنے ایک ہی مقصد تھا کہ کس طرح اس قوت کو ختم کیا جائے۔یا تو ایٹمی پروگرام کو ختم کروادیا جائے یا ذہنی طور پر اس قوم کو اتنا کمزور کر دیا جائے کہ یہ ایٹم بم کو خود اپنے لیئے خطرناک سمجھنے لگیں۔اس کے لیئے بڑی گہری چالیں سوچی گئیں۔ جمہوریت ختم کی گئی۔ایک غاصب کو مہرہ بنایا گیا۔ایٹمی پروگرام کے خالق کو رسوا کرانے کے بعد نظر بند کروادیا گیا۔ پھر'9/11' کا ڈرامہ رچایا گیا۔دہشت گردوں کا تعلق پاکستان، افغانستان اور عراق سے جوڑا گیا۔ پھر وار اگینسٹ ٹیررزم (war against terrorism) کے نام پر ڈالرز نے قوم کو سہل پسند بنادیا۔ پہلے اکا دکا اموات پر لوگ دکھی ہو جاتے تھے۔اب دو تین سو کے مرنے کی خبریں دوران لنچ یا ڈنر سن لیتے ہیں۔قوم کو بے حس کر دیا گیا۔شرم اور غیرت صرف کاروکاری تک محدود ہو گئی۔ساری غیرت و حمیت گاؤں گوٹھوں میں رہنے والے ہاریوں، کسانوں اور نچلے طبقے کی میراث بن گئی۔کاروکاری کا ایک بھی واقعہ کسی وڈیرے، کسی زمیندار کسی ملک یا کسی سردار کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ہوسکتا ہے اونچے طبقے میں کوئی عشق جنم نہیں لیتا۔

یہ سب تھنک ٹینکس کا کمال ہے۔تھنک ٹینکس نے پاکستانی حکمرانوں کو اپنے طابع کرلیا۔اور ہماری خارجہ ہی نہیں داخلی پالیسی بھی امریکا کے ذمے ٹھہری۔ یہ ہی نہیں معاشی پالیسی اور بجٹ کی تیاری میں بھی آئی ایم ایف کا مشورہ حکم کا درجہ رکھتا ہے۔تھنک ٹینکس ہماری جڑوں تک کو کھوکھلا کرنے میں لگے ہیں۔ ہماری سیاست، ہمارا دین، ہماری قومی غیرت، ہمارا کلچر ہی نہیں ہماری تجارت تک داؤ پر لگی ہوئے ہیں۔ایسے ایسے منصوبے بنا رہے ہیں کہ ہمارے اپنے وسائل بھی انکے ہاتھوں میں پہنچ کر ہمارے مسائل حل کرنے کے قابل نہیں رہے۔ہمیں اپنے مسائل حل کرنے کے لیئے انکی امداد کی ضرورت رہتی ہے۔تیل کے ذخائر ہوں یا گیس کے۔تانبہ ہو یا

سونا۔ ہیرے ہوں یا کوئیلہ ہم ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔کیونکہ تمام معدنیات نکالنے کا ٹھیکہ غیر ملکیوں کو اس طرح دیا جاتا ہے کہ پورا ''آٹا'' انکا اور ''آٹے کا نمک'' ہمارا۔دکھ ہمیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ تیل نکالنے کے لیئے کھدائی کا دکھ تو ہماری او۔جی۔ڈی۔سی (OGDC) سہتی ہے جبکہ انڈے برٹش پٹرولیم لمیٹڈ (BPL) کو ملتے ہیں اور پاکستانی عوام ہاتھ مَلتے رہ جاتے ہیں۔ان مثالوں سے تھنک ٹینکس اور دانشوروں کا فرق سمجھ میں آ گیا ہوگا۔اب سنا ہے کہ ہمارے یہاں بھی تھنک ٹینکس بنائے جارہے ہیں۔اللہ خیر کرے! کیونکہ دانشور اگر ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا رہے تھے تو نقصان بھی نہیں دے رہے تھے لیکن ہمیں گمان ہے کہ ہمارے تھنک ٹینکس ہمیں کہیں کاری ضرب نہ پہنچا دیں کیونکہ ہمارے تھینک ٹینکس بھی غیروں کے تھنک ٹینکس کے پلان ہی کا نتیجا دکھائی دے رہے ہیں۔۔۔

۱۷/اکتوبر ۲۰۰۹ء

بے ربط

آج جی چاہ رہا ہے کہ ذہن پر جتنے موضوعات حملہ آور ہو رہے ہیں ان سب کو بے ربط کے عنوان سے لکھ دیا جائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اکثر کہانی، کالم، افسانہ لکھتے ہوئے یا شاعری کرتے ہوئے ایسے بھی واقعات ذہن میں آتے ہیں کہ اگر ان کو ضبط تحریر میں لایا جائے، تو یہ چند سطور میں ہی مکمل ہو جائینگے۔ شاعری میں بھی اکثر یہ ہوا کہ بات ایک شعر سے آگے نہ بڑھ سکی۔ دو اشعار ہوئے تو قطعہ کہہ دیا اور اگر یہ مطلع اور رباعی کے وزن میں ہوئے تو رباعی ہوگئی۔ نثر میں اس کا حل ہم یہ نکال رہے ہیں کہ ایک آدھ کالم بے ربط ہی سہی! بس مختلف باتوں کو لکھ دیا جائے، چاہے ان میں کوئی ربط ہو یا نہ ہو۔ مصوری میں یہ ہی مشکل ابسٹریکٹ (abstract) آرٹ بن کر آسان ہوئی کہ الٹی سیدھی بے ربط لکیریں کھینچ دی اور حاصل تصویر کو ایک عنوان دیدیا۔ اگر ناقدین نے حوصلہ افزائی کر دی تو دنیائے مصوری میں تہلکہ مچ گیا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ہم سے پہلے بھی کسی نے اس پر سوچا یا نہیں۔ اگر نہیں تو ہم ایسی کسی بے ربط تحریر کے خالق ہونگے۔ اور نثر کے 'پکاسو' ہونے کا اعزاز حاصل کرلیں گے۔

بے ربط باتیں لکھنے سے ایک اور فائدے کی بھی امید ہے کہ شائد کسی تنقید نگار کی نظروں سے یہ تحریر گذر جائے اور وہ قطرے میں دجلہ دیکھ لے۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ کبھی کبھی تنقید نگار کسی تحریر میں وہ بات دیکھ لیتے ہیں جو مصنف کے خواب خیال میں بھی نہیں ہوتی۔ بالکل اس طرح جیسے ایک بار شیطان کے ساتھ ہوا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک شخص کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا۔ گناہ کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیئے اس نے بڑی جامعہ حکمت عملی اپنائی۔ گناہ سرزد ہو جانے کے بعد اس نے دہائی دی کہ یہ سب کچھ شیطان کا کیا دھرا ہے۔ شیطان یہ سن کر ششدر رہ گیا اور بولا 'جو حکمت عملی اس نے اپنائی وہ تو میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھی'۔ ایک پیر صاحب پہنچے ہوئے تھے، کتنے پہنچے ہوئے تھے وہ مندرجہ ذیل واقعے سے عیاں ہو جائے گا۔ ایک خاتوں نے پیر صاحب سے اس لیئے رجوع کیا کہ بیٹے کی آرزو میں آٹھ بیٹیوں کی ماں بن چکی تھی۔ پیر صاحب نے کہہ دیا کہ

اس بار بھی لڑکی ہوگی۔ اس ہی میں اللہ کی رضا ہے۔ آٹھ لڑکیوں کے بعد پیر صاحب لڑکے کی نوید سناتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ کہیں مونہہ کی نہ کھانی پڑ جائے۔ عورت کے جانے کے بعد اپنے خادم خاص سے شیلف پر سے ایک کتاب اتارنے کو کہا۔ اور کتاب کے آخری صفحے پر اپنے دست مبارک سے لکھ دیا کہ عورت کے اس بار اولاد نرینہ ہوگی۔ اللہ کی مرضی سے جب عورت نے لڑکے کو جنم دیا تو پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی اور پیر صاحب کو اطلاع دی کی اللہ نے اسے لڑکے سے نوازا ہے۔ پیر صاحب مسکرائے اور خادم کو اشارہ کیا کہ وہ کتاب لائے۔ آخری صفحے پر لکھی تحریر دکھاتے ہوئے بولے ''ہمیں تو پہلے سے ہی علم تھا۔ لیکن ہم نے تجھے اس لیئے نہیں بتایا کہ تجھے شادی ءمرگ نہ ہو جائے''۔ عورت بہت خوش ہوئی اور ڈبل نذرانہ پیش کیا اور عقیدت سے سرشار واپس ہوئی کہ واقعی پیر صاحب کی مستقبل پر گہری نظر ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ایک ایسے سیاسی پیر ہیں جو بیک وقت چار پانچ پیشنگوئیاں کر دیتے ہیں پھر ان میں سے جو ایک آدھ پوری ہو جاتی ہے تو اس کا خوب ڈھنڈھورا پیٹا جاتا ہے جس کے شور میں پوری نہ ہونے والی پیش گوئیاں دب کر رہ جاتی ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ایک اور ہیں جو الیکشن میں اپنی ضمانت ضبط کروا کر پیشگوئیاں کرنے لگے ہیں۔ میڈیا بھی شائد انکی تفریح لیتا رہتا ہے اور انہیں بانس پر چڑھاتا رہتا ہے کہ شیخ صاحب آپ کی تو مستقبل پر گہری نظر ہے اور آپ کی پیشگوئیاں تو سچ ہوتی ہیں اس لیئے فرمایئے کہ آپ آئندہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ کوئی نہیں یاد دلاتا کہ شیخ صاحب آپ تو کہتے تھے ''افتخار چودھری ایک گھین ٹے (گھنٹے) کے لیئے بھی بحال نہیں ہوگا''

☆ فیض احمد فیض کا ایک قطعہ بھی ہم اپنے بے ربط کالم میں شامل کر رہے ہیں۔

فکرِ سود و زیاں تو چھوٹے گی
منتِ ایں و آں تو چھوٹے گی
خیر دوزخ میں مے ملے نہ ملے
شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گی

حیدرآباد میں ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے ایک اسسٹنٹ ڈائیریکٹر کو انکے آفس میں گولی مار کر دونوں قاتل موٹر

سائیکل پر بیٹھ کر اس طرح فرار ہوئے کہ سامنے موجود پولس چوکی پر موجود اہلکاروں کو یہ بھی نہیں پتہ چلا کہ دونوں ڈبل سواری کرتے ہوئے آئے بھی اور گئے بھی اور وہ بھی اس وقت جب ڈبل سواری پر پابندی تھی۔لوگ کہتے ہیں تو کیا غلط کہتے ہیں کہ سروے کرا کر دیکھ لو۔اگر ڈبل سواری پر پابندی کے زمانے میں جرائم میں کمی ہوتی ہے تو موٹر سائکل کمپنیوں کو سنگل سیٹر موٹر سائیکل بنانے کا پابند کر دیا جائے۔

☆فیضؔ صاحب حیدرآباد جیل میں تھے۔ایک دن وہ سلاخوں کے پیچھے سے جھانک رہے تھے۔اتنے میں وہاں ایک بوڑھا سنتری آ گیا۔فیض صاحب نے اس سے پوچھا کیا ہم تمہیں جیل میں دکھائی دے رہے ہیں۔سنتری نے مسکراتے ہوئے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا۔ہمیں تو تم جیل میں دکھائی دے رہے ہو۔کیری لوگر بل پر قوم تو نہیں ہاں لیڈران کے درمیان سلاخیں حائل ہوگئیں ہیں۔حزب اقتدار سلاخوں کے ایک جانب ہیں تو حزب اختلاف دوسری جانب۔اِدھر والے کو بل میں قوم کی فلاح نظر آ رہی ہے تو اُدھر والوں کو قوم کی تباہی۔قوم کو چاہیئے کہ آزمالے۔اگر واقعی فلاحی ہوا تو وارے نیارے!! ورنہ غسال کابل سے آئیں گے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ غالبؔ کو یاد کرنے لگے۔ع

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا ، نہ کہیں مزار ہوتا

☆ایک بزرگ بال ترشوانے حجام کے پاس پہنچے۔حجام نے بتایا کہ بالوں میں سفید بال ظاہر ہوگئے ہیں۔ بزرگ نے یہ سمجھ کر کہ اکا دکا ہونگے ،کہا۔انہیں نکال دو۔حجام نے بتاہا کہ جناب بہت زیادہ ہیں تو کہا اس صورت میں کالوں کو نوچ دو۔ایک سیاسی جماعت کی پہچان یہ ہے کہ اس نے بہت قربانیاں دیں،جیلیں کاٹیں اور کوڑے کھائے ہیں۔مخالفین جب کوئی اعتراض کرتے ہیں تو کارکنوں کو یہ یاد دلانا پڑتا ہے۔اگر مناسب ہو تو پارٹی کو چاہیئے کہ ایک کتاب چہ شائع کردے جس میں ان تمام ممبران اسمبلی کے نام ہوں جو جیل گئے ہوں یا کوڑے کھائیں ہوں۔جان کا نذرانہ پیش کرنے والے موجودہ اسمبلیوں میں تو ہو نہیں سکتے،اس لیئے ان کے نام سابق ممبران سینٹ،قومی یا صوبائی اسمبلی کی حیثیت سے شامل کیئے جاسکتے ہیں۔اگر نام زیادہ ہوں تو پھر ان لوگوں کی لسٹ شائع کردی جائے جو ان اعزازات سے محروم رہے ہوں۔انشااللہ مخالفین کے مونہہ بند ہو

جائیں گے۔قارئیں سوچ رہے ہونگے کہ ہم نے ’کتاب چہ‘ کو اس طرح شائد غلطی سے لکھا ہے۔نہیں، یہ ہم نے جان بوجھ کر لکھا ہے کیوں کہ بہت سے لوگ ’کتابچہ‘ کو کتا، بچہ پڑھتے ہیں۔ہم بھی طالب علمی کے زمانے میں سینیماؤں کے بورڈ پر ’آجشبکو‘ کو ’آجش بکو‘ پڑھتے رہے تھے۔ہمارا خیال تھا کہ انہیں ’آج شب کو‘ لکھنا چاہیئے۔

ایک مضمون نگار کو اس وقت بہت صدمہ پہنچا جب مشہور آرٹسٹ ’پکاسو‘ پر ان کا لکھا ہوا مضمون شائع ہو کر انکے سامنے آیا۔کاتب نے یہ سوچکر کہ مضمون نگار ’ر‘ لکھنا بھول گئے، جہاں جہاں پکاسو لکھا تھا وہاں وہاں پکاسو کے آخر میں ’ر‘ اور پکاپرشد(ؔ) کا اضافہ کردیا۔ظاہر ہے مضمون نگار کو سر پیٹتے ہی بنی ہوگی۔اس واقعے کی سند جناب ابن صفی کے پیشرس سے ملتی ہے۔آخر میں گزارش ہے کہ ہم نے شروع میں عرض کر دیا تھا کہ یہ بے ربط کالم ہے جس کا ظاہر ہے نہ کوئی سر ہوگا نہ پیر،اس لیئے امید ہے قارئین اس کو ہمارے اعتراف کے تناظر میں ہی دیکھیں گے۔

۲۳/اکتوبر ۲۰۰۹ء

۔۔۔۔ اور گلاس ٹوٹ گیا

چند برسوں پہلے کی بات ہے ہمارے ملک میں جا بجا ایسے ہوٹل اور ریستوران ملتے تھے جن میں ایک یا ایک سے زیادہ ملازمین چائے اور کھانا بڑی تندہی سے گاہکوں کو پیش کرتے تھے۔ ایسے ملازم 'ٹیبل والا' کہلاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بلِ دینے اور ٹِپ (Tip) لینے کی علت عام نہیں تھی۔ ٹیبل والا پیش کی گئی اشیا کا حساب ذہن میں رکھتا تھا اور جب گاہک اٹھ کر جانے لگتا تو اس کے دروازے کے قریب کاؤنٹر یا گلّے کے قریب پہنچتے ہی آواز لگاتا کہ صاحب سے دو آنے، آٹھ آنے یا اتنے روپے لو۔ اگر کوئی گاہک معلوم کرنا چاہتا کہ اتنے پیسے کیسے بنے تو وہ بڑی چابکدستی سے کھائی ہوئی اشیاء کا حساب بتا دیتا۔ اور گاہک مطمئن ہو جاتا۔ ایسے میں ایک دن ایک ٹیبل والے نے ایک عجیب آواز لگائی 'صاحب نے کھایا پیا کچھ نہیں۔ گلاس توڑا۔ چھ آنے لو' معلوم ہوا بے چارے گاہک کے کچھ کھانے پینے سے پہلے ہی اس سے گلاس ٹوٹ گیا۔ شائد بے چارے کے پاس اتنی رقم نہ تھی اب کچھ کھا بھی سکتا اس لیئے اٹھ گیا اور گلاس کی قیمت مبلغ چھ آنے چکائی اور چلا گیا۔ یہ واقعہ کس شہر میں پیش آیا اس کی تو خبر نہیں لیکن اس ڈائیلاگ ''کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا۔۔۔ چھ آنے لو'' کی گونج ہم نے اپنے شہر اور ملک میں ہی نہیں بلکہ بھارت میں بھی سنی۔ کئی فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں اسے ایک محاورے کے طور پر استعمال ہوتے دیکھا۔ ٹاک شوز کے کئی سنجیدہ پروگراموں میں بھی، سیاستدانوں کو ہی نہیں دانشوروں کو بھی اس جملے کو استعمال کرتے سنا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس جملے کو محاورۃً ہی نہیں ہم نے اپنے ملک میں معنوی اعتبار سے بھی استعمال ہوتے دیکھا۔ جس کی نظیر بھی شائد ہمارے ملک کے علاوہ کہیں نہیں ملے گی۔ کیونکہ ہمارا ہی خاصہ ہے کہ ہم اکثر کھاتے پیتے کچھ نہیں اور گلاس ہی توڑتے رہتے ہیں۔ ہاں! کھانا ہی پڑ جائے تو ۱۰۰ جوتے بھی کھاتے ہیں اور ۱۰۰ پیاز بھی۔ اس کا عملی مظاہرہ حال ہی میں ہونے والے لانگ مارچ کے دوران دیکھنے میں آیا۔ لانگ مارچ اور دھرنے، جہاں

تک ہم سمجھتے ہیں، حکومتوں کو مفلوج کرنے کے لیئے ہوتے ہیں۔ لیکن ہماری حکومت نے یہ کمال کیا کہ لانگ مارچ اور دھرنے سے کئی دن پہلے ہی خود کو مفلوج کر لیا اور اس کے لیئے کنٹینروں کی فراہمی کی مد میں اربوں روپے کا نقصان بھی کر لیا۔ ابھی مارچ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ کنٹینرز لگا کر سڑکیں بند کر دی گئیں۔ آمد و رفت اور سامان کی ترسیل رک گئی۔ پکڑ دھکڑ بھی شروع کر دی گئی۔ اعلانات بھی ہوئے کہ لانگ مارچ اور دھرنے کو ناکام بنانے کی پلاننگ کر لی گئی ہے۔ حکومتی نمائندوں نے اپنی حکومت کا مزاج دیکھتے ہوئے چیف جسٹس کے خلاف بیانات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور ہرزہ سرائی میں ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی کوشش میں ادب و آداب کی ساری حدود بھی پار کر ڈالیں۔ کچھ لیڈر تو زورِ خطابت میں یہ بھی بھول گئے کہ اب میڈیا کا دور ہے اور اگلے پچھلے بیانات کا رکارڈ مونہہ کالا کر سکتا ہے۔ لیکن شائد عقل پر پتھر پڑنا بھی اس ہی کو کہتے ہیں کیونکہ کسی نے کہا کہ چیف سیاسی ہو گئے ہیں تو کسی نے پیشن گوئی کی کہ بحالی کا سوال ہی نہیں۔ کوئی دور کی کوڑی لایا کہ افتخار چودھری کنٹرو ورشل ہو گیا ہے۔ ایک محترمہ نے مشورہ دیا کہ افتخار چودھری کو از خود مستعفی ہو جانا چاہیئے۔ کسی نے کہا کہ ہماری پارٹی نے کبھی بھی بحالی کا وعدہ نہیں کیا اور جب محترمہ بھٹو کی تقریر کا حوالہ دیا گیا کہ وہ بھی بحالی کے حق میں تھیں تو اسے بھی جھٹلا دیا گیا کہ اس بیان میں چیف کا نام کب لیا تھا۔ حد تو اس وقت ہوئی جب میڈیا نے پچھلے بیانات اور اعلانات کی وڈیو دکھا دی لیکن پھر بھی نہ مانے۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ اب چیف صاحب کبھی بحال نہ ہونگے۔ اس لیئے بڑے بڑے دیوقامت سیاستدانوں کے علاوہ تسنیم قریشی اور تنویر عالم جیسے بونے بھی اچھلنے کودنے لگے۔ بہتی گنگا دیکھ کر پنجاب اسمبلی کے ایک سینیئر وزیر نے بھی ہاتھ دھونے کی کوشش کی اور مونہہ کی کھائی۔ مگر مجال ہے جو شرمندہ ہوئے ہوں۔ یہ بھی قدرت کا کرشمہ ہے ورنہ ہم نے اتنی جلدی اس طرح لوگوں کو رسوا ہوتے نہیں دیکھا۔ کیونکہ دھرنے سے پہلے ہی دھڑن تختہ ہو گیا اور چیف کے خلاف زہر افشانی کرنے والے اب جس طرح یوٹرن 'U-Turn' لے رہے ہیں وہ بھی ان ہی کا خاصہ ہے۔ میر تقی میر کو تو قاتل پر رشک تھا کہ جس کے نہ دامن پر کوئی چھینٹ تھی نہ خنجر پر کوئی داغ۔ لیکن ہمیں ان لیڈروں پر حیرت ہے جن کے چہروں پر پشیمانی ہے نہ پیشانی پر پسینہ۔ بڑے طمطراق سے کہہ رہے ہیں ہم نے چیف کو بحال کر کے محترمہ کی وصیت پر عمل کیا ہے۔ اور دیکھ لو ہم نے وعدے کے مطابق صرف ایک

ایکزیٹیو آرڈر سے عدلیہ کو بحال کردیا۔اور اس کے لیئے ہم نے پہلے سے طے کرلیا تھا۔۔بہرحال جس ایکزیکٹیو آرڈر کوایک سال پہلے آنا تھا وہ اس وقت آیا جب پارٹی لیڈروں کی ساکھ مٹی میں مل گئی اور حکومت کو اربوں روپے کا نقصان بھی ہوگیا۔ جب رات کے پچھلے پہر چیف صاحب کی بحالی کا عندیہ ملا تو ہمیں حکومت کا وہی حال دکھائی دیا جو اس گاہک کا تھا جس نے کھایا پیا تو کچھ نہیں لیکن گلاس توڑنے کا مرتکب ضرور ہوا تھا۔اور خوبی دیکھیئے کہ ابھی اس گلاس کی کرچیاں سمیٹی بھی نہیں گئی تھیں کہ دوسرے گلاس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑ گئی جب پنجاب حکومت بحال ہوگئی۔اب حساب لگا لیجیئے کہ نااہلی کے فیصلے سے بحالی تک کیا کھایا اور کیا گنوایا۔۔۔لیکن گلاسوں کے ٹوٹنے کا سلسلہ تو ہنوز جاری ہے کہ خبر آئی ہے کہ سوات معاہدے پر بعد از خرابیٔ بسیار دستخط ہوگئے ہیں۔

۲۵ اکتوبر ۲۰۰۹

بیتھاون سے ہٹلر تک

دنیا کی تقریباً چھ ارب کی آبادی میں آدھی سے زیادہ خواتین ہیں۔ان میں سے ایک اندازے کے مطابق پچاس ساٹھ لاکھ کی عمر اتنی ہوگی کہ مقابلہء حسن میں حصہ لے سکیں (تعداد پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں کہ یہ اس وقت اہم نہیں)۔ان پچاس ساٹھ لاکھ میں سے سو دو سو یا پانچ چھ سو اس مقابلے میں شریک ہوتی ہیں اور پھر صرف ایک مس یونیورس (Miss Universe) قرار پاتی ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ واقعی دنیا میں یہ ہی خوبصورت ترین ہے۔فلمی دنیا میں کسی کے رسائی ہوجاتی ہے اور وہ فن کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔رسائی ہونے میں قسمت کا دخل ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کوئی دوسرا ہوتا تو شائد وہ بھی یہ مقام حاصل کرلیتا۔ایسے ہزاروں ہونگے جو دلیپ کمار، ندیم یا مارلن برانڈو بن سکتے اگر انہیں موقع فراہم ہو جاتا۔پرائیویٹ کمپنیوں میں بھی دیکھا گیا ہے کہ فیملی بیک گراؤنڈ، دوستی، سفارش، چاہے چمچہ گیری کی صورت میں ہو آگے بڑھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے اور پھر ''خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے''۔فیملی اسٹیٹس ہی نہیں کبھی کبھی تو وہ لوگ بھی ترقی کر جاتے ہیں جنکا کوئی بیک گراؤنڈ نہیں ہوتا لیکن، بیر، وہسکی، فلاش یا برج (Beer, Whisky, Flash or Bridge) کے شوقین ہوتے ہیں۔بس اخلاقی پسماندگی کام آجاتی ہے۔اور وہ خوب ترقی کرتے ہیں۔کیونکہ دیکھا یہ ہی گیا ہے کہ ایک پرہیزگار دوسرے کا اتنا خیال نہیں کرتا، جتنا ایک شرابی دوسرے کا۔پھر محرومین اپنی قابلیت کے ٹوسٹ پر اخلاق و اخلاص کا جام لگا کر چاٹتے رہ جاتے ہیں کچھ لوگ قابل ہوتے ہوئے بھی پہلے سے موجود لوگوں کی اجارہ داری کی وجہ سے محرومیت کا شکار ہوجاتے ہیں تو کچھ لوگ قسمت سے مار کھا جاتے ہیں۔ان چند مثالوں کے علاوہ اور بھی ہیں لیکن وہ سب بھی ان مثالوں میں بتائی گئی بنیادوں پر ہی ایستادہ ہیں۔اگر زیادہ باریک بینی سے دیکھیں تو اسے قسمت یا مواقع کا نام دے سکتے ہیں قسمت کی ایک بہترین مثال ہے کہ جرمنی کا مشہور سماعت سے محروم آرٹسٹ بیتھاون

(Beethowen) پیدا ہونے سے پہلے ہی اگر ڈاکٹروں کے مشورے پر اقساط حمل کا شکار ہو جاتا تو دنیا ایک بہترین موسیقار سے محروم رہ جاتی۔ یہ اس کی قسمت تھی کہ اسے پیدا ہونے سے نہیں روکا گیا۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ اخلاق کے فقدان کے باوجود قوموں کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیئے قسمت نے روزویلٹ اور چرچل کو موقع فراہم کر دیا۔ دونوں میں سارے شرعی عیب یک جا تھے لیکن ان میں سے ایک امریکا کا صدر اور دوسرا برطانیہ کا وزیر اعظم بنا۔ افسوس تو اس وقت ہوتا ہے جب ہم جیسی قومیں نہ جانے کیوں آج بھی انکے گن گاتی ہیں جنہوں نے ہمیں لوٹا ہی نہیں بلکہ پستیوں میں اس طرح ڈالدیا کہ ہم میں غیرت اور حمیت نام کی کوئی چیز نہیں رہی۔ مانا کہ ہٹلر نے بہت ظلم ڈھائے مگر کس پر؟ کیا مسلمانوں پر؟ نہیں تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان ممالک بھی ہٹلر کو قابل نفرت گردانتے ہیں۔ اس نے کیا کیا تھا؟ اس نے برطانیہ، اٹلی فرانس اور دوسرے یورپی ممالک بشمول روس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ روزویلٹ اور چرچل کی طرح ہٹلر اخلاق باختہ نہیں تھا۔ نہ شرابی نہ عورتوں کا رسیا۔ چرچل کی طرح نہ تھا کہ لوگ اسے عشائیے میں مدعو کرنے سے گریز کرتے تھے کیونکہ مدہوش ہو جانے کے بعد اس کا طرز عمل خواتین کے ساتھ ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔ شرابی ہی نہیں افیون کا بھی شوقین تھا۔ وزیر اعظم برطانیہ کی حیثیت سے اس کی پارلیمنٹ میں کی گئی ایک تقریر آج بھی رکارڈ پر ہے جو اس نے ایک خاتون کی تقریر کے جواب میں کی تھی۔ اس تقریر کے غیر اخلاقی ہونے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ ہم اسے یہاں نقل نہیں کر رہے ورنہ یہ برطانیہ کی پارلیمنٹ کے رکارڈ پر ہے۔ طرفہ تماشہ ہے کہ اسے حذف بھی نہیں کیا گیا۔ اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو ایک لمبی لسٹ ایسے حکمرانوں کی تیار ہو جائے گی جنہوں نے ظلم زیادتی، قتل وغارت اور ناانصافی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مگر المیہ یہ ہے کہ وہ تمام لیڈر قابل احترام ٹہرے جنہوں نے جنگ جیت لی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جیتنے کے بعد ساری برائیاں ہارنے والے پر ڈالدی جاتی ہیں۔ ہٹلر اگر جیت جاتا تو اس کے اعلیٰ اخلاق کی مثالیں دی جاتیں۔ چرچل کی اخلاقی گراوٹ زبان زد و عام ہوتیں۔ ہٹلر جیت جاتا تو بتاتا کہ اس نے یہودیوں کا قتل عام کیوں کیا تھا۔ کیا پہلی جنگ عظیم میں جو کچھ یہودیوں نے جرمنز کے ساتھ کیا، کیا وہ قابل معافی تھا۔ وہ بتاتا کہ اس نے ایمبولنس اور ہسپتالوں پر حملے کیوں کیئے۔ کیا یہ اتحادیوں کی غیر اخلاقی حرکت نہ

تھی کہ انہوں نے ایمبولنسوں کو فوجی مقاصد کے لیئے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اگر آج کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہودیوں کے ساتھ جو کچھ اس نے کیا، کیا اس سے زیادہ اسرائیل اور امریکہ مسلمانوں کے ساتھ نہیں کر رہے۔ پھر امریکی پروپیگنڈے کا کمال دیکھئے کہ مسلمان ہٹلر کو گالیاں دینے میں سب سے آگے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ بھئی اس نے مسلمانوں کا کیا بگاڑا تھا۔ ٹرکی تو اس کا ساتھی تھا۔ ٹرکی کے ساتھ انگریزوں نے کیا کیا؟ سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ، کیا ہٹلر نے کیا تھا؟ سلطنت مغلیہ کو کیا ہٹلر نے تاراج کیا تھا۔ ایٹم بم کیا ہٹلر نے گرایا تھا؟ ہماری دانست میں تو ایک بھی ایسا اسلامی ملک نہیں جس پر ہٹلر نے چڑھائی کی ہو۔ جبکہ آج تک جو بھی مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے اس میں سو فی صد امریکا، برطانیہ یا روس کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ ہٹلر نے یہودیوں کو مارا، اس کے حمائیتیوں نے یہودیوں کے آنسو پونچھنے کے لیئے انہیں زمین کا ایک ٹکڑا فلسطینیوں کے درمیان دلوادیا۔ کینڈا اور آسٹریلیا میں آباد کرنے کا خیال نہیں آیا جہاں آج بھی اتنی زمین موجود ہے کہ دونوں ممالک کو اکثر امیگرنٹس (Immigrants) کے لیئے اشتہار دینے پڑتے ہیں۔ ہماری قوم انگریزوں کے انصاف کی بھی مداح ہے جس نے ہندوستان کے بٹوارے کے وقت مسلمانوں کا حق مارنے سے گریز نہیں کیا۔ کشمیر، دکن اور جونا گڈھ اس کی ایک مثال ہیں۔ یو این او کی قرارداد پر بھی (جس کے تحت کشمیر میں رائے شماری کروانا تھا) عمل نہ کرانا امریکیوں اور اس کے اتحادیوں کی ہی چال ہے۔ افسوس ہم مسلمان نہ جانے کب کھوٹے کھرے میں تمیز کرنے کے قابل ہونگے۔ میر تقی میرؔ کی سادگی سے ہماری قوم اتنی متاثر ہے کہ جس کی وجہ سے بیمار ہوتی ہے علاج بھی اس ہی سے کروانا چاہتی ہیں۔ سبحان اللہ جو زخم پر زخم دیتا ہے اس کی دیوانی اور جس نے مسلمانوں کو تو نہیں لیکن اس کے دشمن کو مضروب کیا اس کو گالیاں دینے میں آگے آگے۔۔

۳۰/اکتوبر ۲۰۰۹ء

درخواست

بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ آخرت میں سب سے زیادہ سخت پکڑ علماء کی ہوگی۔ بڑا عجیب محسوس ہوتا تھا کیونکہ ہماری ناقص عقل کے مطابق برے سے برا مولوی بھی ایک عام آدمی سے تو زیادہ ہی متقی اور پرہیزگار ہوگا۔ کچھ بڑے بلکہ یوں کہیے کہ بوڑھے ہوئے (یعنی حالیہ دور میں) تو تواتر سے سن رہے ہیں کہ بری سے بری جمہوریت بھی آمریت سے بہتر ہوتی ہے۔ اس سے ہمارے خیال کو تقویت ملی کہ برے سے برا مولوی عام آدمی سے بہتر ہوتا ہے۔ سوچتے تھے کہ پھر کیوں انکی پکڑ سخت ہوگی۔ سوچ بچار میں کئی دہائیاں گذر گئیں۔ پھر ہم نے سوچا یہ اللہ کا معاملہ ہے، ہم کیوں اس چکر میں پڑ رہے ہیں۔ نہ ہم مولوی، نہ بننے کا ارادہ ہے۔ اس لیئے سوچنا بند کر دیا۔ لیکن کیا کبھی ایسا ہوا ہے۔ کیا آدمی سوچنا بند کر سکتا ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جو آدمی کے بس میں نہیں ہوتیں۔ مثلاً اکثر اینکر پرسن پروگرام کے آخر میں کہتے ہیں 'اپنا اور اپنے اردگرد کے لوگوں کا خیال رکھیے گا'۔ یہ نہیں بتاتے کہ کیسے؟ ہمیں اس پر ہنسی آتی ہے جب کوئی ہم سے کہتا ہے اپنا خیال رکھیے گا۔ ارے بھئی کیسے رکھیں؟ اکثر ڈاکٹروں کو بلڈ پریشر کے مریضوں کو یہ مشورہ دیتے سنا ہے 'ٹینشن بالکل نہ لیں۔ کسی بات کا غم نہ کریں۔ زیادہ نہ سوچیں۔ واک کیا کریں اور کھانے میں احتیاط برتیں'۔ چلیے واک ہو جائیگی، کھانے میں پرہیز بھی ہو جائیگا لیکن ٹینشن نہ لینے کا کیا طریقہ ہوگا۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ سوچنا کیسے چھوٹے گا' خیر ہم نے بہت کوشش کی کہ سوچنا چھوڑ دیں لیکن نہ چھوڑ سکے۔ اور سوچتے رہے جس سے معلومات میں اضافہ بھی ہوا اور کچھ کچھ علم بھی ہوا کہ مولوی حضرات پر یہ سختی کیوں؟ واقعی اللہ بہتر جانتا ہے۔ ہمیں تو یہ بات سیاست میں ملوث مذہبی جماعتوں کی بدولت ہی معلوم ہو سکی۔ ہو سکتا ہے غیر سیاسی مولوی بھی سیاسی مولویوں سے پیچھے نہ ہوں لیکن وہ ایکسپوز نہیں ہوتے۔ مذہب کے نام پر فرقہ واریت! مذہب کے نام پر مطلب براری! مذہب کو وجہ بنا کر مخالفین کو کافر قرار دینا۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے اقدام ایک عام آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ مسلمانوں کو آپس میں لڑوانا۔ قرآن کے منافی چلنے کی ہمت ایک عام آدمی میں کہاں؟ ایک عام آدمی کے کسی غلط قدم کا خمیازہ اکا دکا کو ہی بھگتنا ہوتا ہے لیکن مولویوں کی وجہ سے تو سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ

اپنی راہ کھوٹی کر لیتے ہیں اور ستم بالائے ستم گناہ بھی نہیں سمجھتے بلکہ اسے عین ثواب گردانتے ہیں۔ عام زبان میں یوں سمجھئے کہ ایک نمازی اگر نماز میں کوئی غلطی کرتا ہے تو اس پر صرف اس کو گناہ ہوگا لیکن پیش امام کی کوتاہی پر سب کی ذمہ داری بھی مولوی پر ہوگی۔ اس لیئے مولوی کی پکڑ زیادہ ہوئی نا!!۔

یہ مولویوں کا ہی تو کارنامہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان بٹ گئے۔ کچھ پاکستان کی موافقت میں تو کچھ مخالفت میں۔ ہم حیدرآباد میں پڑھے ہیں لیکن حیدرآبادی یا اسکول کی نسبت سے بونا وینچیرین (Bonaventurian) نہیں کہلائے۔ جبکہ دیو بند اور بریلی میں پڑھنے والے۔ دیو بندی اور بریلوی بن گئے۔ اور وہ بھی ایسے کہ اپنی اپنی مساجد بھی بنوالیں۔ مولویوں نے ہی تو اہلحدیث، اہلسنت، اہل تشیع۔ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کی داغ بیل ڈالدی۔ ہم جب کلین شیو (Shaved Clean) تھے اور نماز روزے سے بھی غافل تھے تو کسی نے نہیں پوچھا کہ ''تم ہو کون؟ تمہارا مسلک کیا ہے؟''۔ لیکن جب اللہ نے توفیق دی اور نمازیں شروع کیں اور داڑھی رکھ لی تو ایک دوست نے یہ دیکھ کر کہ ہم نے مونچھیں نہیں رکھیں، پوچھا ''کیا تم دیو بندی ہو۔ ہم نے جواباً کہا۔ 'نہیں'۔ تو پوچھا۔ 'اہل حدیث'؟ جواب نفی میں پا کر بولا ''اچھا تو کیا بریلوی ہو؟'' سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن اسے بتایا ''ہم یہ سب نہیں جانتے۔ بس مسلمان ہیں۔ جب قبر میں یہ سوال نہیں پوچھا جائے گا تو ہم اس چکر میں کیوں پڑیں''۔ تو بولا' بھئی کسی نہ کسی کا ہونا ضروری ہے ورنہ آخرت میں کس کے ساتھ کھڑے ہوگے۔ یہ ہمارے لیئے بالکل نئی تھی اس لیے ہم نے ہنس کر کہا۔' حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ یا حضرت امام حسنؓ و امام حسینؓ اور وہ تمام مسلمان جو، ان مسالک سے پہلے گذرے ہیں، جس کے ساتھ کھڑے ہونگے، اس کے ساتھ ہم بھی کھڑے ہو جائیں گے '۔ سن کر خاموش ہو گیا۔ بات آئی گئی ہوگئی اور ہماری توجہ صرف نماز روزوں پر ہی رہی۔ حقوق اللہ کی طرف تو ہم بہت بعد میں آئے لیکن حقوق العباد سے ہم کبھی غافل نہیں ہوئے۔ وجہ یہ رہی کہ کونوینٹ میں پڑھتے تھے اور ہمارے اساتذہ عیسائی ہونے کے باوجود جتنا ہمارے رسول ﷺ کی سنت پر عمل کرتے تھے اتنا ہم لوگ نہیں کرتے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ اگر وہ کلمہ پڑھ لیں تو ہم سے بہتر مسلمان ہونگے۔ ہمسائے کا جتنا وہ خیال رکھتے ہیں ہم نہیں رکھتے۔ نماز ہمیں ڈسپلن کا درس دیتی ہے لیکن جتنا ڈسپلن یورپ و امریکہ میں نظر آتا ہے

اتنا ہماری مساجد میں بھی نہیں ملتا۔ آج یہ ذکر اس لیے لے بیٹھے کہ ابھی ابھی ایک مولانا کے بارے میں ایسی خبر نظروں سے گذری کہ ہنسنے کے علاوہ کچھ اور نہیں کر سکتے تھے۔ ہنسی رکی تو ایسی تلخ سنجیدگی چھائی کہ قلم اٹھاتے بنی۔ خبر تھی۔ 'ایک مولانا حج پر روانہ ہو گئے۔ درخواست کے باوجود سعودی عرب نے شاہی مہمان کا درجہ نہیں دیا'۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مولانا نے حج پر روانگی سے پہلے سعودی عرب سے درخواست کی تھی کہ ایک سیاسی جماعت کے سربراہ اور پارلیمانی کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے انہیں سعودی عرب میں رہائش اور شاہی مہمان کا درجہ دیا جائے۔ سعودی حکومت نہ جانے کس پریشانی میں تھی کہ مولانا کی درخواست کو شرف قبولیت نہ مل سکی۔ یہ مولانا کا بڑا پن ہے کہ اس بے اعتنائی کے باوجود آپ حج کے لیئے روانہ ہو گئے۔ وقت کم تھا ورنہ ہو سکتا ہے ہماری دریادل حکومت انہیں اپنی پسندیدہ سرکاری 'پجیرو' ساتھ لے جانے کی سہولت فراہم کر دیتی۔ ہوسکتا ہے پھر سعودی حکومت کو بھی احساس ہو جاتا اور ازالے کے طور پر مولانا کو اپنی گاڑی میں بیٹھ کر طواف کی اجازت دیدیتی۔ گاڑی میں بیٹھ کر سعی کرنے میں بھی آسانی ہوتی۔ شیاطین کو کنکریاں مارتے وقت ان کے شر سے بھی محفوظ رہتے۔

اس خبر کے نتیجے میں ہنسی، پھر تلخ سنجیدگی کے نتیجے میں یہاں تک لکھ پائے تھے کہ پھر ہنسی آ گئی۔ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ مولویوں کی پکڑ سخت کیوں ہوگی۔ واقعی اللہ بہتر پلانر (Planner) ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اس ہی لیئے مولانا کی درخواست رد کروادی ورنہ درخواست کی قبولیت کے بعد کچھ بعید نہ ہوتا کہ مولانا ایک درخواست اللہ تعالیٰ کو بھی بھجوادیتے کہ میں ایک مذہبی کم (Cum) سیاسی جماعت کا سربراہ ہی نہیں بلکہ ہر دور میں کسی نہ کسی پارلیمانی کمیٹی کا چیرمین رہتا چلا آیا ہوں اور جس شاخ پر بیٹھتا ہوں اس کو کاٹنے سے بھی گریز کرتا ہوں۔ وردی کا مسئلہ ہو، سترھویں ترمیم کا یا تحلیل سرحد اسمبلی کا، میں نے ہمیشہ درخت کا ساتھ دیا ہے۔ حتیٰ کہ وعدے وعید کے بارے میں بھی درخت کی ہی ہم نوائی کی۔ اب چاہے درخت مضبوط آمریت کا ہو یا لرزتی جمہوریت کا۔ میں نے پرواہ نہیں کی۔ اس لیے مجھے عام مولویوں کی سخت پکڑ سے استثنا دی جائے۔

۱۹ر نومبر ۲۰۰۹ء

خالی جگہ پُر کرو

اردو شاعری میں ایک مصرعہ بڑا مشہور ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کسی بھی دوسرے مصرعے کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔ اتنا ضروری مصرعہ۔ اور ہماری لاپرواہی !!۔ کہ ہمیں ٹھیک سے یاد ہی نہیں آ رہا۔ بہرکیف اپنے تجربے سے اس کو قابلِ قبول صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شائد کام بن جائے۔ دوسری صورت میں بھی کوئی ''واندہ'' نہیں کہ اس طرح سے صاحب طرز حضرات کو یاد کرنے کا موقع فراہم ہو جائیگا۔ یہ بھی گھاٹے کا سودا نہیں کہ ہم بحیثیت قوم بھی سب کچھ بھولتے جا رہے ہیں۔ اگر ہماری وجہ سے کچھ باتیں یاد آ جائیں تو کیا برا ہے۔ اگر مصرعہ غلط بھی ہوا تو کیا مضائقہ؟ اب تو اچھے اچھے کالم نگار اور صاحب طرز نامہ نگار بھی غلط اشعار ہی نہیں، غلط محاورے اور غلط املا بھی لکھ دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں 'اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'۔ بات سمجھ میں آ گئی! تو بس پھر ٹھیک ہے'۔ اور بات بھی ٹھیک ہی ہے کہ اب تو اردو کی خبریں پڑھنے والے بھی تلفظ کا خیال نہیں رکھتے۔ کیونکہ خبروں کا مقصد خبریں پہنچانا ہے۔ گرامر پڑھانا نہیں۔ جی! تو بات ہو رہی تھی ایک ایسے مصرعے کی جو کسی بھی شعر کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔ مصرعہ ہے

حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا

آیئے ایک دو مثالیں دے کر دیکھتے ہیں۔ اس کے لیئے چند مشہور و معروف شعرا کے مصرعوں سے استفادہ کیا ہے۔

غالبؔ۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا

جگرؔ۔ پیتا بغیر اذن یہ کب تھی میری مجال
حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا

فیضؔ۔ فیضؔ وہ زندہ رہیں، ہیں تو صحیح

حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا

طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو مزید مثالیں بھی دی جاسکتی تھیں۔ ویسے بھی یہ ہمارا آج کا موضوع نہیں بلکہ یہ بھی عادتاً تمہید باندھ رہے ہیں تاکہ جو کچھ کہنا چاہ رہے وہ سمجھا بھی سکیں ورنہ ہم تو ایک ایسے بیان کی تلاش میں تھے جو اس مصرعے کی طرح ہر واقعے پر باآسانی فٹ ہوجائے۔ پھر ہماری مشکل آسان ہوگئی اور وہ بھی اس سیاستدان کی بدولت جس کے بارے میں ہمیں کوئی خوش فہمی نہیں۔ اتفاق سے ہم ان کا اور ان کی جماعت کا مطالعہ کررہے تھے۔ اس کے لیئے ہم نے پاکستان بننے سے پہلے سے لیکر اب تک کا جائزہ لیا اور گوہر مقصود ہاتھ آ گیا۔ گوہر مقصود ہاتھ تو آ گیا لیکن ؎

'نہ جانے کتنی کشاکش سے، کتنی کاوش سے'۔

اس کے لیئے ہم نے مندرجہ ذیل طریقہ اپنایا:۔۔۔

(الف)۔ اس پارٹی کے تقسیم ہند کے بارے میں پالیسی بیانات کا جائزہ لیا۔ (اس سے ہمیں دلی تکلیف پہنچی)

(ب)۔ پاکستان بننے کے بعد اس پارٹی کے بیانات کو مدنظر رکھا۔ (ان سے ہمیں معلوم ہوا کے یو ٹرن کسے کہتے ہیں)

(ج)۔ مذکورہ سیاست دان کے مختلف مسائل پر مختلف ادوار میں دیئے گئے بیانات کو پرکھا۔ (ان سے اس مصرعے کے معنی سمجھ میں آ گئے)

''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' ؎

(د)۔ کچھ تحریف وقیاس (interpolation & extrapolation) کا بھی سہارا لیا لیکن فقط اپنی پیش کی گئی 'خالی جگہیں پر کرنے کے لیئے'۔

خیر خوشی کی بات ہے کہ ہمیں کامیابی ہوئی اور ایک ایسا پالیسی بیان ہاتھ لگ گیا جسے ہم اس مصرعے کی طرح ہر پیش آنے والے مسئلے سے منسلک کرسکتے ہیں۔ بیان ملاحظہ فرمایئے۔

''اس سے زیادہ اہم مسئلہ ملکی سلامتی ہے''

اب ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ بیان لکھ کر لفظ'' اس'' کی بجائے خالی جگہ رکھ دیں تو خالی جگہ پُر کرنے کے لیئے ایک بہترین سوال بن سکتا ہے

مثلاً:۔ نیچے دیئے گئے مسائل میں سے کون کونسے مسائل خالی جگہ پُر کرنے کے کام آ چکے ہیں۔ نیز ان مسائل کی بھی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو آئندہ اس جگہ کو پُر کرسکتے ہیں

'' ۔۔۔۔۔ سے زیادہ اہم مسئلہ ملکی سلامتی ہے ''

(۱)۔ تقسیم ہند (۲)۔۔ وردی (۳)۔ عدلیہ کی بحالی

(۴)۔ احتساب (۵)۔ وعدوں (۶)۔ ۱۷ویں ترمیم

(۷)۔ این۔آر۔او (۸) کشمیر (۹)۔ مڈٹرم الیکشن

(۱۰) بنیادی حقوق

(۱۱)۔ بنیادی ضرورتیں بشمول پانی، بجلی اور گیس۔ آٹا، دال اور چینی

اب آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس بیان کو کہاں کہاں استعمال کرسکتے ہیں۔ خیال رہے کہ اس کے استعمال سے ذاتی فوائد حاصل کرنا شرط ہے۔

۴ر نومبر ۲۰۰۹ء

شکریہ فوزیہ وہاب

اسکول کے زمانے میں ہم ڈکٹیشن لینا پسند نہیں کرتے تھے لیکن مجبوری تھی۔ انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی ڈکٹیشن یا املا ہوتا تھا۔ ناپسندیدگی کی وجہ یہ تھی کہ ہم بلڈ (Blood) کو (Blud) اور سائیکولوجی (Psychology) کو (Cychology) لکھ مارتے تھے۔ نالج (Knowledge) میں 'K' نہیں لگاتے تھے اس لیئے نالج سے محروم ہی رہے۔ اردو میں بھی 'بالکل' کو ہمیشہ 'بلکل' اور صورت کو سورت تو کبھی سیرت کو صیرت لکھ دیتے اور پٹتے تھے۔ اس لیئے ڈکٹیشن لینا ہمیں پسند نہیں تھا۔ ہاں جب ہم خود کچھ قابل ہوئے تو سب سے اچھا کام ڈکٹیشن دینا لگتا تھا۔ صبح ہی صبح سیکریٹری کو ڈکٹیشن کے لیئے طلب کرتے اور فخریہ چند لائینیں ڈکٹیٹ کر دیتے۔ لفظ 'ڈکٹیشن' اس کے علاوہ ہم نے کہیں اور نہیں سنا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ کچھ الفاظ کسی نہ کسی حکمران کے دور میں مشہور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً 'اکاؤنٹیبلٹی (Accountability) ضیاالحق کی پہلی تقریر سے مشہور ہوئی۔ ہوسکتا ہے یہ لفظ پہلے بھی سنا ہو لیکن پوری طرح آگاہی ضیا دور میں ہی ہوئی۔ اس ہی طرح بعد کے حکمرانوں نے ڈکٹیشن نہ لینے کی، اور خاص طور پر امریکہ سے ڈکٹیشن نہ لینے کی ایسی رٹ لگائی کہ ہم سمجھنے لگے کہ ہمارے حکمرانوں کی انگریزی ٹھیک نہیں، اس ہی لیئے ڈکٹیشن لینے سے گھبراتے ہیں۔ ایک تو انگریزی زبان اور وہ بھی امریکن! یعنی کڑوا اور وہ بھی نیم چڑھا اور واقعی سچ کہا ہے کسی نے ''انگریزی زبان ہے ہی عجیب۔ 'Put' اور 'But' کو ہی دیکھ لیجئے۔ ایک میں پیش تو دوسرے میں زبر ایک پُٹ اور دوسرا بَٹ۔ سبزی خور کو تو کہتے ہیں، ویجی ٹیرین (Vegetarian)۔ لیکن آدم خور کو ہیومن ٹیرین (Humaniterian) نہیں کہتے''۔ ان کے ہاں پیروں کے لیے فیٹ اسمیلس (feet smells) استعمال ہوتا ہے جبکہ ناک کے لیئے نوز رنس (Nose Runs)۔ دوڑنے والے پیروں کے ساتھ سونگھنا اور سونگھنے والی ناک کے ساتھ دوڑنے کی ترکیب آپ کی سمجھ میں آتی ہو، تو ہو، ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

چونکہ ہم خود ڈکٹیشن سے گھبراتے تھے اس لیئے ہمیں حکمرانوں سے ہمدردی ہوگئی۔ یہ تو بعد میں کسی نے بتایا کہ ڈکٹیشن لینے سے مراد کچھ اور ہے۔ آگاہی ہوئی کہ لوگ مشرف پر جب الزام لگاتے تھے وہ امریکیوں کے کہنے پر عمل کرتا ہے تو وہ تردید کرنے کہ لیئے کہتا تھا کہ میں کسی سے ڈکٹیشن نہیں لیتا۔ مطلب یہ کہ میں اپنے فیصلے خود کرتا ہوں۔ بہرحال اس سے ہمارے علم میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ایک اور لفظ 'گراؤنڈ ریلیٹی' بھی ہم نے دور مشرفی میں ہی سیکھا۔ فنڈامینٹلزم (Fundamentalism) کو ایک برائی کے طور پر بھی اس ہی دور میں پیش کیا گیا۔

حالانکہ ان الفاظ کو آمریت کے ساتھ ہی دفن ہو جانا تھا لیکن نہ جانے کیوں ان الفاظ کی بازگشت جمہوریت میں بھی گونجتی رہی۔ تقریباً روزآنہ ہی حکومتی نمائندے یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ ہم ڈکٹیشن نہیں لیتے اور ہم اپنے فیصلے خود کرتے ہیں۔ جبکہ ہمارا خیال ہے کہ ان کے قول و فعل میں واضع تضاد نظر آتا ہے۔ آج جتنا امریکی نمائندے ہمارے ملک میں رہتے ہیں اتنا تو ہمارے لیڈر بھی یہاں نہیں رہتے۔ پھر یہ ہی تجربے میں آیا ہے کہ وہ اپنی بات منوانے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں اور ہمارے حکمران ان کا حکم تو مانتے ہیں لیکن ڈکٹیشن بالکل نہیں لیتے، کیونکہ سارے حکمنامے پہلے سے ٹائپ شدہ ہوتے ہیں۔ ان پر دستخط بھی نہیں ہوتی تاکہ کوئی سند ہی نہ رہے اور بوقت ضرورت بھی کام نہ آسکے۔ اب ان حالات میں عام لوگوں کا تو نہیں لیکن پڑھے لکھے لوگوں کا پریشان ہونا ایک حقیقت ہے۔ بیانات پڑھتے ہیں، تجزیہ نگاروں کی سنتے ہیں۔ غیر ملکی اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ فیصلے کوئی اور ہی کرتا ہے۔ جتنی شدومد سے یہ الزام لگتا ہے اتنی ہی زوروں سے تردید ہوتی ہے۔ ''ہم ڈکٹیشن نہیں لیتے''۔ ہم جیسے لوگ پریشان ہو جاتے ہیں کہ

برا کس کو جانوں ، بھلا کس کو مانوں
یہ سب عیب مجھ میں، میں بہروپیا ہوں

اس تذبذب کی کیفیت میں فوزیہ وہاب کا ایک ایسا بیان سامنے آیا جس پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں ''تیری آواز مکے اور مدینے'' کیونکہ اس بیان نے ساری الجھنیں سلجھا دیں۔ بیان بھی ایسا کہ جس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ فوزیہ وہاب نے ایک ہی سانس میں ایسے ایسے انکشافات کیے ہیں کہ ان کا شکریہ کرنے کے علاوہ کوئی

چارہ ہی نہیں۔انہوں نے ایک اینکر پرسن کو رحمٰن ملک کے حوالے سے بتایا کہ ۱۵ مارچ کو نواز شریف، امریکہ کی اس یقین دہانی کے بعد ہی باہر نکلے تھے کہ تمام رکاوٹیں ہٹادی گئیں ہیں۔یہ بھی بتایا کہ امریکی سفیر کا صبح ہی صبح رحمٰن ملک کو فون آیا تھا جس میں نواز شریف کو گرفتار نہ کرنے کا کہا گیا تھا۔ملک صاحب نے ایسا ہی کیا۔سچائی کا ثبوت یہ ہے کہ واقعی نواز شریف کو گرفتار نہیں کیا گیا۔اس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ امریکن سفیر نے کوئی ڈکٹیشن نہیں دیا تھا۔ملک صاحب نے فقط احترام میں این پیٹرسن کی بات مانی تھی بس۔

دوسری طرف حنیف عباسی کی باتوں سے پتہ چلا کہ نواز شریف کسی کی نہیں سنتے، کیونکہ وہ گھر سے نکل پڑے تھے ۔حالانکہ وزیر داخلہ نے بتا دیا تھا کے مبلغ آٹھ عدد بمبار، جس کے نصف چار ہوتے ہیں، راستے میں کھڑے ہیں۔انہوں نے تورچرڈ ہالبروک کی بھی نہیں مانی۔جنہوں نے نواز شریف کو باہر نکلنے سے منع کیا تھا۔اور تو اور دوسرے دوست ممالک نے بھی منع کیا تھا لیکن نواز شریف نے ان کی بھی نہیں مانی۔حد ہو گئی!!!

ہمیں اس پر تشویش ہے کہ اس طرح تو نواز شریف سارے دوستوں کو ناراض کر دیں گے۔کم از کم انہیں رحمٰن صاحب سے سبق سیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے کوئی ڈکٹیشن لیئے بغیر این پیٹرسن کی بات مان لی تھی۔بہر حال ہم فوز یہ وہاب کے شکر گذار ہیں کہ قوم کو اس تذبذب سے تو نکالا اور اب ہماری قوم یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ ہمارے حکمران ڈکٹیشن لیتے ہیں یا نہیں لیتے۔ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو فوز یہ وہاب جیسی ترجمان عطا کرے پھر اسے الگ سے کوئی دشمن رکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ویسے بھی یہ ٹو ان ون (two in one) کا زمانہ ہے۔

۸/نومبر ۲۰۰۹ء

لطیفہ، گانے اور محاورے

بہت پہلے ایک لطیفہ سنا تھا، بہت پہلے سنا تھا اس لیے ہنسی بھی بہت آئی تھی۔اب اتنے زیادہ لطیفے سن چکے ہیں کہ بہت کم ہنسی آتی ہے۔ہنسی کم آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب ایک ہی لطیفے کے کئی کئی ورژن (version) آنے لگے ہیں۔دیکھا جائے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑنا چاہیے۔لیکن فرق اس وقت پڑتا ہے جب نیا ورژن پہلے والے سے کم تر ہوتا ہے۔بات سمجھانے کے لیے ملکہ ترنم نور جہاں کے ان گانوں کا سہارا لیا جا سکتا ہے جنہیں ٹی وی کے کرتا دھرتا نہ جانے کیوں کسی دوسری گلوکارہ سے دوبارہ گواتے ہیں۔اگر نور جہاں کی گائیکی میں کوئی کسر رہ گئی ہو یا نئی گانے والی ان سے 'بیس (۲۰)' ہو تو کوئی حرج نہیں لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہوتا۔۲۰ ہونا تو رہا الگ، یہ تو ۱۷/ ۱۸ بھی نہیں ہوتیں۔اب اس کی اتنی بہتات ہو گئی ہے کہ کان اصلی پرانے گانوں کو ترس گئے ہیں۔ٹی وی پر تین یا چار حرف بھیج کر بازار سے پرانے گانوں کی کیسٹ خرید بھی لائیں تو کوئی فائدہ نہیں۔کیونکہ اس میں بھی جھنکار کا تڑکہ لگا ہوتا ہے۔اس جھنکار کی وجہ سے میلوڈی کا خون ہو جاتا ہے، شائد ان کے خیال میں نوشاد، فیروز نظامی، خواجہ خورشید انور، شنکر جے کشن سمیت تمام پرانے میوزک ڈائریکٹروں کا کام اصلاح طلب ہے۔لیجیے بات لطیفے سے گانے بجانے تک پہنچ گئی۔ڈر ہے کالم کے اختتام تک محاوروں پر نہ منتج ہو جائے۔اس سے پہلے کہ بات طول پکڑے ہم وہ لطیفہ سنا دیتے ہیں جس پر بچپن میں خوب ہنسے تھے۔لطیفہ تھا کہ ایک گاہک ہوٹل میں پہنچا اور چائے کا آرڈر دیا۔بیرے نے چائے لا کر رکھی تو اس میں موجود مکھی دیکھ کر گاہک نے ہوٹل کے مالک سے شکایت کی کہ چائے میں مکھی پڑی ہوئی ہے۔مالک نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا ''جناب دو آنے کی چائے میں مکھی نہیں تو کیا ہاتھی ملے گا''۔اس لطیفے پر ہم دل کھول کر ہنسے تھے۔لیکن ہمیں یقین ہے اسے اب سنتے تو ہنسنا در کنار مسکراہٹ بھی نہ آتی۔اس کی وجہ یہ ہی سمجھ میں آتی ہے کہ اب زمانہ ترقی کر گیا ہے اور ایسی باتیں لطیفوں سے نکل کر حقیقی زندگی کا

حصہ بن چکی ہیں۔اپنی بات کی دلیل میں ہم آج کے اخبار سے یہ خبر پیش کر سکتے ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ حیدرآباد کی جیل میں قیدیوں نے اس وقت ہنگامہ برپا کر دیا اور بیرکوں میں واپس جانے سے انکار کر دیا جب کھانا کھاتے ہوئے ان کے سالن میں ایک انسانی انگلی نکل آئی۔ پولس کے ایک بڑے افسر نے اخبار کو بتایا کہ سالن سے انسانی انگلی برآمد ہونے کی تحقیقات کی جارہی ہے۔جس کے بعد کھانا سپلائی کرنے والے ٹھیکیدار کے خلاف کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا دیکھا آپ نے لطیفوں اور حقیقتوں کے درمیان فرق!!! اگر یہ لطیفہ ہوتا تو قیدیوں سے کہا جاتا ''قیدیوں کے کھانے میں سے انگلی نہیں تو کیا پوری لاش برآمد ہوگی''۔حالانکہ یہ لطیفہ نہیں ہے پھر بھی ہم نے اس واقعے میں سے یہ لطیف بات اچک لی کہ تحقیقات کے بعد ٹھیکیدار کے خلاف کارروائی نہیں، کارروائی کا فیصلہ کیا جائے گا۔اب ٹھیکیدار کی قسمت کہ فیصلہ حق میں ہوتا ہے یا خلاف۔پچھلے زمانے میں لطیفے گھڑے جاتے تھے جس کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے۔کسی واقعے کی عدم موجودگی میں خیالی گھوڑے دوڑائے جاتے تھے پھر جھوٹ سچ کے ملاپ سے ایسے لطیفے وجود میں آتے کہ سن کر خواہ مخواہ ہنسی نکل جائے۔مگر اب حقیقتاً ایسے واقعات ہوجاتے ہیں کہ خیالی گھوڑے دوڑانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔بس واقعات اور بیانات کا تجزیہ کرنے سے بڑی لطیف لطیف باتیں سامنے آجاتی ہیں۔جیسے پولس افسر کا بیان کہ کارروائی نہیں کارروائی کا فیصلہ کیا جائے گا۔اتفاق دیکھئے۔ہم نے کہا تھا کہ بات کہیں محاوروں تک نہ پہنچ جائے اور یہ پہنچ بھی گئی۔محاورہ ہے 'اگر ہاتھ نہیں تو انگلی ضرور ہے'۔لیکن یہاں سالن سے انگلی محاورۃً نہیں حقیقتاً نکلی تھی۔اب سوال پیدا ہوتا ہے یہ انگلی آئی کیسے اور کہاں سے؟ کیا قصاب کی دکان سے؟ ہمارا مشاہدہ ہے کہ گائے اور بکرے کے گوشت کی دکانیں الگ الگ ہوتی ہیں۔پھر تو انسانی گوشت کی دکان بھی الگ ہی ہوتی ہوگی۔الگ ہوتی ہوگی تو یہ انسانی انگلی گائے کے گوشت میں کیسے شامل ہوگئی۔کہیں ایسا تو نہیں قیدیوں کو انسانی گوشت ہی سپلائی ہوتا ہو اور اتفاق سے انگلی ثابت رہ کر مسئلہ بن گئی ہو۔اگر ایسا ہے تو نہ جانے یہ قیدی کب سے انجانے میں آدم خوری کر رہے ہونگے۔اب یہ انگلی ٹھیکیدار کے گلے میں اٹک جائے گئی۔محاورہ ہے 'گلے میں ہڈی اٹکنا'۔انگلی میں بھی ہڈی ہوتی ہے اس لیئے نیا محاورہ گلے میں انگلی اٹکنا بھی ہوسکتا ہے۔دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا انسانی گوشت ہمیشہ سپلائی ہوتا تھا یا کبھی کبھار۔ہر دو صورتوں میں یہ سوال گلے میں اٹکا رہے گا کہ یہ

آتا کہاں سے تھا۔کسی لاوارث کا تو ہو نہیں سکتا کیونکہ لاوارث لاشیں کئی کئی دنوں تک سرد خانے میں رہتی ہیں، اس لیئے تازگی برقرار نہیں رہ سکتی۔بدبو اٹھنے لگتی ہے۔تازہ لاش کے ملنے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔پھر یہ معمہ کیا ہے؟ ارباب اختیار کے لیے لمحہ ءفکریہ!!! چلیئے اس معمے کو چھوڑ کر دوسری طرف آتے ہیں کہ انسانی انگلی کا اس طرح سالن میں آنا تو بہت بڑی خبر بنتی ہے پھر یہ بڑی خبر کی طرح کیوں نہیں چھپی؟ صرف ایک کالم میں وہ بھی آخری صفحے پر کیوں چھپی؟ ٹی وی نے اس خبر کو کیوں نہیں نشر کیا۔اگر ایسا کوئی واقعہ کسی اور ملک میں ہوتا تو کیا ہوتا؟ ہمارے ملک میں بھی ایسے واقعات پر کمیشن بٹھانے کی روایت تھی لیکن اب اتنے کمیشن بیٹھ چکے ہیں کہ اب بٹھانے کے لیئے کوئی کمیشن باقی نہیں بچا۔ایک وجہ اور بھی ہوسکتی ہے۔وہ یہ کہ اب لفظ 'کمیشن' بہت بدنام ہو چکا۔۔اتنا کہ کوئی کمیشن لینا پسند نہیں کرتا ہاں کک بیک لینے میں کوئی حرج نہیں۔ہمارے خیال میں 'کمیشن' کی بجائے 'کمیٹی' بٹھانا شروع کر دیا جائے تو کیسا رہے گا۔ویسے اس میں بھی ایک قباحت ہے۔ہم نے اکثر عورتوں کو کہتے سنا ہے کہ میں 'اتنے' روپے ماہانہ کی کمیٹی ڈالتی ہوں۔یا اس بار تو میری کمیٹی نکلنے والی ہے اس لیئے منے کا عقیقہ کرونگی۔وغیرہ وغیرہ۔اب یہ اور بات کہ اس میں بھی رقم کا ہی ذکر آتا ہے۔دودھ کا جلا چھاج بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے اور یہاں تو آوا کا آوا ہی دودھ کا جلا ہے، اس لیے کمیشن اور کمیٹی سے بچنا چاہیے۔ہم تو کہیں گے ہمارے حکمرانوں کو کک بیک بھی نہیں لینا چاہیے اس لیے کہ کک بیک کو ہم الٹی لات یا پچھلی لات سمجھتے ہیں اور کوئی بھی عزتِ نفس کا رکھوالا لات کھانا پسند نہیں کرے گا۔واللہ عالم۔۔۔آخر میں قارئین سے معذرت کہ بقول خود ہمارے، بات لطیفے سے گانے اور گانے سے ہوتی ہوئی محاوروں تک پہنچ ہی گئی۔کبھی کبھی قبولیت کا وقت ہوتا ہے اور شائد جب ہم یہ لکھ رہے تھے وہ وقت قبولیت ہی کا تھا۔اس لیے ہم بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ نصیحت کرتے ہیں۔

''ہمیشہ مونہہ سے اچھی بات نکالیں۔نہ جانے کونسی گھڑی قبولیت کی ہو''

۲۲/نومبر ۲۰۰۹ء

جنگ ہو یا الیکشن

ہمارے کالج کے باہر ایک بوڑھی بھکارن بیٹھتی تھی۔ جو ہمارے خیال میں نفسیات میں ضرور پی۔ایچ۔ڈی (Ph.D) رہی ہو گی کیونکہ وہ لڑکوں کو انکی چھپی ہوئی خواہشوں کے مطابق دعائیں دیتی تھی۔ وڈیروں کے بیٹوں کو کہتی 'اللہ تمہیں گورنر بنائے، پٹواری بنائے' جبکہ ہمارے جیسوں کے لیئے مخصوص دعاؤں میں ماسٹر یا ڈپٹی بنوانے کی نوید ہوتی تھی۔ اب ماسٹر سے مراد لیکچرر اور ڈپٹی سے مراد ڈی۔ایس۔پی سے لیکر ڈپٹی کلکٹر تک ہوتی تھی۔ گاؤں گوٹھوں کے رہنے والے نہ جانے کیوں پٹواری کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتے ہیں۔ اس لیئے اس کی نظر میں گورنر اور پٹواری ہم پلہ تھے۔ وہ خود بھی کسی گاؤں کی تھی اس لیئے پٹواری کی اہمیت جانتی ہوگی۔ ہم شہری اس کی اہمیت نہیں جانتے تھے اس لیئے سوچتے کہ ایک پٹواری کا گورنری سے کیا مقابلہ؟ کہاں گورنر کہاں ایک معمولی پٹواری؟ اس تفاوت پر ایک دوست یاد آرہا ہے جس سے اگر پوچھا جاتا 'یار بڑی شاندار قمیض پہنی ہوئی ہے، کتنے کی لی؟'۔ تو اپنے مخصوص پشتو لہجے میں کہتا'' یا۔ رآ آ آ کچھ یاد نہیں۔ کیراچی سے لیا تا۔ پت تا نئی چے روپیا کا تا یا ڈائی سو روپیا کا تا۔ (یار کچھ یاد نہیں۔ کراچی سے لیا تھا۔ پتہ نہیں چھ روپیہ کا تھا یا ڈھائی سو روپیہ کا تھا) بہرحال۔ یہ عقدہ لا حاصل ہی رہتا اگر ایک قابل باپ کے صاحبزادے ہمارے تو نہیں لیکن ایک دوسرے صوبے کے گورنر نہ بن جاتے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ ہمارے کالج (یعنی گورمنٹ کالج حیدرآباد) کے طالب علم تو نہ رہے ہونگے، ہاں یہ ہوسکتا ہے ان کی اپنی درس گاہ کے باہر بھی اس ہی قماش کی کوئی بھکارن رہتی ہو جو لڑکوں کو گورنر اور پٹواری بننے کی دعا دیتی ہو اور اس کی دعا ہی اس صوبے کے لوگوں کے لیئے عذاب بن گئی ہو۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہمیں اس کا علم نہیں کہ وہ دعا ان میں سے کسی ایک عہدے کے لیے ہوتی تھی یا بیک وقت دونوں کے لیے۔ خدا کا کرنا دیکھیئے کہ مذکورہ شخص کو دونوں عہدے بیک وقت مل گئے یعنی ٹو ان ون۔ جسمانی طور پر گورنر اور ذہنی طور پر پٹواری!!! ان کی ذہنی پس ماندگی کے لیے تو لاتعداد مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن ایک ہی پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ قارئین کا وقت ضائع کرنا ہمارا شیوہ کبھی بھی نہ رہا۔ آپ موصوف کی قابلیت کا اندازہ بخوبی ان کے اس بیان سے لگا سکتے ہیں جو انہوں

نے حال ہی میں ایک بین الاقوامی ادارے ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل (Transparency International) کے بارے میں اس وقت دیا جب اس ادارے نے پاکستان میں کرپشن کے حوالے سے ایک رپورٹ شائع کروادی جس کے بموجب پاکستان بدعنوانی میں دنیا میں ۴۲ نمبر پر ہے۔ رپورٹ شائد موصوف کے حسب منشا نہ تھی اس لیے فرمایا'' میں نہیں جانتا کہ ٹرانس پیرنسی انٹرنیشنل کس جانور کا نام ہے''۔ ملاحظہ فرمایا، نہ کوئی تردید نہ وضاحت۔ نہ ہی کوئی دلیل۔ نہ یہ ہی بتایا کہ ۴۲ ویں نمبر پر ہونا برا لگا یا پہلے نمبر پر نہ ہونا۔ بس مونہہ اٹھا کر اپنی کم علمی بیان کردی کہ میں اس جانور کو نہیں جانتا۔ محاورے میں تو چڑیا کہا جاتا ہے۔ جانور نہیں۔ شائد موصوف کے ذہن میں کسی عفریت کا تصور ہو۔ مثلاً ڈائینا سورس یا ہاتھی وغیرہ کا۔ ایسا بیان کسی گورنر کا تو ہو نہیں سکتا۔ ہاں پٹواری کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ چلیے گورنری اور پٹواری کے قضیئے کو چھوڑ کر اس ادارے کی رپورٹ کا جائزہ لیتے ہیں، جس کے مطابق پاکستان کرپشن میں اب ۴۲ نمبر پر ہے۔ کرپشن کا ذکر ہو تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایمنسٹی اور امیونٹی (Amnesty & Immunity) کا ذکر نہ ہو۔ ان دو کا ہی تو احسان ہے کہ ہم ۴۲ نمبر تک بھی پہنچ گئے ہیں ہاں، قانون سے کرپشن کی سزا ہی ختم ہو جائے تو انشااللہ ہم کرپشن کی پہلی پائیدان پر بھی براجمان ہوسکتے ہیں۔ خدا جانے قانون میں کرپشن کی سزا کیوں رکھی گئی ہے جب کہ اس کے تحت اب تک تو کسی کو سزا ملی نہیں۔ ہمارا مطلب اربوں کھربوں کی کرپشن سے ہے۔ معمولی قسم کے کرپٹ لوگوں سے تو بالا بالا ہی نمٹ لیا جاتا ہے۔ یاد تو ہوگا ایک بچے کو روٹی چرانے پر اہل محلّہ نے موقع پر ہی موت کی سزا دے دی تھی۔ نہ ایف آئی آر۔ نہ مقدمہ۔ فوری فیصلہ۔ دین اینڈ دیئر (Then & there) میڈیکل کی کتابوں میں ہم پڑھا کرتے تھے کہ امیونیٹی قوت مدافعت ہوتی ہے جو انسانوں میں پیدا کی جاسکتی ہے جس سے ایک آدمی جراثیم کے حملے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کو کسی خاص بیماری سے بچاؤ کا ٹیکہ لگا دیا جائے تو وہ شخص اس بیماری کے جراثیم یا وائرس سے تو بچا رہتا ہے۔ لیکن دوسری بیماری کے وائرس سے محفوظ رہنے کے لیئے دوسرا ٹیکہ ضروری ہے۔ اگر چیچک کا ٹیکہ لگوالیا تو چیچک نہیں ہوگی لیکن سوائن فلو کے لیئے اس کا ٹیکہ لینا ہوگا۔ کچھ بیماریاں ایسی بھی ہیں جنکے ٹیکے ابھی ایجاد نہیں ہوئے۔ ایک بات اور کہ بچاؤ کے ٹیکے صرف ان بیماریوں کے لیئے ہوتے ہیں جو جراثیم کے حملہ آور ہونے پر ہوتی ہیں۔ وہ بیماریاں جن میں جرثومے کا عمل دخل نہ ہو ان سے بچاؤ کے ٹیکے بھی

نہیں ہوتے جیسے بلڈ پریشر، زیابیطس وغیرہ۔ ہمارے علم میں امیونیٹی کے صرف یہ ہی معنی تھے۔ وہ تو بھلا ہو کہ پاکستان میں کرپشن کا وہ شور مچا جس کے ساتھ ہی امیونیٹی کا غوغا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ کہ فلاں لیڈر کو امیونٹی (استثنا) حاصل ہے اس لیئے اس پر کرپشن کے چارجز نہیں لگ سکتے۔ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتھی اس لیے ہم نے فوراً ڈکشنری کا سہارا لیا تو علم میں اضافہ ہوا کہ امیونٹی (Immunity) کے معنی چھٹکارا، بیخوفی، استثنا اور بریت کے بھی ہوتے ہیں۔ اب چونکہ ہمارا علم میڈیکل کے بارے میں آٹے میں نمک کے برابر ہے یا یہ کہیے کہ محدود ہے اور بقول الکزینڈر پوپ (Alexander Pope) ''little learning is a dangerous thing'' (کم علمی خطرناک چیز ہے) اس لیئے ہم سوچنے بیٹھ گئے کہ استثنا حاصل کرنے کے لیے کونسا ٹیکہ ہوتا ہے جس سے لوگوں کو کرپشن سے استثنا مل جاتی / جاتا ہے۔ ایک دانا نے رہنمائی کی اور بتایا کہ اگر آپ الیکشن جیت جاتے ہیں اور کسی بڑے منصب پر فائز ہو جاتے ہیں تو آپ کو ہر قسم کے کرپشن سے استثنا حاصل ہو جاتا ہے۔ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب کروڑہا لوگ اعتماد کا ووٹ دیدیتے ہیں تو پھر کسی کو انگلی اٹھانے سے کیا حاصل ہوگا۔ واقعی ووٹ کی طاقت کا کوئی بدل نہیں۔ سچ کہتے ہیں بری سی بری جمہوریت آمریت سے بہتر ہے اگر فلپائن کے مارکوس، ایران کے شہنشاہ یا دیگر آمروں کے پاس ووٹ بینک ہوتا تو عبرت ناک انجام سے بچ سکتے تھے۔ مگر یہ سب ڈرامے ایشیا، افریکا اور لاطینی امریکا کے لیئے ہیں یورپ کے لیے نہیں۔ ورنہ ہٹلر تو باضابطہ منتخب فیوہرر تھا۔ فوج میں اپنے کارناموں کی بدولت آئرن کراس ون اینڈ ٹو (IRON CROSS I & II) کا حامل، مضبوط کیرکٹر کا مالک، نہ شرابی نہ زانی۔ پھر بھی مارا گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہودیوں کا دشمن تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ یہودیوں نے پہلی جنگ عظیم میں غداری کی تھی۔ انگریزوں کا مخالف جو پوری دنیا پر حکومت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ توسیع پسند تو برطانیہ تھا۔ مذہبی جنون میں مبتلا تو کنگ رچرڈ بھی تھا۔ وہ راندہء درگاہ کیوں نہیں۔ ہٹلر پر ہی یہ نزلہ کیوں؟ اس لیئے کہ وہ جنگ ہار گیا تھا۔ جنگ ہو یا الیکشن جیتنا ضروری ہے ورنہ سارے الزامات سچ دکھائی دیتے ہیں

۲۵ر نومبر ۲۰۰۹ء

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا

لڑکوں سے ماسٹر نے پوچھا 'بتاؤ دنیا میں وہ کونسا ملک ہے جو سب سے زیادہ امیر بھی ہے اور طاقت ور بھی'۔ جواب میں کسی نے کہا روس تو کسی نے امریکا کا نام لیا۔ کچھ سمجھتے تھے کہ برطانیہ سب سے امیر اور سب سے زیادہ طاقتور ملک ہے۔ صرف ایک لڑکے کا خیال مختلف تھا اس نے کہا 'سر، پاکستان'۔ ماسٹر صاحب لڑکے کی خوش فہمی پر مسکرائے اور پوچھا وہ کیسے؟ لڑکا بولا 'سر، ہمارے صدر نے حال ہی میں ۵۴ ارب روپے کے قرضے معاف کر دیے، کیا کوئی غریب اتنا قرضہ معاف کر سکتا ہے۔ اور معاف کروانے والے بھی غریب غربا نہیں۔ کروڑوں کے بنگلوں میں رہتے ہیں۔ کئی کئی ملوں کے مالک ہیں۔ جب معاف کرنے والا بیش بہا قرضے معاف کر سکتا ہے اور معاف کروانے والے بھی امیر ہیں تو ملک کی باقی ماندہ آبادی (جو نہ قرضہ لیتی ہے نہ معاف کرواتی ہے) کیا غریب ہوگی؟ رہا طاقت کا سوال تو یہ سب ہی جانتے ہیں کہ ۱۶ کروڑ عوام بڑی جانفشانی سے اسے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ اتنا مضبوط ہے کہ ہمارے سربراہ اس کی مضبوطی کے بل بوتے امریکہ کی مدد کر رہے ہیں تاکہ وہ افغانستان و عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا سکے۔ اور یہ تو آپ بھی جانتے ہونگے کہ ہماری مدد کے بغیر امریکا یہ جنگ چھیڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر ہمارے صدر صاحب یہ مدد کرنے سے منع کر دیتے تو کیا ہی اچھا ہوتا؟'۔ ماسٹر کو اس جواب سے بڑا مزہ آیا تو بولا 'بھئی منع کر دیتے تو امریکہ پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا'۔ لڑکا ہنستے ہوئے بولا 'ایسے ہی بجا دیتا۔ سر، جس ملک کو افغانستان جیسے چھوٹے سے ملک کو تباہ کرنے کے لیے پاکستان کی ضرورت پڑ رہی ہو کیا وہ پاکستان کو تباہ کر سکتا تھا؟'۔

ماسٹر صاحب سن کر خاموش ہو گئے کہ بات تھی بھی سچ۔ کیا برطانیہ جو ایک وقت دنیا کا سپر پاور تھا، نواب سراجدولہ کو میر جعفر کی مدد کے بغیر شکست دے سکتا تھا؟ کیا ٹیپو سلطان کو شکست اس نے تن تنہا دی تھی؟ اگر اندرونی سازش نہ ہوتی تو کیا بنگلہ دیش بن سکتا تھا؟۔

یہ تو تھا حقیقت پر مبنی لطیفہ لیکن لطیفے پر مبنی حقائق بھی ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ تازہ ترین یہ کہ ایک بینک کے صدر کی معاونت سے ایک مل کے مالک نے ۹ ارب روپے ہڑپ کر لیے لیکن بھلا ہو سپریم کورٹ کا کہ مل مالک گرفت میں آ گیا اور ۹ ارب لوٹانے پر راضی ہو گیا۔ مگر ساتھ ہی ایک وزیر با تدبیر پر یہ تہمت لگائی کہ اس نے اس کیس کو ختم کرانے کے لیئے ساڑھے تین کروڑ ہتھیا لیے۔ پچاس لاکھ وکالت کے اور بقایا اس نیک کام میں آسانیاں پیدا کر کے کیس ہی ختم کروانے کے۔ مل مالک کو شاید وزیر پر یقین نہ تھا اس لیے تین کروڑ مزید خرچ کر کے دو مزید وکیلوں کی خدمات حاصل کی۔ حالانکہ وزیر صاحب نہایت شریف انسان ہیں، ڈاکٹریٹ بھی لی ہوئی ہے جس پر حاسد لوگ معترض ہیں کے جعلی ہے۔ یہ تو ڈاکٹر صاحب کی شرافت ہے ورنہ ہتک عزت کا دعویٰ ٹھونک دیتے تو پچاس لاکھ کھرے ہو جاتے۔ علاوہ ازیں بینک کے صدر نے بھی چشم پوشی کی قیمت تقریباً ۴۰/۵۰ کروڑ روپے تحائف کی شکل میں لیے۔ اس بہتی گنگا سے موصوف کے ایک بھائی بھی فیضیاب ہوئے اور تین ارب ۶۵ کروڑ وصول پائے۔ جس کے عیوض بھائی کو مشورہ دیا کے کہ ۹ ارب بینک کو واپس نہ کیا جائے۔ مل مالک نے یہ سارا حساب کتاب اس لیے بتایا کہ شائد کورٹ کو رحم آ جائے اور ۹ ارب میں سے مبلغ پانچ ارب محنتانہ یا اخراجات کی مد میں معاف کر دے۔ لیکن 'یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے' کہ کورٹ نے کہہ دیا ہم یہ سب نہیں جانتے رقم پوری کی پوری واپس کی جائے۔ حارث مل کا مالک اس پر راضی ہو گیا۔ ہمیں پھر بھی گمان ہے سستا چھوٹ رہا ہے۔

دروغ بر گردن راوی۔ کہتے ہیں ایسے قرضے لینے والے حاصل شدہ رقم کو قومی بچت اسکیم میں جمع کرا دیتے ہیں۔ اگر دس پندرہ سال بعد ایسی کوئی افتاد پڑے تو اس وقت تک رقم دگنی ہو چکی ہوتی ہے۔ تو قرضہ چکانے میں کیا قباحت ہو گی۔ اور یہ تو اتفاق ہے کہ پہلی بار ایسی کوئی مصیبت گلے پڑ رہی ہے ورنہ کون لیتا تھا اور کون دیتا تھا۔ لیکن اب شائد یہ رسم چل نکلی ہے دیکھئے کہاں تک پہنچے۔ اگر یہ سلسلہ چل پڑا تو ہمارے خزانے میں اربوں نہیں کھربوں روپے آ جائیں گے۔ پھر امریکا کی کیا مجال کہ ہمیں امداد کے بہانے بے غیرت بنا سکے۔ ہماری ملیں اور فیکٹریاں آباد ہونگی تو ہم تیار شدہ مال ایکسپورٹ کریں گے پھر اپنے آدمیوں کو بیچنے کی ضرورت نہیں رہے گی اس لیئے مسنگ پرسن (Missing Persons) کا مسئلہ بھی طے ہو جائے گا۔ فیکٹریاں چل پڑیں گی

تو روزگار بھی ملنا شروع ہو گا۔ اور روزگار ملنے لگے کا تو ٹرکی کے راستے یونان جانے والوں کی لاشیں ملنا بھی بند ہو جائیں گی۔

۲ ہمارے خیال میں برائی کی جڑ یہ قرضے ہیں ان قرضوں کی وجہ سے سرمایہ دار اپنا پیسہ نہیں لگاتا بلکہ بینکوں کا پیسہ لگاتا ہے پھر نیت خراب ہوتی ہے اور رشوت، تحائف یا سفارش سے قرضے معاف کرواتا ہے۔ کہتے ہیں۔ ع

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا

کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا

بس اگر شہد کی مکھی باغ میں نہیں جائیگی تو نہ شہد بنے گا نہ موم نکلے گا۔ نہ موم بتی ہو گی نہ پروانہ جل مرے گا۔ اس لیئے اسلامی طرز زندگی اپناؤ۔ نہ کوئی قرضہ لیگا۔ نہ معاف کروائے گا۔ اپنے سرمائے سے مل لگائے گا۔ نہ ملک سے فرار ہو گا نہ ملیں بند ہونگی۔ نہ بیروزگاری پھیلے گی۔ نہ لوگ بیرون ملک جائیں گے، نہ کنٹینروں میں مریں گے نہ پاکستان کی بدنامی ہو گی۔ یہ تو ایک سوراخ بند کرنے کے فوائد ہیں ابھی تو ایسے سینکڑوں سوراخ ہیں۔ جن کو بند کرنے سے دین اور دنیا دونوں کے مزے ہمارے منتظر ہیں۔

۲۷ نومبر ۲۰۰۹ء

کیا واقعی؟

پرانے وقتوں سے ہی بادشاہوں کی کہانیاں سنانا عام ہے۔ بچے شوق سے سنتے ہیں۔ ہم مسلمانوں کا المیہ ہے کہ نا دانستہ ہی نہیں، دانستہ بھی غلطیاں کرتے ہیں۔ اب دیکھئے بادشاہت کی ہمارے یہاں کوئی گنجائش نہیں لیکن بڑی بوڑھیاں بھی کہانی بادشاہوں کی ہی سناتی ہیں۔ بچپن سے ہی ذہن بادشاہت کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ پھر بادشاہوں کے ساتھ ہی وزیروں کا بھی ذکر آتا ہے۔ وزیر بھی کیسے؟ دانا، ہوشیار اور ہر فن میں یکتا۔ بادشاہ ان کے مشوروں کا محتاج رہتا ہے۔ ایک اور لفظ جس سے کان بچپن سے ہی آشنا ہوتے ہیں وہ ہے باتدبیر۔ یہ لفظ وزیر کا ہم قافیہ ہے اور عموماً وزیر کے دم چھلے کے طور پر آتا ہے۔ مثلاً وزیرِ با تدبیر۔ ہمارے ذہن میں بھی یہ لفظ بچپن سے ہی ڈیرا ڈالے ہوئے ہے۔ ذکر کسی بھی وزیر کا ہو، ذہن میں اس کے باتدبیر ہونے کا خیال آتا ہے۔ حالانکہ اب کوئی بھی وزیر باتدبیر نہیں ہوتا۔ یہ جب زبان کھولتا ہے تو اس کے باتدبیر نہ ہونے کی دلیل مل جاتی ہے۔ باتدبیر وزیر کی بجائے اب یہ صوبائی ہوتا ہے یا وفاقی۔ یہ بھی نہیں تو وزیرِ مملکت ضرور ہوتا / ہوتی ہے۔ 'وزیرِ مملکت' سے ہم جیسے کند ذہن یہ ہی سمجھتے ہیں کے صوبائی اور وفاقی وزیروں کی کوئی مملکت نہیں ہوتی۔ ہم نے ابھی کہا کہ اب کوئی وزیر باتدبیر نہیں ہوتا۔ جیسا کہانیوں میں ہوتا تھا۔ جو بادشاہ سلامت سے جان کی امان پانے کے بعد مفید مشورے دیتا تھا۔ اب بادشاہ سلامت بھی نہیں رہے۔ اب سربراہ ہوتے ہیں جو کہیں صدر تو کہیں گورنر اور کہیں وزیراعظم کہلاتے ہیں۔ تاش کے چار اور شطرنج کے دو بادشاہوں کے علاوہ دنیا میں چند بادشاہ ضرور ہیں لیکن ان میں سے کسی کی بھی سلامتی کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ اس لیئے کوئی بھی بادشاہ سلامت نہیں کہلاتا۔ پھر جس کی خود سلامتی کا ٹھکانا نہ ہو اس سے جان کی امان کون مانگے گا۔ اب وزرا، جان کی بجائے اپنی وزارت بچانے کے چکر میں رہتے ہیں اس لیئے مشورے بھی نہیں دیتے۔ ہمارے سربراہوں کو اب مشوروں کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ یہ وافر مقدار میں درآمد ہو جاتے ہیں

اور ان پر پائی پیسہ بھی نہیں خرچ ہوتا بلکہ ہر مشورے پر عمل کرنے کے لیے مشاہرہ بھی مشورہ دینے والے ملک سے ملتا ہے۔ جو قومی خزانے میں بھی جمع نہیں کرانا پڑتا۔ بلکہ سربراہ چاہے تو وہ رقم دینے والے کے پاس امانتاً پڑی رہتی ہے۔ اور سربراہ کے زندہ سلامت ملک سے نکلنے کے بعد بظاہر لیکچر وغیرہ دینے کی فیس کی مد میں وصول کر سکتا ہے۔ اس سے دوہرا فائدہ ہوتا ہے۔ ایک تو بلیک کی کمائی وہائٹ ہو جاتی ہے دوئم دنیا تو نہیں لیکن اپنے ہی ملک کے بار بار ایک ہی سوراخ سے ڈسے جانے والے بیوقوفوں کی نظر میں دانشور ٹھہرتا ہے۔ مشورہ دینے والے کو بھی ایک فائدہ ہوتا ہے۔ اسے ایک نیا مشورہ لینے والا میسر آجاتا ہے کیونکہ وہ اپنے سے پہلے والے سربراہ کی خوش حالی سے مرعوب ہو کر اس کے نقش قدم پر چل پڑتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم وزیروں یا وزیرِ مملکتوں کے بارے میں کچھ کہیں ان غیر سلامت بادشاہوں (آمروں) کے بارے میں اتنا ضرور کہیں گے کہ عوام انگریزی کے اس محاورے 'Nip in the bud' یا اردو کے محاورے 'سانپ کے سر اٹھانے سے پہلے ہی اسے کچل دینا چاہیئے' پر عمل کرتے ہوئے غاصب کے خلاف پہلے دن ہی اٹھ کھڑے ہوں تو یہ شب خون مارنے کی کبھی ہمت نہ کریں۔ غاصب حکمرانوں نے باتدبیر وزیروں کی بجائے، سینکڑوں ایسے وزیروں کی کھیپ تیار کر دی ہے جن کے بیانات سن کر جاہلوں کی طبیعت میں جولانی اور سمجھداروں میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ دورِ مشرفی میں ان کی ایسی بھرمار تھی کہ ہر چینل پر ہر دم، مشرف کا دم بھرتے نظر آتے تھے۔ دلیل اور عقل کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ انہیں جھوٹ کو سچ اور کالے کو سفید کرنے کے لیے حد سے گذرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ ان میں سے تو کئی الیکشن میں مشرف کی بھینٹ چڑھنے کے باوجود اب بھی اس ہی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے نہیں تھکتے۔ ایک صاحب تو اپنی نئی پارٹی بنا چکے ہیں اور اپنی اس ون مین پارٹی (One Man Party) کی سربراہی سنبھالے ہوئے ہیں۔ اپنے تئیں عقلِ کُل تو ہیں ہی، اینکر پرسنز نے انہیں غیب داں بھی بنا دیا۔ ایک اور خاتون ہیں جن کے لہجے میں ایسی چہکار ہے جیسے یہ ہاری ہوئی پارٹی نہیں بلکہ جیتی ہوئی پارٹی کی نمائندہ ہیں۔ ویسے جیتی ہوئی پارٹی کے وزرا بھی کچھ کم نہیں ہیں جو غلط بیانی میں اپنے پیش رووں سے دو قدم آگے ہیں۔ اس کے لیے صرف ایک مثال کافی ہے جو حال ہی میں ایک وزیرِ مملکت نے یہ کہہ کر قائم کی ہے کہ این آر او کے کیس کھلے تو سارے جج فارغ ہو سکتے ہیں (غور فرمایئے۔ 'سارے'۔۔ 'تقریباً سارے' نہیں)۔ سوال

پیدا ہوتا ہے کیا واقعی؟ موصوف کا مشورہ ہے کہ یہ کیس نہ کھولے جائیں کیونکہ کوٹیکنا کیس میں ملک قیوم سمیت تین جج فارغ ہوئے تھے اور موصوف کو خدشہ لاحق ہے کہ یہ کیس کھلنے پر کہیں سارے جج فارغ نہ ہو جائیں۔سوال پھر پیدا ہوتا ہے کیا واقعی؟ موصوف نے یہ نوید بھی دی ہے کہ عدالت میں جانے کی صورت میں حکومت این آر او کے فوائد کا دفاع کرے گی۔سوال پیدا ہوتا ہے اگر فوائد سرے سے ہوئے ہی نہ تو پھر کس کا دفاع کرے گی۔ہمیں تعجب ہے کہ ابھی تک کسی جج نے اس بات کا برا کیوں نہیں منایا کہ وزیر موصوف نے انہیں ملک قیوم کی صف میں کیوں کھڑا کر دیا۔ملک قیوم نے بھی زبان کھولی اور خوب کھولی ہے۔فرماتے ہیں میں نے استعفیٰ دیا تھا، فارغ نہیں کیا گیا تھا۔میں ایک اچھا جج تھا (کیا واقعی؟)۔پھر یہ بھی فرمایا کہ انصاف ملنا چاہیے چاہے 100 جج فارغ کر دیے جائیں۔انہوں نے تو ایک ہی سانس میں اپنے سینے میں دبی ججوں کو فارغ کرنے کی خواہش کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ برملا اپنے ایک اچھا جج ہونے کی اطلاع بھی فراہم کر دی۔ہمیں نہیں معلوم وزیر مملکت اور ملک قیوم، دونوں میں سے کون توہین عدالت کا مرتکب ہو رہا ہے۔اس لیئے ہم اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے ملک قیوم کو یہ مشورہ ضرور دیں گے کہ ''جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کہ سو جا''۔اور وزیر صاحب سے یہ ضرور پوچھیں گے کہ این آر او میں کوئی خوبی تھی تو کیا ایک اچھا مسلمان ہونے کے ناطے یہ ان کا فرض نہیں تھا کہ کسی کے دباؤ میں آئے بغیر اسے پارلیمنٹ سے پاس کروا لیتے۔کہا جاتا ہے کہ جابر حکمران کے سامنے بھی کلمۂ حق کہنے سے نہیں ڈرنا چاہیے۔اور یہاں تو سارا معاملہ ہی فیور (favour) میں ہے۔اپنے حکمران، وہ بھی جابر نہیں بلکہ۔۔مہربان۔۔۔۔۔۔تو پھر ڈر کس کا؟

۲۹ر نومبر ۲۰۰۹ء

شکوک وشبہات

امریکی سینٹ نے الزام لگایا ہے کہ امریکیوں نے اسامہ کو پکڑنے میں غفلت برتی۔ع

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

ہمیں تو شروع دن سے ہی شبہ تھا لیکن کہتے ہوئے ڈرتے تھے کیوں کہ ہمیں اپنی قابلیت پر بھی شروع سے ہی شبہ ہے۔اور شاید یہ واحد شبہ ہے جو اب فقط شبہ نہیں رہا۔ہاں تو ہم بتا رہے تھے کہ ہمیں شروع سے ہی شبہ تھا لیکن کہتے ہوئے ڈرتے تھے حالانکہ ہمارے شبہے کی تائید امریکا کی تقریباً بیس یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے علاوہ، ڈاکٹر ذاکر نائیک نے بھی کر دی ہے کہ '9/11' کا واقعہ امریکا کا اپنا کیا دھرا ہے۔اس دعوے کی بنیاد عقل اور دلیل پر رکھی گئی ہے۔اس کے علاوہ ایک دو فلم پروڈیوسروں اور ڈائیریکٹروں نے ایسی فلمیں بنائیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسا سوچنے والے غلط نہیں سوچ رہے ہیں۔اور اب تو امریکی سینٹ کی اس رپورٹ نے، مہر تصدیق ثبت کر دی کہ ۲۰۰۱ء میں امریکیوں نے اسامہ کو پکڑنے میں کوتاہی کی تھی اور اس ہی لیے وہ ہاتھوں سے نکل گیا۔سوال پیدا ہوتا ہے امریکیوں نے اسے کیوں نکل جانے دیا۔کیا اس کی اہمیت سے لاعلم تھے؟ اگر لاعلم تھے تو اب اس کے اور اس کے ساتھیوں کی کہیں بھی موجودگی کے شبہے میں ایسے ڈرون حملے کیوں کیے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اکثر و بیشتر سینکڑوں معصوم شہری ہلاک ہو جاتے ہیں۔کہیں ایسا تو نہیں کہ جب انہیں کسی مخصوص علاقے پر بمباری کرنی ہوتی ہے تو پہلے وہاں اسامہ کا ہوّا کھڑا کر دیا جاتا ہے اور بعد میں وہاں حملہ کر دیتے ہیں۔اگر اسامہ کو پہلے ہی پکڑ لیتے تو پھر عراق اور افغانستان میں لاکھوں قتل کیسے کیے جاتے۔یہ تو بالکل ایسا ہی ہے کہ شیر کے شکاری خود مچان پر بیٹھ جاتے ہیں پھر ایک بچھڑا درخت سے باندھ دیتے ہیں۔شیر آتا اور بچھڑے کو آسان شکار سمجھتا ہے مگر اوپر بیٹھے ہوئے شکاریوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔خود جان سے جاتا ہے لیکن شکاریوں کو بہادری کی سند مل جاتی ہے بچھڑا اگر بچ جاتا ہے تو پھر کسی اور شیر کو پھانسنے کے کام آتا ہے۔شکاری کی کوشش یہ ہی ہوتی ہے کہ بچھڑا نہ مرنے پائے۔کیا اسامہ کا رول بچھڑے والا

ہے؟ ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ مثال غیر متعلقہ لگ رہی ہو تو لیجیے دوسری مثال۔ وہ یہ کہ کتوں کی ریس میں کتوں کو ایک لائین میں کھڑا کر دیا جاتا ہے پھر ایک خرگوش یا لومڑی کو دوڑا دیتے ہیں سارے کتے اسے پکڑنے دوڑتے ہیں جو پکڑ لیتا ہے وہ فاتح ہوتا ہے۔ ایسے جانور کو جو کتوں کو لبھانے کے لیے دوڑایا جاتا ہے اسے ڈیکوئے (decoy) کہتے ہیں۔ پرندوں کو پکڑنے کے لیئے بھی ان کے غول میں اپنے سدھائے ہوئے پرندے شامل کر دیئے جاتے ہیں جن کی مدد سے کچھ پرندے ہاتھ آجاتے ہیں۔ کیا اسامہ کا رول ڈی کوئے والا تو نہیں؟ ہمارے خیال سے یہ مثالیں بے کار ہیں اس لیئے چھوڑیے مثالوں کو۔ اشاروں کنایوں میں کیوں بات کریں؟ ڈائیریکٹ سنیے ۲۰۰۱ء میں اسامہ کو اس لیئے چھوڑ دیا تھا تا کہ جس ملک یا جس شہر پر حملہ کرنا ہو تو وہاں اسامہ کی موجودگی ظاہر کر دی جائے۔ پھر دو ڈھائی لاکھ انسانوں کی بھینٹ لینے کے بعد اسامہ کو کسی اور سرحد پر دیکھے جانی کی ہوائی چھوڑ دی جائے۔ بس پھر چل سو چل۔ سنا ہے کہ اسامہ واشنگٹن میں دیکھا گیا ہے۔ مگر امریکی اس پر یقین نہیں کریں گے کیونکہ اسامہ تو خود ان کے پاس ہے۔ اگر اسامہ ہمارے پاس ہوتا اور ہم یہ خبر پھیلاتے تو کسی کو بھی یقین کرنے میں تامل نہ ہوتا۔ اب وہ تو وہاں قید یا نظر بند ہے اس لیئے وہ کہیں بھی اس کی موجودگی بتا سکتے ہیں۔ ہمارا اپنا تجربہ ہے۔ پشاور میں چاند نکلا نہیں ہوتا لیکن گواہیاں مل جاتی ہیں کہ چاند دیکھا گیا۔ اس کے برعکس اگر چاند نکل آئے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا چاند نہیں ہوا۔ اب امریکیوں کو پتہ ہے اسامہ ان کے قبضے میں ہے اس لیئے کسی کو دکھائی نہیں دے گا لہٰذہ وہ اس کی موجودگی کسی بھی سرحد پر بتا دیتے ہیں۔ اگر آزاد ہوتا تو اس کے دیکھے جانے کا بیان کبھی نہ آتا کیونکہ اس طرح جھوٹا ثابت ہونے کا دھڑکا تو لگا ہی رہتا۔ اس ہی لیے اب امریکیوں نے پاکستان کے کسی علاقے پر حملہ آور ہونے کے لیے اسامہ کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہم تو کہتے ہیں اسامہ زندہ ہے ہی نہیں۔ بہت پہلے امریکیوں کے مطابق اسامہ کے گردے ناکارہ ہو گئے تھے۔ اگر یہ سچ ہے تو اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ کہتے تھے وہ ڈائیلسس (Dialysis) پر ہے۔ اگر واقعی، تو کیا پہاڑوں میں ڈائلسس مشین ساتھ لے کر پھرتا ہے۔ ۱۵ یا ۱۶ سال کے بعد اب تک تو اس کے گردے ناکارہ ہو چکے ہونگے۔ گردے کی تبدیلی بعید از قیاس ہے۔ اکثر خودکش حملوں کے بعد اسامہ یا اس کے ترجمان کی کیسٹس بھی آجاتی ہیں جس میں وہ ذمہ داری قبول کرتے نظر آتے ہیں۔ کیوں کرتے

ہیں؟ پتہ نہیں۔ یقین سب کر لیتے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ ان حملوں سے فائدہ کسے ہو رہا ہے اور نقصان کسے؟ کوئی نہیں پوچھتا '9/11' میں صرف تین چار ہزار مرے تھے۔ مگر عراق، افغانستان اور پاکستان میں کتنے مر رہے ہیں۔ ۱۱/۹ کے بعد القائیدہ نے توپوں کا رخ کیوں موڑ لیا۔ کیا صرف ٹوئن ٹاورز سے ہی دشمنی تھی۔ اسامہ کا بھوت ہماری سرحدوں پر ہی کیوں گھومتا ہے کبھی نیا گرہ فال پر بھی تو دکھائی دے۔ اگر سرحدوں پر ہی گھومنا ہے تو میکسیکو کی سرحد کیا بری ہے۔ اگر اسامہ امریکیوں کے پاس نہیں ہوتا تو ہم اسے دیوار چین سے لگوا دیتے۔ ڈرون وہاں پہنچتے اور امریکی چیں کر کے رہ جاتے کیونکہ نہ وہاں مشرف ہے نہ اس کی روح۔ وہاں تو عظیم چین ہے اور وہ ڈروں حملوں کی اجازت دینے سے تو رہا۔ پھر پتہ چل جاتا کہ ڈرون ٹیکنکل فالٹ کی وجہ سے گرتے ہیں یا۔۔۔۔!!

۳ر دسمبر ۲۰۰۹ء

اب کیا خاک مسلماں ہوگا

ہمارے ایک دوست ہیں غلام احمد۔ نہایت شریف، عبادت گذار، نیک ، ہمدرد، مخیّر، ایماندار (مطلب اونیسٹ 'Honest') غرض یہ کہ تمام خوبیوں سے مالا مال بس ایک کمی ہے کہ مسلمان نہیں ہیں۔ ہم اس سے کہتے ہیں ''مسلمان ہو جاؤ۔ توبہ کرو اور ختم نبوت پر ایمان لے آؤ تو ہم کیا لاکھوں سے بہتر مسلمان بن جاؤ گے''۔ مگر اس کو سمجھ ہی نہیں آتی۔ کہتا ہے جب تک میں ایک پرفکٹ (Perfect) انسان نہ بن جاؤنگا، کلمہ نہیں پڑھونگا۔ ہم سمجھاتے ہیں۔ بھلے مانس تمہیں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے ماشا اللہ تمہارے سب کام ٹھیک ہیں بس ایک ختم نبوت پر ایمان لے آؤ، اللہ خود مدد فرما دے گا۔ جواب میں بڑی ہی بے تکی دلیل دی۔ 'یار مسلمان ہونے کے بعد مطمئن (complacent) ہو جاؤں گا۔ اس لیے خود احتسابی چھوڑ دونگا۔ پھر خامیاں کیسے دور ہونگی؟ مسلمان ہونے کے بعد دوزخ کا خوف ختم ہو جائے گا۔ توبہ استغفار کیونکر کرونگا۔ سنا ہے سارے مسلمان جنت میں جائیں گے'۔ ہم نے کہا یہ کس نے کہہ دیا۔ بولا کسی مولوی سے سنا تھا کہ سارے مسلمان جنتی ہیں۔ ہمیں ہنسی آ گئی۔ ہم نے کہا ہاں یہ تو ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہم میں سے حقیقتاً مسلمان ہے کون؟ کوئی اللہ کی نافرمانی کر رہا ہے اور خود کو مسلمان سمجھ رہا ہے۔ کوئی اللہ کے غفور الرحیم ہونے کے ناطے گناہوں کا مرتکب ہو رہا ہے۔ نماز روزے سے غافل دوسروں کے حقوق غصب کرنے میں یکتا۔ کہتے ہیں کہ اللہ شاید سب کچھ معاف کر دے۔ لیکن شرک کرنے والے کو نہیں چھوڑے گا۔ یہ دن بھر میں نہ جانے کتنی بار شرک کرتا ہے اور اسے ثواب بھی سمجھتا ہے۔ کہتے ہیں اگر نماز پڑھ کر اس پر گھمنڈ کرے تو وہ بھی شرک کے زمرے میں آتا ہے۔ جبکہ یہاں تو قدم قدم پر غیر شرعی کام ہو رہے ہیں۔ اللہ جانتا ہے ہم میں سے کون مسلمان ہے۔ جنتی تو وہ ہونگے جو اللہ کی نظروں میں مسلمان ہونگے۔ کہنے لگا ٹھیک ہے لیکن میرا ایک آڈیئل (Ideal) ہے۔ اس جیسا بننا چاہتا ہوں۔ ہمیں اشتیاق ہوا۔ پوچھا کون؟ بولا 'ہیں ایک وزیر صاحب۔ صاحب ریش،

منجھے ہوئے وکیل بھی ہیں۔ ٹی وی کے ایک چینل سے ان کا پروگرام ہوتا ہے جس میں قران کے حوالے سے قانون کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ماشا اللہ ڈاکٹریٹ بھی لی ہوئی ہے۔ کردار کے تو ہونگے ہی۔ گفتار کے بھی غازی ہیں'۔ ہم نے کہا بہت خوب تو پھر کیا چیز مانع ہے، بسم اللہ کرو۔ تو کہا ' دراصل ان میں جو ٹولرنس (قوت برداشت) ہے وہ مجھ میں نہیں۔ سوچتا ہوں ایسی صفت پیدا ہو جائے تو مسلمان ہونے کا مزہ ہی کچھ اور ہوگا'۔ ہم نے دل میں سوچا 'عذر لنگ (lame excuse)!!۔ نہ ماننے کے سو بہانے'۔ پھر بھی پوچھا 'کیسی ٹولرنس؟' کہنے لگا 'ڈاکٹر صاحب سے کیسے کیسے سوالات کرتے ہیں یہ اینکر پرسنز! لیکن مجال ہے جو ماتھے پر شکن آ جائے یا ہونٹوں سے مسکان غائب ہو جائے۔ ایسے دلکش انداز سے مسکراتے ہیں کہ مخالفین چت ہو جاتے ہیں'۔ ہمارا تجسس بڑھنے لگا تو پوچھا مثلاً؟ 'مثلاً یہ کہ کسی نے اڑادی کے موصوف کی ڈاکٹریٹ جعلی ہے۔ میڈیا کو تو 'پرَ' کا کوا بنانے میں دیر نہیں لگتی اس پر ستم یہ ہوا کہ 'ہائر اسٹڈیز کے محکمے نے بھی ہوائی چھوڑ دی کہ جس یونیورسٹی کی ڈاکٹریٹ ہے اس کا تو کوئی وجود ہی نہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں اس پر تو اچھوں اچھوں کو غصہ آ سکتا ہے۔ سچ ہو یا جھوٹ ہر دو صورتوں میں آدمی خفیف ہو جاتا ہے، لیکن مجال ہے ڈاکٹر صاحب کو پسینہ بھی آیا ہو۔ مسکراتے رہے۔ اینکر پرسن نے پوچھا تو بڑی لاپرواہی سے بولے کہ میں ایسی باتوں کا نوٹس نہیں لیتا'۔ یہ مثال دے کر رکے، فخریہ ہماری طرف دیکھا اور پھر بڑے جوش سے شروع ہو گئے۔ 'حال ہی میں ایک بینک فراڈ کیس میں ایک مل مالک نے ڈاکٹر صاحب پر بیہودہ الزام لگایا کہ کیس ختم کروانے کے لیئے ڈاکٹر صاحب نے ساڑھے تین کروڑ روپے لیئے تھے۔ اس کے علاوہ پچاس لاکھ اپنی وکالت کی فیس بھی لی۔ اخباری نمائندوں نے ڈاکٹر صاحب کو گھیرنے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر صاحب نے ذرا بھی غصہ نہیں کیا۔ یہ ہے تحمل! جو ہم اپنے میں پیدا کرنا چاہتے ہیں'۔ ایسی بیہودہ مثالوں سے ہمارا اپنا ٹولرنس جواب دینے لگا تو ہم نے چڑ کر کہا 'یار! عجیب آدمی ہو، اسے تم خوبی سمجھ رہے ہو'۔ کہنے لگے 'اور کیا؟ اتنے جھوٹے الزامات کے بعد بھی مسکراتے رہنا کیا خوبی نہیں؟ اور پھر ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی تو بتایا کہ یہ سب ایک سازش ہے۔ ہم نے پوچھا کس کی سازش؟ تو بولے یہ ابھی نہیں بتایا، کہہ رہے تھے سب ہی جانتے ہیں'۔ ہم نے کہا 'بیوقوف مل مالک نے تو یہ بھی بتایا کہ یہ رقم اس نے دبئی کے ایک ہوٹل میں رمضان کے مہینے میں دی تھی۔ اس کے علاوہ بیس لاکھ کی ان کے گھر والوں کو شاپنگ

بھیکروائی تھی‘۔سن کر بولے۔’ بھئی یہ ہی تو ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ یہ ان کے خلاف سازش ہے۔ہم نے کہا ہاں ! واقعی اتنی لمبی سازش کہ۔ بینک کے مینیجر کو پھسلایا۔معمولی نوعیت کی زمین کے بدلے اربوں کا قرضہ لیا۔ پھر قرضہ نہ واپس کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو وکیل کیا۔ پچاس لاکھ کی فیس کے علاوہ، ساڑھے تین کروڑ کیس ہی ختم کرانے کا محنتانہ بھی دیا۔ پھر ملک سے فرار ہوا تا کہ سازش زیادہ گہری ہوجائے۔گرفتار ہوااور پھر سازش کے تحت ساڑھے تین کروڑ کا الزام لگا دیا‘۔ہنس کر بولا۔’یار اس ہی کو تو سازش کہتے ہیں‘۔ہم نے اپنا بلڈ پریشر بڑھتا محسوس کیا تو خاموشی اختیا کر لی اور پھر بات آئی گئی ہوگئی۔دوسرے دن ہم بیٹھے ٹی وی چینلوں سے کھیل رہے تھے کہ غلام احمد کا فون آیا۔’’یار آج خبریں سنی‘ ہم نے کہا ابھی نہیں کیوں خیریت؟ کہنے لگا۔’یار اس ڈاکٹر نے تو حد کر دی‘۔اس کا انداز گفتگو کچھ بدلہ بدلہ سا لگا تو ہم نے پوچھا۔کیوں؟ خیریت! کیا ہوا؟ تو بولا’ ڈاکٹر نے آج کہا ہے کہ یہ سب الزامات ایک لابی سازش کے تحت لگا رہی ہے۔استفسار پر جانتے ہو کیا بتایا‘۔ہم نے کہا ہمیں کیا معلوم؟ تو کہنے لگا’ ڈاکٹر کا کہنا ہے یہ سب قادیانی کر رہے ہیں۔دیکھا کیسی بکواس کی ہے۔حد ہوگئی۔ہم لوگ کیا اب کسی فرد واحد کے خلاف سازش کرنے کے لیے رہ گئے ہیں؟ حد ہوگئی حد! میں انہیں اپنا آئیڈیل سمجھتا تھا۔لیکن۔۔۔۔۔۔لاحولا قوۃ۔۔۔‘‘۔ہماری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر بولا’اور جانتے ہو اس مل مالک نے یہ بھی بتایا ہے کہ دبئی کے ہوٹل میں جب ڈاکٹر آیا تھا تو وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ڈاکٹر کو کھانے کے لیے کہا تو اس نے منع کر دیا کیونکہ روزے سے تھا۔وہیں رقوم کا لین دین ہوا تھا۔بقول مل مالک کچھ دیر بعد جب وہ ڈاکٹر کے کمرے میں گیا تو دیکھا ڈاکٹر کھانا کھا رہا ہے۔جب روزے کا پوچھا تو بتایا کہ قے ہونے کی وجہ سے روزا ٹوٹ گیا ہے۔یار حد ہوگئی۔۔میں اسے اپنا آئیڈیل سمجھتا تھا۔۔لا حول ولا قوۃ‘‘۔ہمیں محسوس ہوا غلام احمد یہ کہتے ہوئے ہاتھ بھی مل رہا ہے۔یہ سوچ کر ہمیں ہنسی آگئی اور ہم نے کہا اتنا لاحول مت پڑھو ایسا نہ ہو کہ خود غائب ہو جاؤ۔شیطان تو اب لاحول پروف ہو چکا ہے۔تم ہی غائب ہو جاؤ گے۔اب ہماری یہ امید تو ختم ہوگئی کہ یہ تائب ہو کر ایک اچھا مسلمان بن جائے گا بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ’’ کیا اب خاک مسلماں ہوگا‘‘

۵ر دسمبر ۲۰۰۹ء

میں بتاؤں فرق کیا ہے

ایسا نہیں کہ اب اچھی خبریں نہیں چھپتیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی اچھی خبر اس بہار کے جھونکے کی مانند لگتی ہے جو کئی دنوں کے حبس کے بعد اچانک رحمت خداوندی سے آجاتا ہے۔ایسی ہی ایک خبر پڑھ کر خوشی ہوئی کہ نیویارک میں ایک مسلمان اسٹور کیپر کے حسن سلوک کی وجہ سے ایک چور مسلمان ہوگیا۔بات تعجب خیز ہے کہ آج کے دور کا ایک مسلمان اور حسن سلوک!!۔لیکن نہیں۔یہ اتنی تعجب خیز بات نہیں کیونکہ یہ قصہ پاکستان کا یا پاکستان میں رہنے والے مسلمان کا نہیں۔امریکہ میں رہنے والے پاکستانی، سہیل کا ہے جس کے اسٹور میں چور آگیا اور اس سے کہ پہلے وہ سہیل کو نقصان پہنچاتا سہیل نے پستول تان لیا اور چور کو قابو کر لیا۔چور گڑگڑایا کہ وہ بھوکا ہے اور ڈبل روٹی چرانا چاہتا تھا۔سہیل نے یہ وعدہ لینے کے بعد کہ وہ آئندہ چوری نہیں کریگا۔اسے ڈبل روٹی دیدی اور ساتھ ہی ۴۰ ڈالر دے کر رخصت کر دیا۔چند دن بعد مذکورہ چور نے ۵۰ ڈالر کے منی آرڈر کے ساتھ ایک ٹائپ شدہ خط کے ذریعے اطلاع دی کہ وہ تائب ہوگیا اور مسلمان ہو کر خوش ہے۔اس کے برعکس پاکستان میں ایک بچے کو روٹی چرانے کے جرم میں جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔وجہ شاید یہ تھی کہ بچہ پہلے سے ہی مسلمان تھا اور اس کے مزید مسلمان ہونے کا کوئی چانس نہیں تھا اس لیے موت کی سزا دینے والے اب کیوں حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے اس لیے بچے کو اتنا مارا کہ وہ مر ہی گیا۔دونوں خبریں اخبار سے ملی ہیں۔واللہ اعلم۔۔ڈبلن میں ہم اپنے بیٹے کے ساتھ ایک بینک گئے۔ایک لمبی قطار میں بیٹا کھڑا ہوگیا ہم اس کے برابر قطار سے باہر کھڑے تھے۔اتنے میں ایک خاتون آئی۔ہم چونکہ قطار سے باہر تھے اس لیے معذرت کے بعد ہم سے پوچھا کیا ہم قطار میں ہیں؟ جواب نفی میں پا کر وہ ہمارے بیٹے کی پیچھے کھڑی ہو گئی۔اس کے برعکس پاکستان میں ہم پلیٹ فارم ٹکٹ لینے کے لیے اپنے سے پہلے موجود شخص کے پیچھے کھڑے تھے کہ ایک نوجوان آیا اور ہمیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنا ہاتھ کھڑکی میں ڈالنے لگا۔ہم نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا کہ بیٹا ہم بھی اس ہی کام کے لیے کھڑے ہیں تو بیزاری سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولا’ چلو۔۔آپ لے

لؤ۔ہم اس کے اس حسن سلوک سے متاثر ہوئے کہ اس نے یہ نہیں کہا 'چل بے۔اپنا کام کر'۔۔۔میں بتاؤں فرق کیا ہے؟۔۔۔یہ ہے فرق!! یورپ میں راہ چلتے ایسے لوگ ملتے تھے جو ہمیں دیکھ کر ہیلو یا ہائے ضرور کہتے۔اجنبی مرد ہو یا عورت، ہیلو کہنے میں 'جان نہ پہچان خالہ جی سلام' پر عمل کرتے نظر آتے تھے اس کے بر عکس جب ہم نے یہ ہی پریکٹس پاکستان میں کرتے ہوئے اجنبیوں کو سلام کیا تو اکثر جواب تو مل جاتا تھا لیکن حیرت میں ڈوبا ہوا۔کئی لوگوں کے چہرے سے ناگواری کا تاثر بھی ملتا۔ایسا محسوس ہوتا جیسے سوچ رہے ہوں 'شائد کوئی غریب غربا ہے۔کہیں دست سوال نہ بڑھا دے'۔اس ہی لیے کچھ لوگوں کو سلام کا جواب دینے کی بجائے تیزی سے آگے بڑھتے دیکھا۔۔۔۔یہ ہے فرق!! یورپ میں ۹۰٪ مسلم خواتین اسکارف کے بغیر نظر نہیں آتیں۔اس کے برعکس پاکستان میں ۱۰٪ سے کچھ زیادہ اسکارف یا برقعے کا استعمال کرتی ہیں۔۱۵٪ برقعے کو فیشن کے طور پر پہنتی ہیں۔بقایا میں سے ۵٪ کے علاوہ سب ہی اذان سن کر آنچل سے سر ڈھانپ لیتی ہیں۔یہ اور بات کہ اذان کے فوراً بعد 'religeously' (نہایت احترام واہتمام) کے ساتھ دوپٹے کو دوبارہ زیب گلو کر لیتی ہیں۔آنچل کے خود بخود ڈھلکنے کا انتظار نہیں کرتیں۔کیونکہ اس میں رومانیت زیادہ ہونے کی وجہ سے نقص امن کا خطرہ رہتا ہے۔۔۔یہ ہے فرق!! یورپ امریکا میں ہمارے رسول ﷺ کی ایک حدیث پر عمل ہو رہا ہے۔وہاں آپ کوئی چیز خرید کے لے آئیں بعد میں بوجہ واپس کرنا چاہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔لیکن یہاں دکانداروں نے پہلے سے لکھ کر لگایا ہوتا ہے کہ مال واپس یا تبدیل نہیں ہوگا۔جنہوں نے نہیں لکھا، وہ بھی واپسی میں پس وپیش کرتے ہیں۔غیر مسلم ہمارے رسول ﷺ کے فرمان پر عمل کر رہے ہیں۔اور ہم؟۔۔۔یہ ہے فرق!! وہاں قانون کی پاسداری قدم قدم پر عیاں۔یہاں قانون شکنی طرہء امتیاز۔ایک وزیر کے بیٹے نے سرخ بتی پر رکنے کی بجائے کار اور تیز کر دی تو اس کے دوست نے جو لندن پلٹ تھا اسے ٹوکا۔پسر وزیر نے کہا ارے میں وزیر کا بیٹا ہوں۔تم غم نہ کرو کوئی مائی کا لال چالان نہیں کر سکتا۔لندن پلٹ نے کہا بات چالان کی نہیں۔وزیر زادے نے سنی ان سنی کر دی۔اتنے میں دوسری سرخ بتی کا سامنا ہو گیا۔اس کا بھی وہی حشر دیکھ کر لندن پلٹ کو چپ لگ گئی۔کار تیسری کراسنگ پر پہنچی، اتفاق سے بتی سبز تھی۔وزیر زادے نے کار روک دی۔لندن پلٹ نے حیرت سے پوچھا سبز بتی پر کیوں روکدی۔قہقہہ لگاتے ہوئے بولا 'کیا پتہ ادھر سے بھی کسی وزیر

کا بیٹا آ رہا ہو جو سرخ بتی پر رکنا کسر شان سمجھتا ہو'۔یورپ میں اگر ریل کا حادثہ ہو جائے تو وزیر ذمہ داری قبول کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیتا ہے یہاں پوچھتا ہے کیا میں ٹرین چلا رہا تھا؟ میں کیوں مستعفی ہوں۔وہاں کرسٹین کیلر اسکینڈل پر وزیر لارڈ پروفومو مستعفی ہو جاتا ہے ہمارا صدر کہتا ہے 'میں صاحب صدر ہوں۔ہاں ہے کوئی اور'۔وہاں کرپشن کے الزام پر لیڈر حضرات اپنی لیڈری گنوا دیتے ہیں۔ہمارے لیڈر 'N.R.O.' کا سہارہ لے لیتے ہیں تاکہ 'زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد' صرف محاورہ ہی نہ رہے۔۔یہ ہے فرق!! ایک وزیر مملکت نے تو ایک ٹاک شو میں یہ کہہ کر کمال کر دیا کہ کرپشن تو ہمارا حق ہے۔اور ہماری پارٹی نے تو سب سے کم کرپشن کی ہے۔گویا حرام پیٹ بھر کر نہ کھایا جائے کم کھانے میں کوئی حرج نہیں۔دوسرے ممالک میں کوئی قومی سانحہ ہو جائے تو پوری قوم سوگوار ہو جاتی ہے۔کوئی دو دن کا تو کوئی تین دن کا سوگ مناتا ہے۔ہمارے یہاں اس کی ضرورت نہیں کہ بہادر قوم ہیں۔ہنستے گاتے بڑے سے بڑا غم سہہ جاتے ہیں۔ناچ گانے کی کوئی محفل منسوخ نہیں کرتے۔ٹی وی پر مذاحیہ پروگرام جاری رہتے ہیں۔ایک حادثے میں جتنے ہائی رینک کے لوگ شہید ہوئے اتنے تو شاید ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ کی جنگ میں بھی نہیں ہوئے تھے لیکن نہ پرچم سرنگوں ہوا نہ قومی پیمانے پر آنکھیں نم ہوئیں۔معمولات زندگی جس طرح چلتے رہے اس سے تو یہ ہی تاثر ملا کہ کچھ نہیں ہوا۔اگر ٹی وی یا میڈیا فعال نہ ہوتا تو ہمیں خبر بھی نہ ہوتی کہ کوئی حادثہ بھی ہوا ہے۔ٹی وی کے علاوہ کہیں غم و رنج دکھائی دیا ہو تو بتایا جائے۔کوئی تقریب منسوخ ہوئی؟ نہیں! یہ ہی تو فرق ہے جو ہمیں دوسروں قوموں سے الگ کرتا ہے۔

اسلام میں کسی کلچر، کسی ثقافت کسی روایت، کسی رسم یا رواج کی گنجائش نہیں، لیکن ہندوؤں کے بعد ہم دوسری قوم ہیں جہاں یہ ساری خرافات موجود ہیں۔اچھے اچھے علماء بھی ان رسم و رواج میں جکڑے نظر آتے ہیں۔کیا امریکہ یا برطانیہ میں آج تک کوئی شادیوں میں گولی لگنے سے مرا ہے؟۔ہمارے یہاں یہ روایت عام ہے۔ہم فخریہ کہتے ہیں 'ہاں یہ ہماری ثقافت ہے، ہم شادیوں میں فائرنگ کرتے ہیں'۔ہمارے رسول ﷺ نے آخری خطبہء حج میں فرمایا کہ آپ نے ساری پرانی رسوم وغیرہ کو آج پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔(فقط مفہوم لکھ رہے ہیں)۔ہمارا یہ حال کہ مصری صدر جمال ناصر اپنی عوام کو 'فرعوں کی اولاد' کہہ کر مخاطب کرتا تھا تو ایرانی بادشاہ کو سائرس اعظم کی نسل سے ہونے پر فخر تھا۔۱۵۰۰ سالہ اسلامی تہذیب والے ۴ اور ۵ ہزار سال پرانی تہذیب کو

اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی کچھ لوگ رنجیت سنگھ اور راجہ داہر کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔ اسپین کے عوام ۷۰۰ سال مسلمانوں کی حکمرانی میں رہنے کے باوجود اپنا ناطہ عربوں سے نہیں جوڑتے۔

ایک ہم ہیں!!!! ہم میں اور دوسری قوموں میں فرق تو اور بھی ہے لیکن اپنا دامن اٹھانے سے اپنا ہی پیٹ ننگا ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر ہی اکتفا کرتے ہوئے اتنا ضرور کہیں گے کہ ہماری قوم سمجھتی ہے وہ زندہ قوم ہے۔ اس کی نظروں میں دوسری قومیں مردہ ہیں کہ اپنے کتے کے مرنے پر غمزدہ ہو جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک۔ ع

زندگی، زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل، کیا خاک جیا کرتے ہیں

ہم میں اور دوسروں میں یہ فرق ہے کہ اسلام کی سارے باتیں، سوائے اللہ کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی رسالت پر یقین کے، انہوں نے اپنالی ہیں جبکہ ہم نے تمام اسلامی تعلیمات کو یکسر بھلا دیا ہے۔

۸ر دسمبر ۲۰۰۹ء

اسٹبلشمنٹ، بیوروکریسی، ڈیموکریسی، میڈیا اور بیانات

(establishment, bureaucracy,democracy.media & bayaanaat)

اسٹبلشمنٹ کے خلاف اب ہر کس و ناکس اتنا کچھ بولتا ہے کہ ہمیں احساس کم علمی ہونے لگا کہ ہمیں خبر ہی نہیں یہ اتنی بری چیز ہے۔ ہم نے ڈکشنری میں اس کی تعریف (یا برائی) دیکھنے کی کوشش کی تو علم ہوا یہ پاور فل لوگوں کے ایسے گروپ کو کہتے ہیں جو تمام پالیسیاں کنٹرول کرتا ہے۔ (Group of powerfull people who controls Policies)۔ اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ یہ حکومت کا ہی دوسرا نام ہے تو پھر حکومتی ارکان بھی اس کے خلاف کیوں بولتے ہیں؟ حکومت ہی تو پالیسی بناتی ہے اور اس پر 'حسبِ توفیق' عملدرآمد کرتی ہے۔ حسب توفیق اس لیے کہ اگر اس کے اپنے مفاد میں نہ ہو تو عمل نہیں کراتی۔ اسٹبلشمنٹ کی مخالفت کا سن سن کر کان پک گئے تو ہمیں خیال آیا کہ کہیں یہ لوگ انگریزی کی مار تو نہیں کھا گئے۔ اس لیے ہم نے اب بیوروکریسی کے معنی دیکھے۔ آگاہی ہوئی کہ یہ حکومت کا وہ سسٹم ہے جس کے تحت سارا انتظام، منتخب ارکان کی بجائے، ریاستی افسران کے ذریعے ہوتا ہے۔ (System of Govt.through departments managed by state officers, not by elected representatives.)۔ یہ ہمیں زیادہ بہتر لگا کہ بیوروکریسی سے شکایت تو ہو سکتی ہے کہ یہ بالا ہی بالا، منتخب نمائندوں کو اعتماد میں لیے بغیر ہی کام دکھا رہے ہوں۔ لیکن اسٹبلشمنٹ تو ان تمام اداروں کا مجموعہ ہوتی ہے جو پالسی بناتے اور ان پر عمل کرتے ہیں تو پھر اس کے خلاف زہر افشانی کیوں؟ خیر ہمیں کیا؟ ہم الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پڑنے کی بجائے کیوں نہ ان بیانات کا جائزہ لیں جو، ان اداروں کے علاوہ، میڈیا، علما اور دیگر سیاستدانوں سے منسوب ہوتے ہیں اور جو ہر دہشت گردی کے بعد ٹیوی اور اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ جن بیانات پر ہم بحث کریں گے وہ کسی ایک مخصوص حادثے سے متعلق نہیں اور نہ ہی کسی ایک فرد سے منسوب ہیں۔ یہاں ہماری پیشگی معذرت کہ ان میں

ہم نے کچھ مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا ہے۔اس کی وجہ کچھ اور نہیں۔۔بلکہ اس مصرعے کی پیروی ہے جس میں کہا گیا ہے۔ع

کچھ بڑھا بھی دیتے ہے زیب داستاں کے لیے۔

ایک وضاحت اور کہ ان بیانات میں کوئی تسلسل نہیں۔وجہ وہی کہ یہ کسی ایک حادثے کے بعد کے بیانات نہیں ہیں بلکہ مختلف اوقات اور مختلف حادثات کے بعد مختلف لوگوں کے دیے ہوئے ہیں۔ان بیانات کی روشنی میں عوام کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ دیکھیں ہمارے اداروں کے درمیان کتنی ہم آہنگی ہے۔ہوم ورک کیسا ہے ۔بیانات کی اہمیت کیا ہے۔دعوے کیا ہے۔ان سے کوئی فائدہ بھی ہے یا بس یونہی!! تو ملاحظہ فرمائیے۔۔

خبر :۔ شہر میں دھماکے کی آواز سنائی دی۔پولس جگہ کا تعین کر رہی ہے۔دھماکہ فلاں جگہ ہوا۔اتنے جاں بحق ہوئے اور اتنے زخمی۔زخمیوں کو اسپتال پہنچایا جارہا۔ اس کے بعد مختلف ریںک کے پولس افسران کے بیانات۔۔'دھماکے میں ۵کلو مواد استعمال کیا گیا'۔۔۔'خودکش حملہ تھا'۔۔۔'رموٹ کنٹرول بم تھا'۔۔۔'بمبار کا سر مل گیا'۔۔۔'ڈی ۔این ۔اے حاصل کرلیا'(اب بتایئے ،کہ کتنا وزنی تھا اس سے عوام کو کیا؟ خودکش تھا یا ریموٹ یہ آپ کے دیکھنے کی چیز ہے۔پہلے بھی سر ملے تھے ان کا کیا ہوا۔نہ جانے سر ملنے سے کیا فوائد حاصل کیے جاتے ہیں۔ڈی این اے کو کس سے میچ کیا جاتا ہے۔کیا اب تک کوئی میچ ہوا یا بس یونہی ٹیسٹ ہو رہے ہیں)۔۔۔ 'صدر/ وزیراعظم نے تحقیقات کا حکم دے دیا۔جس کے تحت ہم تحقیقات کر رہے ہیں' ۔(کیا حکم نہیں ملتا تو تحقیقات نہ کی جاتی)۔

صدر یا وزیراعظم کے بیانات۔۔'بزدلانہ حملہ تھا'۔۔۔'ہم ڈرنے والے نہیں'۔۔۔'مجرموں کو جلد کیفر کردار تک پہنچائیں گے۔آخری وقت تک پیچھا کریں گے'۔۔ہم نے دہشت گردوں کی کمر توڑ دی ہے۔۔دہشت گرد بوکھلا گئے ہیں،عالمی برادری کو چاہیے ہماری مدد کریں۔(ان بیانات پر تبصرہ قطعی غیر ضروری ہے)۔

وزیروں کے بیانات۔۔'یہ کسی مسلمان کا کام نہیں'۔۔۔'طالبان کا کام ہے'۔۔۔'حکومت کے خلاف سازش ہے'۔۔۔'مذہب کی آڑ میں دہشت گردی ہو رہی ہے'۔(تو کون کہہ رہا ہے کہ یہ مسلمانوں کا کام ہے۔حکومت کے خلاف سازش ہے تب تو یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کون کر رہا ہے)وزیر داخلہ کا بیان۔۔'بھارت ملوث ہے'۔۔۔

'بھارت کے ملوث ہونے کے شواہد مل گئے ہیں'۔۔۔'بھارتی اصلحہ ملا ہے'۔وزیر خارجہ کا بیان۔۔'بھارت کے ملوث ہونے کا ثبوت نہیں ہے۔۔۔'مقامی طالبان کا کام ہے'۔ترجمان وزارت خارجہ کا بیان۔۔'بھارت کے ملوث ہونے کے ثبوت مل گئے ہیں۔'وقت آنے پر پیش کریں گے'۔(وزیر داخلہ اور وزارت خارجہ کو چاہیے وزیر خارجہ کو ثبوت مہیا کردیں اور سب مل کر وقت آنے پر پیش کردیں)۔

مذہبی جماعتیں۔۔۔'یہ کسی مسلمان کا کام نہیں'۔۔۔'خودکش حملے حرام ہیں'۔'اگر انصاف نہیں ملے گا تو لوگ کیا کریں'(پہلے تو یہ طے کرلو کہ یہ کر کون رہا ہے۔دوئم اگر حرام ہیں تو انصاف نہ ملنے کی صورت میں کیا حلال ہو جاتے ہیں۔سوئم اگر یہ مسلمان نہیں کر رہے تو پھر کافروں کو حرام حلال کی کیا تمیز)۔ان بیانات سے ظاہر ہے کہ آپس میں ہم آہنگی کا فقدان ہے۔ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اصل مجرم کون ہے۔ان حملوں سے کس کا فائدہ ہے اور اس کا اصل ٹارگٹ کیا ہے۔میر صادق اور میر جعفر کی غداری کے بعد کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ مسلمانوں کا کام نہیں۔سب جانتے تھے یہ انگریزوں کے خریدے ہوئے ہیں۔کیا آج امریکن خریداری کی طاقت نہیں رکھتے۔کیا اب میر جعفر اور میر صادق آؤٹ آف اسٹاک ہیں۔'9/11' پر اگر کوئی اپنے آدمی مروا سکتا ہے، ضیا الحق کے طیارے میں اپنے آدمی مروا سکتا ہے تو کیا معصوم پاکستانیوں کی جان لینے میں اسے کوئی مشکل ہے۔ان کے ایک جنرل کا یہ بیان بھول گئے کہ ڈرون حملوں میں'700' آدمیوں میں سے'14' کے علاوہ تمام معصوم شہری مارے گئے تھے۔اس پر کسی ہیومن رائٹس کو جلوس نکالنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ہمیشہ معصوم جانوں کے ضیاع پر امریکیوں نے اعتراف بھی کیا اور معافی بھی مانگی۔ہمارے فراخ دل حکمرانوں نے معاف بھی کردیا اور شاید در پردہ یہ عندیہ بھی دیدیا کہ آئندہ بھی ہم ہر قسم کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔اگر ہماری قوم اس بات پر متفق ہوجائے کہ'9/11' بقول امریکی دانشوروں کے بش انتظامیہ کا کیا دھرا ہے۔۔کوئی مسلمان اس میں ملوث نہیں ہے،ہم کسی اسامہ وسامہ کو نہیں جانتے۔مشرف ایک غاصب تھا اور غاصب کے کیے ہوئے اقدامات کے ہم ذمہ دار نہیں۔تو انشا اللہ جس طرح ایران اور وینزویلا کی طرف آنکھ اٹھاتے ہوئے امریکا کی گھگھی بندھتی ہے اس ہی طرح پاکستان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھتے ہوئے اسے کئی بار سوچنا پڑے گا۔کیا پاکستان وینزویلا یا ایران سے کمزور ملک ہے؟

افغانستان اور عراق جیسے غیر ایٹمی ملکوں پر حملے کے لیے جس ملک کو پاکستان کی مدد درکار تھی وہ کس طرح پاکستان کو توڑا بورا بنا سکتا تھا۔ اگر مشرف گھٹنے نہ ٹیک دیتا تو امریکا عراق یا افغانستان پر کبھی حملہ آور نہ ہوتا۔ مشرف پر ایک اور مقدمہ چلنا چاہیئے۔ لاکھوں عراقی، افغانی اور پاکستانیوں کے قتل میں بالواسطہ (indirectly) ملوث ہونے کا!!!! مگر اس کے لیے سب کو اس تذبذب سے نکلنا ہوگا کہ ۱۱/۹ میں کس کا ہاتھ تھا۔۔۔

۱۲/دسمبر ۲۰۰۹ء

پیش بندی

دوسروں کا تو علم نہیں لیکن لفظ 'بزرگ' کے سامنے آتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ایسے عمر رسیدہ شخص کا تصور ابھرتا تھا، جس میں تقدس کا عنصر غالب ہوتا۔ ہم نے 'تھا' اس لیے کہا کہ یہ دنیا دیکھنے سے پہلے تک تھا۔ اب نہیں۔ ایران میں جا بجا یہ لفظ سامنے آتا ہے۔ 'بزرگ شاہراہ' تو وہاں بہت ہی عام ہے۔ طبیعت اس دن صاف ہوئی جب منیٰ میں شیطان کو کنکریاں مارنے جا رہے تھے۔ تینوں شیاطین تک پہنچانے کے لیے راستے میں عربی انگریزی کے علاوہ فارسی میں بھی رہنمائی کی گئی تھی۔ بڑے شیطان کی نشاندہی کے لیے 'بزرگ شیطان' لکھا دیکھ کر ایک لمحے کو ضرور ٹھٹکے، لیکن پھر تہران کی 'بزرگ شاہراہ' نے ہماری رہنمائی بزرگ شیطان تک کر دی۔ بہر حال نہ فارسی ہماری زبان نہ ہمیں فارسی کے بزرگ سے مطلب! اب ہم بھی عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں ہم اور ہمارے دوست سب ہی بزرگ ہیں۔ لیکن ہم سات آٹھ دوستوں میں صرف تین چار ہی واقعی بزرگی کے دعویدار ہیں۔ یہ اور بات کہ ان میں ایک جینوئن ہیں بقایا بزعم خود۔ ہم خود ابھی بزرگی کے معیار پر پورے نہیں اترتے کیونکہ وقتاً فوقتاً ہم سے بچگانہ حرکتیں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ دوسرے یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ ہم میں منافقت کا فقدان ہے اس لیے کھل کر اظہار رائے کا حق استعمال کرتے ہوئے اپنی پارسائی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے۔ جب کہ دوسرے اپنے آپ کو پارسا ظاہر کرنے کے لیے پنگوڑے سے ہی اپنے پاک دامن ہونے کا ذکر کرتے ہوئے مبالغے کی حدوں سے گذرتے ہوئے کہتے ہیں ''مجھے تو پیشاب بھی لگتا تو رو رو کے آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا۔ والدہ کو اللہ جنت نصیب کرے کہا کرتی تھیں کہ اس نے تو ایک دفعہ بھی بستر خراب نہیں کیا''۔ جیسا کہ ہم نے کہا ایک بزرگ جینوئن ہیں جو کافی پڑھے لکھے ہی نہیں ڈاکٹر بھی ہیں۔ نمازی تو ہیں ہی وظائف کا بھی ورد کرتے رہتے ہیں۔ دینی مسائل اور احادیث پر بھی گہری نظر ہے لیکن ان باتوں کا اظہار نہیں کرتے۔ کبھی اپنے 'پہنچے' ہوئے ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہاں سگریٹ نوشی کثرت سے کرتے ہیں۔ دوسرے دو حضرات پڑھے لکھے تو نہیں ہیں لیکن اپنے پہنچے ہوئے ہونے کے دعویدار ضرور ہیں۔ انہیں

پیروں اور فقیروں کے بارے میں کافی معلومات ہیں۔ایک کو علم اعداد کی کچھ شُد بُد ہے اس لیے تعویز گنڈے بھی کرتے ہیں۔کچھ پیروں اور ولیوں کی حکایات بھی یاد ہیں۔اس لیے اپنے آپ کو بھی پیر سمجھتے ہیں۔طریقت کے نام پر شریعت میں ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ پارسائی کے دعویدار بھی ہیں لیکن کبھی کبھی کچھ زیادہ ہی دنیادار بن جاتے ہیں، جس کے لیے پیش بندی کر رکھی ہے۔دوسرے صاحب بھی پیچھے نہیں۔یہ کچھ زیادہ ہی چلتے پرزے ہیں باقاعدگی سے پیری مریدی کا سلسلہ چلا رکھا ہے۔پانچوں شرعی عیب سے مبرا نہیں۔ایک بار ہمارے ایک دوست کو کوئی تکلیف ہوگئی۔ بہت علاج کروایا پر افاقہ نہ ہوا۔اتفاق سے ان جعلی پیر کے سامنے ذکر نکل آیا۔انہیں ہماری موجودگی کا احساس نہیں رہا اس لیے علاج بتانے لگے کہ روزانہ نہانے کے پانی میں بیری کے پتے ڈال کر ابال لینا۔پانی پر سات بار آیت الکرسی پڑھ کر دم کرنا پھر ایک بڑے ٹب میں بیٹھ کر نہا لینا ۔خیال رہے پانی ادھر ادھر گرنے نہ پائے۔پھر پانی کو کسی جھاڑی یا پودوں میں ڈالدینا تاکہ دم کیا ہوا پانی پیروں میں نہ آئے۔ہم خاموشی سے سن رہے تھے لیکن رہا نہیں گیا تو اسے آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے بولے۔ 'ابے دماغ خراب ہوا ہے جو اپنی جال سازی یہاں بھی چلا رہا ہے۔دم کیا ہوا پانی پیروں میں نہ آئے اور نہاتے میں چاہے جسم کی کسی بھی حصے سے گذرتا ہوا نہانے والے کے پیروں میں جمع ہو جائے'۔یہ سن کر سب دوست اس کا مذاق اڑانے لگے۔کھسیانا ہو کر کہنے لگا' بھئی اب آپ لوگ نہ مانو تو مرضی'۔جیسا ہم نے بتایا موصوف میں پانچوں شرعی عیب موجود ہیں۔انہوں نے بھی اپنی بدمعاشیوں کی پیش بندی کر رکھی ہے۔یہ اور بات کہ صرف ہم سے گھبراتے ہیں۔ایک اور ہیں، نسبتاً معصوم۔صرف دوسروں کی نقالی میں پہنچے ہوئے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔پان کے اتنے شوقین کہ ہم نے ان کا مونہہ پان کے بغیر نہیں دیکھا۔کچھ کھاتے ہوئے پان کو ایک طرف کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔مونہہ اتنا لال رہتا ہے کہ قلفی کھاتے ہوئے انہوں نے ایک بار گی جو قلفی کو مونہہ میں لیا تو قلفی نے اپنا رنگ بدل لیا۔اور سب سمجھے کہ ان کے پاس چوک بار ہے۔انہیں بھی مزاروں سے عقیدت ہے۔پیری مریدی سے بھی کافی لگاؤ ہے۔یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن ہمیں ان سے اس بات پر اختلاف ہے کہ سارے مسلمان جنت میں جائیں گے، اس لیے کچھ غیر شرعی کام بھی ان سے سرزد ہو جاتے ہیں۔ہم انہیں سمجھاتے تو ہیں کہ یہ درست ہے مگر یہ کون طے کریگا کہ کون مسلمان ہے۔اگر کوئی شرک

کا مرتکب ہوا تو جنت میں کیسے جائے گا۔ان کا عقیدہ اتنا مضبوط ہے کہ ہم بے بسی محسوس کرتے ہیں۔ان میں بھی کچھ دنیاوی کمزوریاں ہیں جن کے لیے انہوں نے بھی پیش بندی کر رکھی۔یہ پیش بندیاں کیسی ہوتی ہیں یہ ہم آپ کو مندرجہ ذیل کہانی سنانے کے بعد بتائیں گے۔ایک کرپٹ ترین بادشاہ کا ذکر ہے جسے لوٹنے کا منصوبہ پڑوسی ملک کے دو بھائیوں نے بنایا اور دربار میں پہنچ گئے۔بادشاہ سے کہا کہ بادشاہ سلامت ہم جوُلا ہے ہی نہیں، ڈریس ڈیزائنر بھی ہیں اور اپنی ایجاد کردہ کھڈی پر ایسی پوشاک سونے اور چاندی کے تاروں سے تیار کر سکتے ہیں جو آپ جیسے ایمان دار کے علاوہ کسی کو نظر نہیں آئے گی۔ایک تو یہ پوشاک دنیا میں فقط ایک ہوگی ، دوئم اس کو پہننے کے بعد آپ اپنے کرپٹ وزیروں ،مشیروں اور افسروں کو پہچان بھی لینگے۔ بادشاہ نے رضامندی ظاہر کی تو دونوں نے سونے چاندی کی کثیر مقدار کے علاوہ ریشم کی فرمائش کردی تاکہ بادشاہ کے کومل جسم پر سونے چاندی سے کوئی خراش نہ آجائے۔مطلوبہ چیزیں ملنے کے بعد انہوں نے کھڈی پر کپڑا بننا شروع کر دیا۔ایک وزیر ہوشیار چند کو ہشیاری سوجھی تو وہ دیکھنے پہنچ گیا۔خالی کھڈی کو چلتے دیکھ کر اس نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ ہفتہ ہوگیا ہے لیکن کپڑے کی کوئی شکل دکھائی نہیں دے رہی۔جولاہوں کو طلب کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ کپڑا تو تیار ہے بس اب کٹائی اور سلائی کا کام شروع کرنے والے ہیں۔وزیر کی دی ہوئی اطلاع سن کر بولے حضور ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بے ایمانوں کو یہ پوشاک نظر نہیں آئے گی۔کچھ دیر پہلے ایک وزیر آیا تھا اور ہم سے رشوت طلب کر رہا تھا۔ہمارے انکار پر اس نے ہمیں ڈرایا دھمکایا اور پوچھنے لگا کپڑا کہاں ہے ۔ہم نے دکھایا تو اسے نظر نہیں آیا کیونکہ اس کی نیت میں کھوٹ تھا۔سن کر بادشاہ نے اس وزیر کو ملک بدر کر دیا اور پوری کیبنٹ کو اسکی بے ایمانی اور انجام سے آگاہ کر دیا۔اب تو ہر وزیر، مشیر اور افسر کے کان ہو گئے۔ ہر ایک بادشاہ کو بتاتا کہ پوشاک زبردست ہے۔کاریگر واقعی باکمال ہیں۔غرض پوشاک تیار ہوئی۔ بادشاہ کو دکھانے کے لیے دونوں بھائی دربار میں پہنچے۔جیسے ہی دونوں نے اپنے خالی ہاتھ بلند کیئے ہر طرف سے واہ واہ کا شور اٹھا کیا خوبصورت لباس ہے۔بھئی کمال ہے۔چمک تو دیکھو۔واہ واہ۔۔۔بادشاہ کو ہاتھ خالی نظر آئے ۔مگر اپنے کرپٹ ہونے کا کیونکر بھانڈا پھوڑتا اس لیئے خود بھی لگا تعریف کرنے۔کاریگروں کو اپنی کاریگری کی کامیابی پر خوشی ہوئی لیکن اس خوف سے بھانڈا جلد یا بدیر پھوٹنا تو ہے ہی اس لیئے جلدی سے سیف اکزٹ

(safe exit) کی خاطر رخصت کی اجازت طلب کرتے ہوئے بولے'' عالی جاہ اس لباس کو زیب تن کر نے کے لیئے بہترین دن آپ کی سالگرہ کا ہوگا۔آپ جلوس کی شکل میں پورے شہر کا چکر لگانا۔عوام بھی دیکھ لیں گے اور آپ کو شہر کے بے ایمانوں کا بھی پتہ چل جائے گا۔بادشاہ نے خوش ہو کر دونوں کو انعام واکرام سے نوازنے کے بعد اپنے چیف پروٹوکول افسر کی معیت میں ائیر پورٹ روانہ کیا۔دونوں بھائیوں نے پیش بندی کے طور پر پروٹوکول افسر کو سمجھا دیا کہ زمانہ خراب ہے ہر شخص کی نیت میں فتور ہے اس لیئے بادشاہ کے عذاب سے بچنے کے لیئے عوام کو خبردار کر دینا۔ورنہ سارے مارے جائیں گے۔پروٹوکول افسر سمجھدار تھا اس لیے فوراً سمجھ گیا اور رعایا کو بچانے کی فکر میں لگ گیا۔سالگرہ کے دن بادشاہ کے خادموں نے بادشاہ کی پسندیدہ وردی اتاری اور اسے طلسمی لباس پہنا دیا۔ہر درباری نے دل کھول کر داد دی۔جان جانے کے خوف نے ان کی ہنسی چھین لی تھی ورنہ مارے جاتے۔بادشاہ ایک کھلی بگھی میں کھڑا ہو گیا اور جلوس روانہ ہوا۔سڑک کے دونوں طرف عوام کا ٹھاٹیں مارتا سمندر تھا۔چیف پروٹوکول افسر کی وجہ سے عوام نے تعریف میں کوئی کثر نہیں چھوڑی اور نعرہ ءہائے تحسین بلند کرتے رہے لیکن برا ہو اس بچے کا جس نے بادشاہ کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔'ارے بادشاہ تو ننگا ہے'' تو آپ نے ملاحظہ فرمائی جو لاہوں کی پیش بندی۔اب ہم آتے ہیں اپنے پہنچے ہوئے بزرگوں کی طرف۔پہلے وہ جو تعویز گنڈے فی سبیل اللہ دیتے ہیں اور پیری مریدی بھی کرتے ہیں۔چونکہ ہمارے ساتھ اٹھنا بیٹھنا زیادہ ہے۔اس لیے انہیں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ان کے کرتوتوں کا علم نہ ہو جائے اس لیے پیش بندی کے لیے ایک دن ہمیں بتایا کہ بہت زیادہ پڑھنے پڑھانے اور وظائف کرنے کے علاوہ ضرورت مندوں کے لیے چلہ کشی کی وجہ سے عامل حضرات اس خوف سے کہیں ان میں غرور نہ پیدا ہو جائے، اس لیے دنیا کو دکھانے کی خاطر وہ کچھ انسانیت سے گرے کام بھی کرتے ہیں تا کہ لوگ انہیں پوجنا نہ شروع کر دیں۔ہم صرف لاحول پڑھ کر رہ گئے۔زیادہ پان کھانے والے بزرگ کا قول ہے کہ بہت زیادہ وظیفے کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ کثرت سے چائے یا سگرٹ نوشی کرے۔بہت سے تو چرس سے بھی شوق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ چرس نہیں ہوتی۔میں بھی جو ہر وقت پان چباتا ہوں وہ اس لیے ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں پڑھائی میں مشغول ہوں۔ہم نے دل میں مسکراتے ہوئے کہا ہاں میں بھی ایسے دو

تین بزرگوں کو جانتا ہوں جو بھنگ پیتے ہیں۔ان کا کہنا ہے یہ بھنگ نہیں ہے بلکہ حضرت۔۔۔۔۔۔(ہم نام نہیں لکھ رہے۔اتنی بڑی ہستی کا نام کم از ہم تو نہیں لکھ سکتے) کی بوٹی ہے۔ان دوستوں کے علاوہ ہمارے ایک ملازم کو بھی پہنچے ہوئے ہونے کا دعویٰ ہے بقول خود کے،ان کے پاس ۴۰ موکل ہیں۔ہم نے ایک دن ٹوکا کہ باتیں بڑی بڑی کرتے ہو،نماز تو پڑھتے نہیں۔کہنے لگے ہم جب پڑھتے ہیں کسی کو نظر نہیں آتے۔اب وہ ہمارے بزرگ دوستوں میں سے تو تھے نہیں اس لیے وہ بے نقط سنائی کہ کچھ دن تک نماز پڑھتے ہوئے نظر بھی آنے لگے۔ایک اور بزرگ کا کمال یہ ہے کہ خواتین کو الٹرا ساؤنڈ کی مدد کے بغیر لڑکا یا لڑکی کی آمد کا بتا دیتے ہیں۔ایک دن ہماری موجودگی میں ایک خاتون نے بیٹے کے لیے استدعا کی تو فرمایا مشکل ہے۔اس بار بھی لڑکی ہوگی۔عورت بولی حضرت آٹھ تو ہو چکی ہیں۔فرمایا اللہ کی مرضی۔خاتون کے جاتے ہی ایک ڈائری اٹھائی اور اس پر کچھ لکھنے لگے،ہم نے پوچھا کیا لکھ رہے ہو تو صفحہ ہمارے سامنے کر دیا۔لکھا تھا 'مائی حاجرہ کے اس بار لڑکا ہوگا'۔ہم نے پوچھا یہ کیا فراڈ؟ تو مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا یہ پیش بندی ہے اگر لڑکی ہوئی تو ٹھیک اگر لڑکا ہوا تو کہہ دونگا یہ تو مجھے پہلے سے ہی علم تھا۔ثبوت کے طور پر یہ ڈائری ہوگی۔کہہ دونگا کہ آٹھ بیٹیوں کے بعد یہ خوشخبری بچے کے لیے نقصان دہ ہو سکتی تھی۔اس لیے نہیں بتایا تھا۔کیا سمجھے؟ ہم نے کیا سمجھنا تھا لیکن ہم نے اسے ایسا ٹھیک ٹھاک سمجھایا کہ کئی روز تک ہمارا سامنا کرنے سے گھبراتا رہا۔

۱۴/دسمبر ۲۰۰۹ء

’56‘ کروڑ کی چوتھائی

نہ جانے کیوں پرانے وقتوں میں لوگ اللہ تعالیٰ سے ۵۶ کروڑ کی چوتھائی مانگتے تھے۔ سیدھے سادے طریقے سے ۱۴ کروڑ کیوں نہیں مانگتے تھے؟ اس زمانے میں تو ۱۴ لاکھ بھی بہت ہوتے تھے پھر بھی نہ جانے کیوں کروڑوں کی فرمائش ہوتی تھی۔ پھر اتنا گھماؤ پھراؤ بھی سمجھ سے بالا ہے۔ پہلے ۵۶ کروڑ کی بات کی، بعد میں اس کی چوتھائی مانگ لی۔ اللہ تعلیٰ سے یہ سیاست واقعی سمجھ میں نہ آنے والی ہے۔ انسانوں کا معاملہ دوسرا ہے ان کے لیئے تو کہا جاتا ہے کہ موت کا خوف دلاؤ تو بخار پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اب ہمارا علم تو محدود ہے اس لیے ہمیں خبر نہیں کے اللہ تعلیٰ نے کسی کو یہ چوتھائی یعنی ۱۴ کروڑ دیے یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اللہ کے دینے کے طریقے نرالے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ صبح اٹھے تو سرہانے مطلوبہ رقم رکھی ہو۔ وہ اس طرح دیتا ہے کہ ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا۔ کسی ممکنہ حادثے سے بچالیا۔ سمجھو کروڑوں کا فائدہ ہو گیا۔ اولاد نکمی نکلی تو جانو کروڑوں کا نقصان ہو گیا۔ اللہ کے پیمانے ہمارے پیمانوں سے مختلف ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو چکر دینے کی کوشش کرتے ہوئے بھول جاتے ہیں وہ ہمارا معبود ہے اور ہماری رگ رگ سے واقف ہے۔ کسی واعظ نے اپنے وعظ میں اللہ کی بڑائی بیان کرنے کے لیے مثال دی کہ اللہ کے نزدیک اربوں کھربوں کی حیثیت ایک پائی کے برابر ہے اور سینکڑوں سال ایک سکنڈ کے برابر۔ واعظ کو شاید خیال نہیں تھا کہ جہاں اللہ کارساز ہے تو وہیں بندہ جعل ساز ہے۔ ایسے ہی ایک چالباز نے اللہ سے فرمائش کی کہ مالک تُو تو غنی ہے تیرے نزدیک کھربوں روپے ایک پائی کے برابر ہیں، تو مالک مجھے ایک پائی عطا کردے۔ ندا آئی میرے بندے بس ایک سکنڈ ٹھہر جا۔ ہمیں یقین ہے ۵۶ کروڑ کی چوتھائی مانگنے میں بھی ایسی ہی کوئی چال ہوگی۔ پھر ۵۶ ہی کیوں؟ پورے ۶۰ یا ۵۰ کیوں نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس سے مشہورِ (یا بدنامِ) زمانہ ۵۶ چھری کی جانب کوئی اشارہ ہو۔۔ ہو یا نہ ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ چوتھائی کی چوتھائی ہمارے آج کے کالم میں کام آ گئی۔ ۵۶ کروڑ کی چوتھائی

یعنی ۱۴ کروڑ کسی کو ملے یا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے ۱۴ کروڑ کی چوتھائی یعنی ساڑھے تین کروڑ کے لین دین کی بازگشت نے اونچے ایوانوں میں کھلبلی مچادی ہے۔ حرص وحوس کی وہ وہ داستانیں سامنے آ رہی ہیں کہ عقل بھی محوِ تماشہ ہے۔ بڑے بڑے بت پاش پاش ہو رہے ہیں۔ کرپشن کا لفظ جتنا آج سنائی دے رہا ہے شاید پورے ۶۵ سال میں نہیں سنا گیا ہوگا۔ آدمی کے مردہ ضمیر کا بھی اب کھلے عام چرچا ہے۔ شرم وغیرت کے تو معیار ہی بدل گئے۔ کہاں کی غیرت اور کہاں کی شرم! اب تو فخریہ اپنے مقروض ہونے کا ذکر ہوتا ہے، قرضے معاف کرانے والے ارفع واعلیٰ ٹھہرے ہیں۔ جتنا زیادہ قرضہ معاف کروایا اتنا ہی زیادہ عزت دار۔ ننگے بھوکوں کو کون قرضہ دیتا ہے؟ ہمارے اس بیان کی تائید تو ایک گورنر نے بھی یہ کہتے ہوئے کردی ہے کہ انہیں اپنا نام ’N.R.O.‘ کی لسٹ میں نہ پا کر افسوس ہوا۔ ہم جیسے چھوٹی ذہنیت کے غریب غربا جس کو ’لعنت‘ سمجھتے ہیں وہ ان کے نزدیک تمغہ ہے۔ ۱۴ کروڑ کی چوتھائی جن صاحب کو ملی وہ کوئی غیب سے نہیں ملی بلکہ اس کے لیے انہیں کافی محنت کرنی پڑی تھی۔ کچھ وکالت کی بطور فیس اور کچھ اندورنِ خانہ مک مکا کرانے کا محنتانہ۔ اب یہ دونوں فریقین کی بدقسمتی کہ مک مکا والے جج صاحبان خود فارغ ہو گئے۔ ورنہ ہم اور آپ بے خبر ہی رہتے اور ۹ ارب روپے ’’۹ من تیل‘‘ ہو جاتے اور رادھا بھی ناچ پر آمادہ ہو جاتی۔ غلطی انسان سے ہوتی ہے۔ محنتانہ وصول کرنے والے تو خیر بھول گئے تھے کہ مک مکا کرنے والی عدلیہ فارغ ہو چکی ہے۔ ہنسی تو آتی ہے قرضہ لینے والے پر کہ اس نے قرضہ لے کر اسے بچانے کے لیے آدھی سے زیادہ رقم وکلا پر خرچ کردی۔ وکلا بھی ایسے نامی گرامی کہ کروڑوں میں کھیلتے ہیں۔ اس ہی لیے تو کسی دیانتدار کا مقدمہ نہیں لڑتے۔ اتنی بڑی بڑی فیس تو لٹیروں سے ہی مل سکتی ہے۔ ایک ملکی لٹیرے کو بچانے کے لیے بھی ان لوگوں نے سر توڑ کوشش کی تھی لیکن برا ہو عوام کا کہ جاگ گئی اور آزاد عدلیہ بحال ہو گئی ورنہ مک مکا کا دور جاری رہتا اور ’’کمائے گی دنیا کھائیں گے ہم‘‘ پر عمل بھی ہوتا رہتا۔ ہمیں اس وقت ایک بیٹری سیل بنانے والے صاحب یاد آ رہے ہیں جو رو نا رو رہے تھے کہ ہمارے برانڈ کی نقل بازار میں کیا آئی کہ ہمارا بزنس ہی خراب ہو گیا۔ ہم نے عدالت تک جانے کا مشورہ دیا تو بولے ہم ’25%‘ منافع بمشکل کماتے ہیں جبکہ نقال ’75%‘ کما رہا ہے۔ مقدمے پر وہ ہم سے تین گنا زیادہ خرچ کر سکتا ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب عدلیہ اور میڈیا دونوں ہی آزاد نہ تھے۔ عدلیہ کی آزادی کے

ثمرات تو ظاہر ہونا شروع ہو گئے لیکن میڈیا کی آزادی سے ایک نقصان بھی ہوا ہے۔ اب ڈراموں میں دل نہیں لگتا۔ بس آٹھ بجے رات سے بارہ بجے تک چینل بدل بدل کر زندہ کرداروں کے نت نئے ڈرامے دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر بارہ بجے کے بعد ریپیٹ (Repeat) ٹیلی کاسٹ! ایسے ہی ڈرامے کے ایک کردار کو شکوہ کرتے دیکھا کہ جب بھی ہماری پارٹی کی حکومت آتی ہے ہمارے خلاف کرپشن کے الزامات شروع ہو جاتے ہیں۔ اینکر پرسن بامروت تھے اس لیئے یہ نہ کہہ سکے 'کرپشن ہوتی ہے تو الزامات بھی لگتے ہیں۔ آپ کرپشن بند کر دو الزامات اپنی موت آپ مر جائیں گے'۔ ایک وزیر کا رونا بجا تھا کہ سب سے کم کرپشن ہماری پارٹی کے لوگ کرتے ہیں جبکہ یہ ہمارا حق ہے۔ پھر بھی سب سے کم کرپشن ہمارے دور میں ہوتی ہے۔ واقعی افسوس کا مقام ہے۔۔ حق ہونے کے باوجود کم کرپشن پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اللہ جانے کیا مجبوری ہے۔ حالانکہ پارٹی قربانیاں دیتی آئی ہے۔ کوڑے بھی کھائے ہیں۔ جیلیں بھی بھری ہیں۔ تو کیا اتنا بھی حق نہیں ہوگا۔ لوگوں کی یاد داشت ٹھیک نہیں، پارٹی کی قربانیوں کو بھول جاتے ہیں۔ آئے دن وزرا کو یاد دلانا پڑتا ہے۔ ہمارا تو پارٹی کو مشورہ ہے ایک ڈائریکٹری شائع کروا دے، جس میں پارٹی کے تمام صوبائی اور قومی اسمبلی ممبران، سینیٹرز اور وزرا کا بتایا جائے کہ کس کس نے کوڑے کھائے ہیں اور کون کون جیل میں رہا ہے۔ سرِ فہرست لکھے جانے کے قابل دو نام تو سب ہی جانتے ہیں۔ دونوں نے کافی مدت جیل میں گذاری ہے اور دونوں کا احسان قوم نے انہیں سب سے اونچے منصب پر بٹھا کر ادا کر دیا ہے۔ بقایا کا بھی علم ہو جائے تو قوم کی تشفی ہو جائیگی کہ انہیں بھی انکی دی ہوئی قربانیوں کے عیوض صحیح صلہ ملا یا نہیں۔ آج ۱۶ دسمبر ہے اس لیے ہمیں مرحوم 'مشرقی پاکستان' کی ایک فلم کا یہ ڈائیلاگ یاد آ گیا ''اگر غریب کو مارنا ہو تو اس کی عزت چھین لو۔ مر جائے گا اور امیر کو مارنا ہو تو اس کی دولت چھین لو۔ ختم ہو جائے گا (یہاں تو دونوں ہی داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔ عزت بھی، دولت بھی)

۱۶/دسمبر ۲۰۰۹ء

قائدِ اعظم

قائداعظم بیک وقت خوش نصیب بھی ہیں اور بدنصیب بھی، خوش نصیب اس لیے کہ ان کو قائداعظم کا جو لقب دیا گیا ہے اس سے بہتر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ بس یہ سمجھیے کہ یہ قائد ہونے کی آخری حد ہے۔ قائد ملت، قائد جمہوریت، قائد عوام یا قائد اعلیٰ جیسے خطابات قائداعظم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قائداعظم واقعی عظیم تھے۔ ان جیسا لیڈر برصغیر تو کیا پوری دنیا میں پچھلی آٹھ دس صدی میں تو پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی آئندہ کسی کے پیدا ہونے کی امید ہے۔ جب ہم یہ کہہ رہے ہیں تو یہ بات ریکارڈ پر لانا بھی ضروری ہے کہ اس میں کسی مذہبی شخصیت کا ذکر نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کفر کا فتویٰ لگانے والے سرگرم عمل ہو جائیں۔ ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے دور کا مسلمان چاہے کتنا ہی متقی اور پرہیزگار کیوں نہ ہو اس ادنیٰ مسلمان کی پیروں کی خاک کے برابر بھی نہیں جس نے ایمان کی حالت میں حضورﷺ کو دیکھا ہو۔

دنیا کے کسی لیڈر کو لے لیجئے۔ قائد جیسی فہم و فراست کسی میں نہیں۔ جب یہ کہہ رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری خوبیاں کسی ایک شخص میں نہیں ملے گی۔ کوئی مدبر ہے تو کوئی مقرر۔ کوئی دانشور ہے تو کوئی دیانت دار۔ کسی میں قائدانہ صلاحیت ہے تو کسی میں دلیری۔ کوئی سچا ہے تو کوئی صاف گو۔ غرض کہ تمام خوبیاں اگر یک جا ملیں گی تو فقط قائداعظم میں۔ قائداعظم نے اپنے محدود وسائل کے باوجود جن پہاڑ جیسے مسائل کا مقابلہ کیا وہ کسی عام آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ غیروں سے لڑنا آسان ہوتا ہے لیکن آستین کے سانپوں سے مقابلہ کچھ معنی رکھتا ہے۔ خاص طور پر مذہبی ٹھیکیدار اگر مخالفت پر کمر بستہ ہو جائیں تو عوام میں پزیرائی مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر مذہبی ٹھیکیدار بھی کون؟ وہ جو بات بے بات صرف کفر کے فتوے صادر کرنے پر قادر تھے۔ بیچارہ لاؤڈ سپیکر کس شمار میں تھا وہ لوگ تو قائد اور انکی بیگم محترمہ مریم جناح (محترمہ رتی جناح) کو بھی مسلمان ماننے پر تیار نہ تھے، جبکہ محترمہ کے اسلام قبول کرنے کی خبر سارے اخبارات میں چھپی تھی اور پارسیوں نے ہنگامہ بھی

کھڑا کیا تھا۔بس لاعلم رہے تو یہ علماء۔عقل کے مارے یہ نہیں سوچتے کہ انہیں سول میرج کرنے میں کیا چیز مانع ہوسکتی تھی۔

جس وقت قائد کانگریس کی عبوری حکومت کی چیرہ دستیوں سے برسرپیکار تھے یہ علماء کانگریس کے ساتھ کھڑے تھے۔قائداعظم کی فہم وفراست جانچنے کے لیے یہ ہی بہت ہے کہ تقریباً ۷۰ سال پہلے انہوں نے ''بندے ماترم'' کی مخالفت کی تھی اور کانگریسی حکومت کے خاتمے پر مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تھا۔جبکہ جمیعت علمائے ہندکو ۷۰ سال بعد اب یہ توفیق ہوئی کہ بندے ماترم کے خلاف فتویٰ صادر فرمارہے ہیں۔قائد نے غلط تو نہیں فرمایا تھا کہ ہمارے ساتھ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ہیں، جن کا علم وفراست ایک پلڑے میں اور بقایا علما کا علم دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو مولانا عثمانیؒ کا علم ان پر بھاری ہوگا۔یہ وہی مولانا ہیں جنہوں نے مولانا اشرف تھانویؒ کے ساتھ قائد کی دینی تربیت کی تھی اور جنہیں ہم مفسر قرآن شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے نام سے جانتے ہیں۔آپ نے قائد کی نماز جنازہ پڑھاتے وقت اپنی تقریر میں جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم یہ تھا کہ وہ بیشتر بزرگان دین اور علماء کی صحبت میں رہے لیکن قائد جیسا ایمان باللہ کسی اور میں نہیں دیکھا۔بقول منشی خان عبدالرحمان خان ''وہ صاحب ارشاد تھے۔حضور نبی ﷺ کے محبوب امتی اور برگزیدہ شخصیت بھی۔وہ عارف باللہ تھے۔''منشی صاحب نے دو کتابیں 'کردار قائداعظم' اور قائداعظم کا عقیدہ' بڑے اہتمام سے لکھیں۔ان میں ایسے دستاویزی حقائق پیش کیے گئے ہیں جنہیں جھٹلایا نہ جاسکا۔گواہوں کی فہرست میں وہ صاحب کمال دینی ہستیاں ہیں جن پر شبہ کرنا بھی ناممکن ہے۔ان میں سے ہم فقط، غازی صاحبؒ کا ذکر کریں گے۔غازی صاحب کے بارے میں منشی صاحب لکھتے ہیں (حوالہ کے لیے دیکھیے منشی عبدالرحمن کی 'کتاب زندگی' کا صفحہ ۳۷) کہ آپ 'غازی' کے عرفی نام سے معروف تھے۔کسی زمانے میں بغداد میں سونے کا کروبار کرتے تھے۔لاکھوں میں کھیلنے والے کی ایسی کایا پلٹی کہ انہوں نے قائداعظم کی روحانی اصلاح پر معمور من اللہ ہوکر لاہور میں کتابوں کا کاروبار شروع کیا اور تاج کمپنی کے قرآن لے کر حالات کا جائزہ لینے کے لیئے ملک کے طول وعرض میں دورے کرتے رہے۔اپنا اثر ورسوخ اتنا بڑھالیا کہ مسلم لیگ کے رکن بن کر قائد کے مقرب ومعتمد بن گئے۔بظاہر وہ ایک تاجر کتب تھے مگر باطن میں وہ ابدال

تھے۔مضمون کی طوالت کے پیش نظر ہم اختصار سے کام لیتے ہوئے اتنا بتانا چاہیں گے کہ قائداعظم کو بھی چونکہ ''عارف باللہ'' کا مرتبہ بخشا گیا تھا اور روحانی دستور کے مطابق عارف کی تدفین ابدال کے ذمے ہوتی ہے اس ہی لیے غازی صاحبؒ نے تن تنہا قائداعظم کے جسد خاکی کو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر اور خواجہ ناظم الدین کی موجودگی میں لحد میں اتارا تھا۔اس کے لیے انہیں اپنی جدہ روانگی موخر کرنا پڑی۔۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ کو جہاز میں اپنا سامان چھوڑ کر جنازے میں شرکت کی تھی۔جب قائد کے آخری سفر کا ذکر ہو ہی رہا ہے تو ہم جناب اسد ملتانی کے اس خط کا ضرور ذکر کریں گے جو انہوں نے منشی عبدالرحمن کو ۲۸ ستمبر کو لکھا تھا ملاحظہ ہو۔' قائداعظم کی وفات کے سلسلے میں ایک خاص بات جو غالبًا اخبارات میں نہ نکلی یہ تھی کہ ان کے لیے کوئی خاص تابوت نہیں بنوایا گیا تھا۔قریب کی مسجد سے عام تابوت منگوایا گیا تھا جس میں معمولی کھجور کے پتوں والی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔تابوت پر محض پاکستانی پرچم تھا، کسی قسم کی کوئی قیمتی چادر نہ تھی۔جھنڈے کے اوپر سر کی جانب تھوڑے سے پھول تھے البتہ قبر پر پھولوں کے انبار لگ گئے۔روزانہ پھول ہٹائے جاتے ہیں اور نئے پھولوں کا انبار لگ جاتا ہے۔ابھی تک رات دن قرآن خوانی کا سلسلہ جاری ہے۔اور لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔اس مرد خدا نے عجیب موت پائی ہے'۔قائد کی نماز جنازہ میں جہاں کہیں حیرت انگیز باتیں دیکھنے میں آئیں وہاں چشم فلک نے یہ بھی دیکھا کہ لاکھوں مسلمانوں کی موجودگی میں کئی پارسی اور عیسائی بھی اضطراری طور پر صف میں کھڑے ہوگئے۔کہتے ہیں بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جنکی نماز جنازہ پڑھنے والے بھی بخش دیئے جاتے ہیں۔میت اللہ کے پیارے کی ہوتی ہے۔نماز پڑھانے والا بھی اللہ کا ولی ہوتا ہے۔میت قائد اعظم کی تھی۔نماز پڑھانے والے مولانا شبیر احمدؒ عثمانیؒ جنہیں نماز پڑھانے کی بشارت ہوئی تھی اور لحد میں اتارنے والا ابدال تھا، جس نے تن تنہا انہیں لحد میں اتارا تھا۔

ہم نے شروع میں لکھا تھا کہ قائد بیک وقت خوش نصیب بھی تھے اور بدنصیب بھی۔خوش نصیبی دیکھیے کہ نماز جنازہ علامہ نے پڑھائی اور تدفین ایک ابدال کے ہاتھوں ہوئی۔جتنے قرآن انکے مزار پر پڑھے جاتے ہیں اتنے کسی اور لیڈر کو نصیب نہیں۔اگر کوئی بادشاہ، وزیر یا امیر اجرتاً بھی اتنے ختم قرآن کرانا چاہے تو نہیں کرواسکتا۔قائداعظم نے مرکر بھی دنیاوی تاریخ میں ایسا مقام حاصل کیا جو آج تک کسی لیڈر کو نصیب نہ

ہوا۔ بدنصیبی یہ کہ آج انکا پاکستان غلط ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔ آج انہیں سیکیولر ثابت کرنے پر سارا زور لگایا جارہا ہے۔ پچاسوں بار انہوں نے مسلم اسٹیٹ کی بات کی۔ کئی بار انہوں نے قرآن کی بالادستی کا کہا۔ ماؤنٹ بیٹن سے کہدیا کہ ہمارے آئین کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں وہ تو ہمیں ۱۴سو سال پہلے ہی قرآن کی شکل میں مل چکا ہے لیکن ہمارے دانشور اس کو بھول گئے اور ایک تقریر کو جو انہوں نے گورنر جنرل کی حیثیت سے کی تھی اس کو توڑ مروڑ کر سیکیولر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گورنر کی حیثیت سے انہوں نے جو کہا تھا اس کا مطلب تھا کہ اب سارے مذاہب کے لوگ پاکستانی ہیں اور سب کو مساوی حقوق حاصل ہونگے۔ یہ نہیں کہ اگر کوئی مسئلہ کسی مسلمان اور کسی اقلیتی کے درمیان ہو تو مسلمان ہونے کے ناطے مسلمان کو فوقیت ملے گی لیکن یار لوگ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ اسٹیٹ کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر سیکیولر ہوتے تو نکاح کی بجائے کورٹ میرج کرتے۔ بیگم کو مشرف بہ اسلام نہ کرتے۔ بیٹی کو غیر مسلم سے شادی کی پاداش میں عمر بھر صورت نہ دکھانے کا حکم نہ صادر کرتے۔

قائد نے تو سکھوں کو بھی ملانے کی کوشش کی تھی لیکن ماسٹر تارا سنگھ کی ہٹ دھرمی آڑے آئی۔ بعد میں ہندوؤں کے ہاتھوں رسوا ہونے کے بعد افسوس کیا کہ غلطی ہوگئی تھی۔ ایک اقلیتی لیڈر جناب مینڈل تو پاکستان آ بھی گئے تھے لیکن سازشیوں نے انہیں بھی ٹکنے نہیں دیا۔ طُرفہ تماشہ یہ کہ وہ حضرات جو بقول شخصے فقط آٹھ کی (جمعہ کی) کھاٹ کی (جنازے کی) اور تین سو ساٹھ کی (عیدین کی) نمازیں پڑھتے ہیں وہ بھی قائد کے نمازی ہونے پر شک کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں فقیر منش، دیانتدار مولانا حسرت موہانی کا سنایا ہوا یہ واقعہ کافی ہوگا۔ مولانا کانگریس کے سرگرم کارکن تھے۔ ایک دن غصے میں تہیہ کرکے کہ آج میں جناح سے نپٹ کر ہی رہوں گا۔ جناح صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ ملازم نے روکتے ہوئے کہا کہ اس وقت صاحب کسی سے نہیں ملتے۔ یہ سن کر مولانا طیش میں آ گئے اور بقول خود انکے ملازم کو ہٹا کر اندر چلے گئے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا تو انہوں نے کھڑکی سے جھانکا اور حیرت زدہ رہ گئے یہ دیکھ کر کہ قائد مصلے پر خضوع وخشوع سے نماز میں مشغول تھے۔ مولانا فوراً پلٹ گئے اور پھر کبھی قائد کی مخالفت نہیں کی۔ قائد نے جو کچھ مسلمانوں کے لیے کیا، اگر اس سے کم یا زیادہ کسی مولوی نے کیا ہو تو بتادے ہاں روڑے بچھانے میں پیش پیش تھے۔ ان علماء کی وجہ سے کانگریسی کہتے تھے کہ مسلمان تو

ہمارے ساتھ ہیں لیکن الیکشن میں پول کھل گئی جب ایک بھی کانگریسی مسلمان جیت نہ سکا۔ حتیٰ کہ سرحد میں سرحدی گاندھی کے پیروکار ایک بھی سیٹ نہ لے پائے۔ آج بھی ایک چینل سے قائد کے ایک کیریکچر پر مبنی ان کی گیارہ اگست کی تقریر کے اقتسابات، سیاق وسباق سے علیحدہ کرکے سنائے جارہے ہیں۔ نہ جانے کیوں ماؤنٹ بیٹن کی موجودگی میں کی گئی ۱۳ اگست کی تقریر نہیں سناتے، جس میں آئین کے حوالے سے قائد نے قرآن کا ذکر کیا تھا۔

۱۹/دسمبر ۲۰۰۹ء

شکریہ جسونت سنگھ

ہماری قوم کو امپورٹڈ چیزوں پر زیادہ اعتماد ہے۔ چاہے کوئی بیان ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی وضاحت سے پہلے قائداعظمؒ کی یوم پیدائش کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ قائداعظمؒ کی پیدائش کے موقع پر دانشوروں نے خوب خوب محفل سجائی۔ دانشوروں کے معاملے میں ہم خود کفیل تو پہلے ہی تھے لیکن اب اس میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اب مختلف چینلز کے اینکرز بھی اپنے تئیں نہیں تو اپنے ساتھیوں کے بقول دانشور ہو گئے ہیں۔ بس 'من ترا حاجی بگویم، تو میرا حاجی بگو' والی کیفیت ہے۔ یہ ہی رفتار رہی تو ہوسکتا ہے ہم سرپلس گندم کی طرح دانشوروں کو بھی ایکسپورٹ کرنے کے قابل ہو جائیں۔ دانشوروں اور ایک دو اینکر پرسنز نے اس بار ہمارے قائد کو سیکیولر ثابت کرنے کی کوشش میں کچھ پہلے سے زیادہ آزادیء اظہار کا مظاہرہ کیا۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بالکل ہی کھل کر اظہار نہیں ہوا۔ ہاں عوام کے ذہن میں بوائی کر دی ہے۔ دو چار سال میں فصل حسب منشا ہوگی۔ ایسے میں جب ہمارے دانشور اور ٹی وی کے میزبان قائد کے قد کاٹھ کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے جسونت سنگھ نے یہ کہہ کر کہ قائداعظمؒ پاکستان کے نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے عظیم رہنما تھے اور گاندھی بھی انہیں قائداعظم کہہ کر مخاطب کرتے تھے، 'ہمیں شکریہ جسونت سنگھ' کہنے کا موقع فراہم کر دیا۔ ورنہ ہمارے اپنے تو گاندھی کو فوقیت دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ایسے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب ہمیں بیانات بھی امپورٹ کرنے پڑیں گے۔ اس سے توازن بھی برقرار رہے گا۔ سرپلس دانشور ایکسپورٹ۔ اور پاکستان اور قائداعظم کے حق میں دیے گئے بیانات امپورٹ۔ ہمارے بوٹے قد والے (لیڈر تو نہیں، کیونکہ انہیں لیڈر کہنا لیڈروں کی توہین ہے) ممبران اسمبلی، اپنے پنجوں پر کھڑے ہو ہو کر قائداعظم کو سیکیولر ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان بوٹا سنگھوں سے کوئی یہ پوچھنے والا نہیں کہ اگر قائد سیکیولر تھے تو پھر ان کے اپنے صوبے میں ان کے سکہ بند سیکیولر قائدین کانگریس کے لیے ایک بھی سیٹ کیوں حاصل نہ

کر سکے تھے۔ ان کی تو زبان، کلچر، سب ہی کچھ تو صوبے کے عوام جیسا تھا۔ پھر کیوں انہیں مسترد کر دیا گیا تھا۔ کیا صوبے کے عوام، مذہب کی بنیاد پر مسلم لیگ کے حامی نہ تھے۔ آج مشرف کی مہربانی سے الیکشن جیت گئے ہیں تو صوبے کے نام میں خرابی نظر آ رہی ہے انگریزوں کے زمانے میں بھی تو ان کی حکومت تھی اس وقت تبدیلیء نام کا خیال کیوں نہیں آیا۔ ایک بوٹا سنگھ، اللہ جانے حاجی ہیں یا انکا نام حاجی ہے، یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سے 'اسلامی' نکال کر 'عوامی' ڈالدیا جائے۔ عوامی کا مطالبہ کرنے والے اس بچہ جمہورا کی عوام میں کتنی پزیرائی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پارٹی کی لیڈر نے اس مطالبہ کا از خود نوٹس لے لیا ہے۔ جلد ہی انہیں لیڈری سے ہٹا کر عوامی بنا دیا جائے گا۔ آج ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اچھا اور بڑا دانشور وہ ہے جو پاکستان مخالف ہو، یا اسلام مخالف۔ نہیں تو وہ، جو کم از کم حقیقت پسند ظاہر کرنے کے لیے قائد کی خوبیاں بیان کرتے کرتے ایک آدھ شوشا ان کی عیب جوئی کے لیے چھوڑ دے۔ اب الزام لگا دیا۔ صفائی پیش کرتے رہو۔ صفائی بھی وہ پیش کریں گے جو پہلے سے ہی قائد کے چاہنے والے ہیں۔ مخالفین کیوں تردد کریں؟ بحث چھڑ گئی۔ اب عوام کی قسمت کہ وہ کس کے نکتہءنظر سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ باقاعدگی سے تو مباحثوں کا حصہ بنتے نہیں جب، جہاں، جو، سن لیا وہ مستند ٹھہرا۔ یہاں ایک بات دہرانا ضروری ہے کہ مخالفین اس کام کو زیادہ تندہی سے کرتے ہیں۔ مثال یہ ہے کہ قائد کی ۱۱، اگست کی ایک تقریر کا آپ بہت چرچا سنتے ہیں جس میں انہوں نے اقلیتوں کے حق میں بات کی تھی اگر دیکھا جائے تو یہ میثاق مدینہ کی روح کے مطابق تھی لیکن یار لوگوں نے اس میں سے سیکیولرزم برآمد کر لیا۔ نعوذ باللہ۔ ان کا بس چلے تو شاید میثاق مدینہ کے بعد یہ لوگ اس وقت کے مسلمانوں کو بھی سیکیولر کہنے سے باز نہ آئیں۔ یہ لوگ ۱۳، اگست کی اس تقریر کا کبھی ذکر نہیں کرتے، جس میں قائداعظم نے کہا تھا کہ ہمیں تو ۱۴۰۰ برس پہلے ہی ہمارے رسول ﷺ نے قرآن کی شکل میں آئین دے دیا تھا۔ قائد نے اپنی کسی ایک تقریر میں بھی لفظ سیکیولر استعمال نہیں کیا تھا۔ لیکن ہمارے دانشور حضرات اس لفظ کو قائد سے منسوب کرنے کے چکر میں دروغ گوئی کی تمام حدیں پار کر جاتے ہیں۔ حالانکہ قائد کی اس تقریر سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ سیکیولرزم چاہتے تھے۔ نہ انہوں نے ایسی کوئی بات کی۔ بالفرض محال کہہ بھی دیا تھا تو اس کے لیے یہ اتنے بے چین کیوں ہیں۔ ان کی اور کون کونسی بات پر عمل

ہو رہا ہے جو اس کے لیے طوفان کھڑا کر دیا ہے۔ کیا جو کچھ یہاں ہو رہا ہے وہ قائد کے فرمانوں کی روشنی میں ہو رہا ہے۔ جھوٹ، بے ایمانی، اقربا پروری، وعدہ خلافی، بہتان، جن سے قائد کو نفرت تھی یہاں عام ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری جائداد پاکستان کو دے دی تھی۔ تنخواہ ایک روپیہ لیتے تھے۔ کیا ہمارے حکمران اس پر عمل کر رہے ہیں۔ پھر گیارہ تاریخ کی تقریر پر اتنا زور کیوں؟ ۱۳ تاریخ کی تقریر تو بعد کی ہے اسکا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ ایک نئے نئے دانشور نے یوم قائد پر تو حد ہی کر دی۔ دوران انٹرویو ایک تو انٹرویو لینے والی خاتون کے حسن کی وجہ بے وجہ تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ دوسرے اپنی چند کمزوریوں کا بلاکم وکاست ذکر کر کے اپنے آپ کو سچا، کھرا اور صاف گو ثابت کر دیا۔ اپنے آپ کو بے خوف ظاہر کرنے کے لیے مشرف کی تعریف بھی کر دی۔ اپنے آپ کو کھلے ذہن کا جتانے کے لیے اپنے صوبے کے لوگوں کی تھوڑی برائی بھی کر دی۔ اپنے دو چار ہم عصر اینکرز کی کھل کر تضحیک کر دی۔ اپنے آپ کو لبرل اور نان فنڈامینٹلسٹ کی حیثیت دینے کے لیے یہ بھی فرمایا کہ ان کی نظر میں آج کا دن کرسمس کے حوالے سے زیادہ اہم ہے۔ قائد پر تو کبھی بھی بات ہو سکتی ہے۔ جیسے کرسمس پر آج کے علاوہ بات نہیں ہو سکتی۔ بے چاری کمپیر رکو تو اس کے حسن کی تعریف کر کے پہلے ہی ارتھ (earth) کر دیا تھا۔ اب اس کے پاس صرف ہاں میں ہاں ملانے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ اپنے آپ کو سچا اور کھرا ثابت کرنے کے بعد قائد کی تعریف کی اور پھر صاف گوئی کے لیے اپنا اختلاف بھی بیان کر دیا کہ قائد نے خود کیوں گورنر بننا پسند کیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو کیوں نہیں بنایا۔ اب یقین جانیے اس پر اتنی باتیں ہو چکی ہیں اور اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ کوئی جینوئن دانشور اس پر کہنا سننا پسند نہیں کرے گا۔ اگر خاتون کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پوچھتا کہ اس سلسلے میں اتنے دلائل سامنے آ چکے ہیں۔ کیا پڑھے نہیں یا سمجھ نہیں آئے؟ وہم کا علاج لقمان کے پاس نہیں تھا لیکن حماقت کا علاج تو خاتون کمپیر رکے پاس ہونا چاہیے تھا لیکن بے چاری اپنے حسن کی تعریف سن کر احسانوں کے بوجھ تلے دب گئی تھی۔ موصوف کے پروگراموں کے پرومو (Promo) میں بتایا جاتا ہے کہ موصوف ایک ہی ہیں۔ واقعی، 'ایک' ہی ہیں۔ ان کے سطحی ہونے کے لیئے انکا پرویز مشرف کا حامی ہونا ہی کافی ہے۔ لمبی بحث میں الجھنے کی بجائے کہ مشرف اچھا تھا یا برا یہ بتایا جائے کہ آئین توڑنے کی سزا کیا ہے۔ کوئی اچھا آدمی کسی کو قتل کر دے تو کیا اسے اس لیے معاف کر دیا جائے گا کہ وہ اچھا آدمی تھا۔ اگر یہ درست مان

لیا گیا تو ہر آدمی کو حق ہو گا کہ راستے میں پڑے ہیروئن چیوں کو قتل کر دے کہ یہ معاشرے کا ناسور ہیں۔ صحافت کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں یہ نہیں کہ مونہہ پھاڑ کر کسی کے بارے میں کچھ بھی کہہ دیا۔ جس طرح کے الفاظ موصوف نے ڈاکٹر شاہد کے بارے میں کہے یہ انہیں زیب نہیں دیتے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ آج کل دو تین صحافیوں نے ہرٹاک شو کو ہارڈ ٹاک (HARD TALK) بنا دیا ہے۔ جس طرح سے چیخ چیخ کر مہمانوں سے زیادہ خود بولنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے تو یہ لگتا ہے یہ اینکرز نہیں پارٹیسپنٹ (Participant) ہیں۔ ہم صحافی نہیں لیکن پھر بھی موصوف کا نام لیئے بغیر یہ کالم لکھ رہے ہیں

۲۸ر دسمبر ۲۰۰۹

جھوٹ، جھوٹ نہ رہا

کافی عرصے پہلے ایک نغمہ سنا تھا، جو اچھا لگا تھا۔ بول تھے 'دوست، دوست نہ رہا'۔ سن کر یہ خیال آیا کہ دوست کے نہ رہنے کے لیے اس کا ہونا بھی تو ضروری ہے۔ اگر دوست ہوگا ہی نہیں تو نہ ہونے کا کیا سوال۔ ہوسکتا ہے اس ہونے نہ ہونے نے کنفیوژن پیدا کر دیا ہو بالکل اس طرح جیسے۔ ع

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اس کنفیوژن کو دور کرنے کے لیے ایک لطیفے کا سہارا لیتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک شخص کافی ہاؤز میں داخل ہوا۔ فوراً ویٹر سے بولا' جلدی سے ایک کپ کافی لے آؤ۔ خوب گرم اور ہاں!۔ وود آؤٹ کریم'' without cream ''(بغیر کریم کے)۔ ویٹر کچھ دیر بعد لوٹا اور بولا'' سر، کریم تو موجود نہیں ہے۔ دودھ ہے۔ کہیں تو ود آؤٹ ملک (بغیر دودھ کے) لے آؤں''!!!

اب اس نغمے کے بول، شعر اور لطیفے کو ذہن میں رکھیے، انشا اللہ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ بہ آسانی سمجھ میں آجائے گا۔ ہم فقط یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ آج کل جھوٹ، جھوٹ نہیں، جھوٹ کے علاوہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ جھوٹ فیشن ہوسکتا ہے، جھوٹ ایک آرٹ ہوسکتا ہے، ایک پالیسی ہوسکتا ہے۔ تکنیک ہوسکتا ہے۔ حکمت عملی، لائحہء عمل ہوسکتا ہے۔ ان سب یا ان میں سے کچھ کو استعمال کرنے والے کو اگر فقط ایک لفظ سے ظاہر کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے فائدہ؟ خواہ مخواہ کوئی وزیر ناراض ہو جائیگا۔ اس لیئے آگے بڑھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ جھوٹ کو اتنے رنگ کس نے دیے؟ یہ اچانک ہوا یا بتدریج اس نے اپنی جُون بدلی۔ یہ دور مشرفی کی بات ہے جب میڈیا نے ٹاک شوز کا سلسلہ شروع کیا۔ ہوسکتا ہے یہ ٹاک شوز پہلے بھی ہوتے ہوں لیکن مقبولیت ۹ مارچ کے بعد ملی جب چیف جسٹس کو معزول کر دیا گیا۔ اینکر پرسنز، وزیروں کو بلواتے، وکیلوں، مبصروں، تجزیہ نگاروں کے علاوہ دانشور حضرات بھی آتے۔ خوب بحث

مباحثے ہوتے۔ وزیر بے چاروں کا کمزور موقف انہیں جھوٹ کا سہارا لینے پر مجبور کرتا۔ بات اتنی بڑھی کے وزیروں نے جھوٹ میں مہارت حاصل کر لی۔ ان جھوٹوں کے پیش امام تو ایم اے غلط بیانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ دوسروں میں شیر افگن، شیخ رشید، وصی ظفر، طارق عظیم کے علاوہ بھی کئی اور تھے جو پیش امام کے پیچھے نہیں بلکہ ساتھ تھے۔ یہ ہی لوگ تھے جن کی وجہ سے ہمیں ''جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسنے'' والا محاورہ سمجھنے میں آسانی ہوئی۔

اس دور میں جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنا مشکل ہوگئی تھی لیکن بقایا صفات جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں ابھی جھوٹ کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں نہ لے پائی تھیں۔ ہوسکتا ہے اس کی وجہ میڈیا رہا ہو جو اس وقت تک اتنا با اثر نہیں ہوا تھا۔ بعد میں میڈیا نے جب وزیروں کو دیوار سے لگانا شروع کیا تو انہوں نے بھی اپنے جھوٹ کو نئے نئے رنگ دینا شروع کر دیے۔ اب یہ ہونے لگا کہ میڈیا نے پرانے کلپ دکھانے شروع کیے، تو وزرا نے ''میں نہ مانوں'' کی پالسی اپنالی۔ اب اس کے لیے آرٹ کا سہارا لیا گیا اور جھوٹ کو ایک آرٹ بنا دیا۔ ان کا اب یہ حال ہے جو اس شخص کا تھا جس نے ایک غلط بات پر شرط لگالی تھی۔ رقم خطیر تھی اس لیے ایک دوست نے کہا' یار یہ کیا کیا۔ تمہارے جیتنے کا تو رتی بھر بھی چانس نہیں۔ رقم تو ہاتھ سے جائے گی۔ مخالفین چٹکی بجاتے تمہیں غلط ثابت کر دینگے'۔ ہنس کر بولا' ایسے ہی ثابت کر دیں گے، میں مانوں گا ہی نہیں تو کیا کر لیں گے'۔ اب جھوٹ ایک آرٹ ہے۔ آرٹ کے علاوہ اب کچھ وزرا پالیسی کے تحت بولتے ہیں اس لیے وہ سمجھتے ہیں پالیسی کے تحت بول رہے ہیں تو یہ جھوٹ کیسے ہوا؟ اس ہی طرح کچھ اسے فیشن کے طور بھی اپنائے ہوئے ہیں۔ پہلے پہل تو یہ وزرا کچھ سہمے سہمے رہتے تھے پھر وقت گذرتا گیا تو انہوں نے حکمت عملی بدل ڈالی۔ اب تحمل کی بجائے چیخنے چلانے اور مخالف کو نہ بولنے دینے والی حکمت عملی اپنالی گئی۔ لائحہ عمل یہ رہا کہ سوال کے جواب کو اتنا طول دو کے مزید سوالات آ ہی نہ سکیں۔ یہ پالیسی کامیاب رہی کہ اینکر پرسنز کا کنٹرول ہی ختم ہوگیا۔ اب مطالبات بھی برسر اقتدار لوگ کرنے لگیں ہیں۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسے پولس مطالبہ کرنے لگے کہ چوروں کو پکڑا جائے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے یہ حزب اختلاف کی نمائندگی کر رہے ہیں اور جو کچھ کرنا ہے وہ ان کا نہیں اوروں کا کام ہے۔ مزید لطف یہ کہ وزرا کی بجائے مخالفین سسٹم بچانے کی فکر میں پڑ گئے ہیں۔

آج جتنی ہم آہنگی مختلف فرقوں میں دیکھنے میں آرہی ہے شاید کبھی نہ تھی۔امریکہ اور قادیانوں سمیت کئی اندیکھی طاقتیں فرقہ وارانہ فساد کرانے کے درپے ہیں لیکن انہیں ناکامی کا مونہہ دیکھنا پڑ رہا ہے، ایسے میں ایک حکومتی نمائندے کو مونہہ سے جھاگ نکالتے ہوئے دیکھ کر تعجب ہوا موصوف غصے اور جذبات میں اپنے ممدوح کو حسینیت کا درجہ دینے میں بھول گئے کہ آج کا کوئی بھی مسلمان چاہے کتنا ہی نیک اور پارسا کیوں نہ ہو امام عالی مقام کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔موصوف جوش خطابت میں بھول گئے کہ وہ کسی دینی مجلس میں نہیں، سیاسی مباحثے میں بیٹھے ہیں۔مخالف کو منافق تو اس طرح کہہ رہے تھے جیسے خود سچے ساوتری' ہوں ان کا کہنا تھا کہ منافقین کے بارے میں جو سورۃ اتری ہے وہ انکی پارٹی کے ایک منحرف لیڈر، جو خیر سے گورنر بھی رہ چکے ہیں، کے لیے ہے۔اچھا ہوا وہ صاحب ٹیلی فون پر تھے ورنہ ہوسکتا ہے ہاتھا پائی ہو جاتی۔موصوف ہر سیاسی بات کو گھما پھرا کر واقعہ کربلا سے منسلک کرنے کے چکر میں یہ بھی بھول گئے کہ یہ وقت فرقہ واریت کو ہوا دینے کا نہیں ہے۔مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ کے مصداق کہنے لگے کہ 'فلاں کو حضرت' کہنے والے اپنے بچوں کا یہ نام کیوں نہیں رکھتے۔پہلی بات تو یہ کہ ایسی باتوں کو چھیڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی کیونکہ سارے مباحثے میں اس کا ذکر ہی نہ تھا۔دوسرے یہ بتائیں کہ اگر واقعی کسی نے اپنے بچے کا یہ نام رکھ بھی دیا تو کیا ان جیسے کم ظرف اسے برداشت کرلیں گے کیونکہ ایک مقرر نے ممبئی میں اپنی تقریر میں اس نام کو ذرا احترام سے ادا کیا تھا تو کراچی کی دیواروں پر اس مقرر کے لیے وہ وہ فحش کلمات لکھے گئے تھے کہ بچے بوڑھے اور خواتین نظریں چراتے گزرتے تھے۔تیسرے یہ کہ کیا انکے اپنے گھر میں مرد و خواتین کے نام حضورﷺ کے تمام جانشینوں کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔اگر نہیں تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ موصوف اپنی پارٹی کو بچانے کے لیے ملک میں فرقہ وارانہ ہنگامہ کروانا چاہتے ہیں۔

آخر میں تمام ٹی وی میزبانوں سے درخواست ہے کہ مہمانوں کو قابو میں رکھنا ان کی ذمہ داری ہے۔ورنہ ان جیسے سیاسی بونے نفرت کا بیج بونے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ہمیں ایسے تمام ایشوز پر بات کرنے سے گریز کرنا چاہیے جس سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہو۔میزبان کو اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ کوئی جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے۔جن صاحب کا ذکر ہو رہا ہے وہ بار بار بتا رہے تھے کہ وہ بی بی کے ساتھ دبئی

میں بھی تھے امریکہ میں بھی تھے۔ہمیں شک ہے کیونکہ اتنے تھرڈ گریڈ کارکن کا بی بی کے قریب ہونا بعید از قیاس ہے۔ہر ہر بات میں وہ اپنی چشم دیدگی ظاہر کر رہے تھے۔اچھا ہوا پروگرام کا وقت ختم ہو گیا ورنہ یہ بھی سن لیتے کہ بی بی نے وصیت بھی ان کے سامنے ہی لکھی تھی اور کیا پتہ ان کے مشورے سے ہی لکھی ہو؟ واقعی اب جھوٹ جھوٹ نہ رہا۔۔

۷/جنوری ۲۰۱۰

جمہوریت ۔۔۔بہترین انتقام

اسلام ہماری ہر ہر طرح سے رہنمائی کرتا ہے۔کونسا مسئلہ ہے جس کا حل اسلام میں نہیں۔یہ اور بات کہ ہر وہ حل جو ہمیں پسند نہیں یا ہمارے ذاتی مفادات کو تحفظ نہیں دیتا، اسے ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اسلام قرآن کے احکام اور حضورﷺ کے فرمان اور سنت پر عمل کرنے کا نام ہے۔کوئی بھی چیز جو انسانیت اور اخلاق سے متصادم ہو، اسلام سے متعلق نہیں ہوسکتی۔ہاں کسی نہ کسی مسلک سے متعلق کر لی گئی ہو تو کسی کا کیا دوش۔قرآن نے ہمارے لیے ایک ضابطہء حیات مرتب کیا ہے جس کی تشریح رسول اکرمﷺ نے فرما دی ہے۔اب زندگی کے ہر مسئلے کے حل کو اللہ کی دی ہوئی کسوٹی پر پرکھ لو، انشا اللہ کوئی پریشانی نہ رہے گی۔

اللہ تعلیٰ اور اس کے رسولﷺ نے واضع کر دیا تھا کہ اگر کوئی اسلام قبول کر لے تو اس کے پچھلے دور کا باب بند کر دیا جاتا ہے۔لیکن ہم مسلمان اس کو نہیں مانتے۔چاہے دینی معاملہ ہو یا سیاسی، تائب ہونے والے کی جان نہیں چھوڑتے۔ہاں اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ کے تحت اپنے لیے ایک اصول اور مخالفین کے لیے دوسرا۔سیاست میں بھی خود نے اگر کوئی پارٹی چھوڑ دی تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن مخالف چاہے کتنا ہی متقی کیوں نہ ہو جائے اسکا ماضی اس کے لیے وبال جان بنا رہے گا۔ہمارے اکثر سیاستداں دوسروں کو مارشل لا کی پیداوار بتاتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ وہ خود بلواسطہ یا بلاواسطہ اس ہی کشتی کے سوار رہے ہیں۔پاکستان کا کوئی بھی سیاستدان اس سے مستثنا نہیں۔۱۹۵۸ سے پہلے کے سیاستداں گرچہ کسی جنرل کی نرسری میں نہیں پڑھے تھے لیکن وہ بھی کسی نہ کسی نرسری سے ضرور وابسطہ رہے تھے۔لیکن اسلام نے اس کے بارے میں بھی واضع کر دیا ہے کہ کسی کو پرکھنے کے لیے اس کے ماضی سے زیادہ بہتر ہے اس کے حال پر نظر رکھو۔اس کے لیے حضرت عمرؓ کی بہترین مثال ہمارے سامنے ہے۔یہ واقعہ بھی ہمیں یاد رکھنا چاہیے جب ایک کافر نے دوران جنگ کلمہ پڑھ لیا تو ہمارے نبیﷺ نے واضع کر دیا تھا کہ دلوں کا حال صرف اللہ جانتا ہے اس لیے کسی

کی نیت پر شک نہ کرو کہ یہ دل سے تائب ہوا یا نہیں۔ہماری قوم کا ایک اور المیہ ہے۔ہمارے قول اور فعل میں تضاد ہے ہم ایک طرف جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو دوسری طرف بادشاہت کے زیر اثر ہیں۔وراثت بادشاہت میں ہوتی ہے جمہوریت میں نہیں۔بادشاہت کی کوئی جگہ اسلام میں نہیں۔لیکن ہم اپنے بچوں کو بادشاہوں کی کہانیاں سنا کر ان کے ذہنوں کو بادشاہت کے لیے تیار کرتے ہیں۔اس ہی طرح اگر وراثت کا تصور صحیح ہوتا تو قائداعظمؒ انتقال سے پہلے محترمہ فاطمہ جناح کو نامزد کر جاتے۔وہ وقت ایسا تھا کہ کوئی مولوی ان کی مخالفت کی جرائت بھی نہیں کر سکتا تھا۔بادشاہت کی نفی تو وہ پہلے ہی فرما چکے تھے جب انہوں نے شہنشاہ پاکستان کا نعرہ لگانے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔یہاں تو فنکار حضرات بھی اپنی تاجپوشی پر پھولے نہیں سماتے۔

غالب نے کہا تھا جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہ دیکھ سکے وہ آنکھ آنکھ نہیں، بچوں کا کھیل ہے۔ہم نے قطرہ اوپر بیان کر دیا اب دجلہ آپ خود دیکھ لیں۔ہم اگر تشریح کرنے بیٹھ گئے تو دینی اور سیاسی دونوں محازوں پر مارے جائیں گے کہ محترمہ مریم (رتی) جناح کے قبول اسلام پر یہ ہی کہا جاتا رہا ہے کہ دل سے نہیں قبول کیا تھا۔اس ہی طرح جہاں سیاست میں جرنیلوں کی نرسری سے سیاست کرنے والوں کو منحرف ہونے کے باوجود یہ طعنہ سننا پڑتا ہے کہ وہ تو مارشل لاء کی پیداوار ہیں وہاں یہ خوشی کا مقام ہے کہ کم از کم ایک سیاستداں تو ایسا تھا جس کو ۸ سال مارشل لاء کی حمایت کرنے اور شمع جمہوریت کو گل کرنے میں معاونت کے باوجود اس کے تائب ہونے کے بعد ماضی کے حوالے سے نہیں بلکہ اس کے اپنے کارناموں کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔جمہوریت کے فروغ کے لیے اس کے اقدامات کو سراہا جاتا ہے۔شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ جمہوریت کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے مرتبہء شہادت پر فائز ہوا ہو۔اس ہی کی وجہ سے آج ملک میں ٹوٹی پھوٹی جیسی بھی ہے جمہوریت ہے تو سہی۔

جمہوریت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں سروں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا۔اور یہ ہی اس کا عیب ہے اس ہی لیے یہ ایک بہترین یا بدترین انتقام ہے۔دور ایوبی میں یہ ہی ہوا تھا۔جب ۸۰ ہزار ممبران بنیادی جمہوریت میں سے بھاری اکثریت مادر ملت کے نام پر جیتی تھی لیکن جب صدارتی انتخاب ہوا تو یہ بھاری

اکثریت، جس کو عوام نے مادرملت کے نام پر ووٹ دیا تھا اور جن لوگوں نے مادرملت کو ووٹ دینے کی قسم کھائی تھی یا تو پیسوں کی خاطر یا خوف کی وجہ سے ایوب کو جتانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اس ۸۰ ہزار کے الیکٹورریٹ کالج (electorate college) نے قرآن پر حلف اٹھوانے کی پاداش میں عوام سے انتقام لیتے ہوئے ایوب کو جتوادیا۔ جمہوریت واقعی بدترین انتقام ہے کہ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کینڈیڈیٹ نے کتنے ووٹ لیے، یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مخالفت میں کتنے ووٹ آئے۔ اسے یوں سمجھیے کہ ۱۰۰ ووٹ ہیں اور چار امیدوار۔ ایک امیدوار اگر ۳۰ ووٹ لے، ۷۰ ووٹ بقایا تین امیدوار لے لیں تو جمہوری اصول کے تحت ۳۰ ووٹ لینے والا جیت جائے گا۔ بقایا تین میں سے چاہے ایک نے ۲۹ دوسرے نے ۲۸ اور تیسرے نے ۱۳ ووٹ لیے ہوں، کامیاب تو ۳۰ والا ہی ہوگا۔ اس ہی طرح سے ۸۰ ہزار بنیادی جمہوریت کے ممبران بک سکتے ہیں تو تین چار سو کی اسمبلی کیوں نہیں۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارا خیال ہے اس انتقام کو ہمیشہ کے لیے ختم کردینا چاہیے کہ اللہ کی نظر میں بھی انتقام پسندیدہ نہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے انتقام کی بجائے ایک بہترین نظام اپنا لیں۔ اس کے لیے الیکشن میں تھوڑا خرچہ بڑھ جائے گا لیکن نتیجہ بہتر ہوگا۔ اس کے لیئے انتخابات دو حصوں میں ہوں۔ پہلے مرحلے میں سب سے زیادہ ووٹ لینے والے پہلے دو امیدواروں کے مابین دوسرا مقابلہ ہو، تاکہ ان دونوں میں سب سے زیادہ ووٹ لینے والا کامیاب قرار دیا جاسکے۔ صدارتی۔ قومی اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات ایک ہی دن ہوں۔ وقت صبح آٹھ سے شام سات بجے تک کا ہو۔ صدارتی امیدوار کا کسی پارٹی سے تعلق نہ ہو۔ اس کے لیے ووٹ براہ راست عوام سے لیا جائے۔ سینیٹ کا ڈھکوسلہ ختم کردیا جائے۔ کیا ضروری ہے کہ دوسروں کی نقالی کی جائے۔ ہر الیکشن بوتھ میں کیمرے ہوں جو پورے دن کی کارروائی رکارڈ کریں۔ جعلی ووٹ یا بیلٹ بکس کی تبدیلی کا غم نہیں رہے گا۔ ہمیں امید ہے اگر صحیح لوگ ایک بار بھی منتخب ہوگئے تو جمہوریت ایک بہترین نظام ثابت ہوگی اور عوام انتقام سے بچ جائیں گے۔ عمل ہو یا نہ ہو مشورہ دینے میں کیا حرج ہے

۱۰/جنوری ۲۰۱۰ء

گلو بھائی گلو بھائی

بھارت نے ایک فلم بنائی تھی 'غلامِ مصطفےٰ'۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ ایک غیر مسلم معاشرے میں اسلامی نام کا اتنا صحیح تلفظ۔ ورنہ ہمارے یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے ہمارے یہاں پیغمبروں اور صحابہ اکرام کے نام تو بڑی عقیدت سے رکھ لیتے ہیں اور نام کے ساتھ غلام بھی لگا دیتے ہیں لیکن معنی پر غور نہیں کرتے۔ یہاں نام ہوتا ہے غلام مصطفےٰ، غلام محمد، غلام یہ غلام وہ۔ یہ نہیں سوچتے کے اس میں غلام کے ساتھ زیر لگانا ضروری ہے، جیسے غلامِ احمد (Ghulaam-e-Ahmed) یا غلامِ رسول۔ زیر لگانے سے معنی ہوتے ہیں رسول کا غلام یا محمدؐ کا غلام۔ وگرنہ معنی بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اس سے توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اس ہی طرح عبدالرحمٰن کو بھی رحمٰن کہہ کر پکارا جاتا ہے

ہمارے ہاں تعلیم کی کمی نے بھی کافی گل کھلائے ہیں۔ دوسروں کی نقالی میں حد سے گذر جاتے ہیں۔ انگریزی کی نقل ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر کسی نے اپنی دکان کا نام بیوٹی کارنر رکھ لیا ہے تو دوسرا اس کی نقالی میں یہ نہیں دیکھے گا کہ اس کی دکان کونے پر نہیں بیچ میں ہے وہ اپنی دکان کا نام میک اپ کارنر رکھ لے گا۔ کئی کونوں/نکڑ پر موجود دکانیں سینٹر کا لاحقہ لیے ہوتی ہیں جیسے آفتاب سگریٹ سینٹر وغیرہ۔ کراچی میں گلستانِ جوہر میں ایک عطریات کے کھوکے والے نے سڑک کے درمیان ایک گذرگاہ (Cut or crossing) کا نام پرفیوم چوک رکھدیا اور اس کی تشہیر بھی خوب خوب کی۔ کراچی کی دیواروں پر جا بجا پرفیوم چوک کی چاکنگ نے ایسی شہرت دی کہ حیدرآباد لطیف آباد میں ایک عطریات بیچنے والے نے اپنے کھوکھے کا نام پرفیوم چوک رکھدیا۔ انگریزی زبان سے لوگوں نے خوب فائدے اٹھائے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے کسی بھی پیشے کو برا نہیں بتایا لیکن یار لوگوں نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی نائی۔ قصائی درزی اور دھوبی کے پیشوں کو اس طرح کم تر جانا کہ بیچاروں کو انگریزی میں پناہ لینی پڑی۔ نائی، ہیر ڈریسر یا ہیر کٹنگ سیلون و بیوٹی سیلون والے ہوگئے۔ قصاب

بوچر یا میٹ مرچنٹ (Butcher or Meat merchant) بن گئے۔ باورچی بھی کیٹررز (caterers) ہوئے، درزی ڈریس ڈیزائنر، ٹیلرز ماسٹر تو دھوبی ڈرائی کلینرز ٹھہرے۔ انگریزی میں تبدیلی نے ان پیشوں کو با عزت بنادیا جب کہ اسلام نے تو پہلے ہی کسی پیشے کی تضحیک سے منع فرمایا ہے۔

ایسی چھوٹی چھوٹی برائیاں ہمارے اندر پیدا ہوگئی ہیں کہ ہمارا پورا معاشرہ ہی مسخ ہوکر رہ گیا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ کوئی بھی اپنے آپ کو یا معاشرے کو سدھارنا بھی نہیں چاہتا۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ ابھی ہم پٹری پر ہی نہیں چڑھے ہیں اور پٹری پر آنے کے بعد بھی کم از کم دو سو سال لگیں گے سدھرنے میں!!

اگر غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ سوچ بھی درست نہیں۔ سوچتے کچھ ہیں اور کرتے برعکس ہیں۔ جلد بازی ایسی کہ لگے گا ان سے زیادہ وقت کا قدردان کوئی نہ ہوگا، اور وقت کا زیاں بھی یہیں ملے گا۔ شادیوں میں تین چار سو آدمی کم سے کم دو گھنٹے کھانے کا انتظار کرتے ہیں۔ یعنی ۶۰۰ سے آٹھ سو گھنٹے برباد اور دکھ کسی کو نہیں۔ جلد بازی دیکھنی ہو تو ریلوے پھاٹک پر دیکھیے۔ ہر شخص جلد بازی میں کار۔ موٹر سائکل اور رکشہ اس طرح آگے لے آئے گا کہ اپنی لین سے نکل کر سامنے سے آنے والی گاڑیوں کے راستے میں حائل، اب پھاٹک کھلنے پر دونوں طرف کا ٹریفک پھنس جائے گا۔ دو منٹ بچانے کے چکر میں ۳۰ منٹ گئے۔

اسلام میں صفائی کو نصف ایمان کا درجہ حاصل ہے۔ ہم سے ہر طرح سے کم تر تھائی لینڈ، (یہ اس وقت کی بات ہے جب معاشی، معاشرتی اور اخلاقی طور پر تھائی لینڈ پست تھا۔ اب تو معاشی حالت ہم سے کئی گنا بہتر ہے)، میں ریڑھی فروش سے انناس خریدا، اس نے سیلیفین کی تھیلی ہاتھوں پر چڑھا کر انناس کی پھانکیں کاٹ کر ایک کاغذ پر رکھیں اور ایک تنکا بھی ساتھ دیا کہ ہاتھ لگائے بغیر نوش کیا جاسکے۔ یہاں جس ہاتھ سے ناک چھنکتا ہے اس ہی سے کٹا تربوز پلیٹ میں ڈال کر دیتا ہے۔ تندور کی روٹیوں میں نان بائی کا پسینہ مفت شامل ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں کچرا سڑک کے بیچوں بیچ پھینکنے کا بھی رواج ہے۔ بس اپنے گھر سے ہاتھ نکالا اور کچرا پھینک دیا اس پر ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔ ایک پاکستانی مسلمان قسمت سے جنت میں چلا گیا۔ وہاں ایک دن فرشتے اسے مار رہے تھے۔ وجہ معلوم کی تو پتہ چلا اس نے دہی کھانے کی فرمائش کی تھی جو پوری کردی گئی۔ پوچھا تو مار کیوں رہے ہو۔ جواب ملا کہ دہی کھانے کے بعد اس نے بچا ہوا دہی، دودھ کی نہر میں

پھینکدیا ہے۔ مرغی ذبح کراتے ہوئے احتیاطاً ہم خود بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھ لیتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ گفتگو کرتے کرتے مرغی ذبح ہوجاتی ہے۔ پوچھنے پر بتایا کہ چھری پر پڑھ کر پھونک چکا ہوں۔ اب اس فتوے کے بعد ہمارا استحقاق تو یہ ہی بنتا ہے خود پڑھ لیں۔ بکرا کیونکہ ہمارے سامنے نہیں ذبح ہوتا اس لیے مجبوری ہے۔ باتیں تو اور بہت ہیں لیکن ان چند ایک مثالوں کے بعد ایک اور بتانا ضروری ہے۔ وہ ہیں ہماری قوم کے ایجاد کردہ نعرے۔ ہڑتالیں ہوں، جلسے جلوس ہوں یا الیکشن! عجیب وغریب نعرے وجود میں آتے ہیں۔ اگر کوئی ہمت کرے اور ان نعروں کو جمع کرلے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ انتخابات میں پارٹیوں کے منشور تک نعروں میں ڈھل جاتے ہیں۔ ردیف اور قافیہ تک تنگ نہیں ہوتا، وزن کی کوئی قید نہیں کیونکہ اب تو آزاد شاعری کا زمانہ ہے۔ اگر آزاد نظمیں ہوسکتی ہیں تو آزاد اشعار میں کیا حرج۔ یہ اشعار اور نعرے اپنے امیدوار کے حق میں بھی ہوسکتے ہیں اور مخالف کی ہجو میں بھی۔ اکثر لوگ تو نعروں کی وجہ سے کامیابی حاصل کرلیتے ہیں۔ پچھلے الیکشن میں ہمارے ایک دوست اس لیے حصہ لے بیٹھے کہ ان کی برادری کافی بڑی ہے۔ اور برادری کے باہر جیسے شادی نہیں کرسکتے اس ہی طرح ووٹ بھی نہیں دے سکتے ورنہ حقہ پانی بند۔ ہمارے دوست کا نام ہے تو غلامِ احمد لیکن جیسا کہ ہم نے شروع میں بتایا کہ لوگ کہتے اور لکھتے غلام احمد ہی ہیں۔ مگر موصوف کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہ نہ غلامِ احمد کہلاتے ہیں نہ غلام احمد بلکہ گلو کہلاتے ہیں۔ اب موصوف کی فتح یقینی تھی تو یارلوگوں کو نئی سوجھی اور الیکشن میں جان ڈالنے کے لیے ایک نعرے کی فکر میں پڑ گئے۔ اب گلو میں کوئی ایسی بات تو تھی نہیں کہ نعرے کے طور پر استعمال کرتے، لے دے کہ ۹ بچے اور ایک بیگم کی موجودگی میں کوئی اور خوبی نہ تھی۔ امیدوار بھی آزاد تھے اس لیے روٹی کپڑا بھی کام نہیں آسکتا تھا۔ پیلی ٹیکسی اور موٹر وے بھی بے کار تھے۔ بہرکیف ایک منچلے کو خوب سوجھی اور ایک ایسا نعرہ دیدیا کہ اسکی گونج آج تک سنائی دیتی ہے۔ نعرہ تھا۔۔ ۹ بچے ایک لگائی۔۔ گلو بھائی گلو بھائی۔

۱۴ر جنوری ۲۰۱۰

احترام کرتا ہوں لیکن۔۔۔

قابلؔ اجمیری مرحوم نے شائد اپنے محبوب کے لیے کہا تھا۔ع۔

یہ بھی احباب کی نوازش ہے کس تکلف سے کام لیتے ہیں

احتراماً، سلام کرتا ہوں، انتقاماً، جواب دیتے ہیں

ہم نے 'شائد' اس لیے کہا کہ اگر احباب سے مراد، مرد حضرات ہوتی تو یہ شکائت بھی نہ ہوتی۔ ہاں کسی خاتون سے یہ شکائت ہوسکتی ہے، اس لیے کہ خواتین سے معاملات میں آدمی خاص طور پر شاعر کچھ زیادہ ہی حساس ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ پھول کی چوٹ بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے اور بلبلا کر چیخ اٹھتا ہے۔ع

سہتے سہتے ستم، زمانے کے، پیکر یاس ہوگئے ہیں ہم

پھول مارو تو چوٹ لگتی ہے اتنے حساس ہوگئے ہیں ہم

ہمارے نزدیک قابلؔ کی شکایت جائز نہیں۔ اس کے زمانے میں خواتین کافی حد تک اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا تھیں۔ حکم ہے غیر محرموں کے سلام کا جواب بھی روکھے انداز میں دینا چاہیے تاکہ کوئی کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا ہوجائے۔ اب ظاہر ہے محبوب کے لیے قابلؔ غیر محرم ہی رہے ہونگے، کیونکہ کزنز (cousins) بھی غیر محرم ہی ہوتے ہیں۔ اب شاعر نازک مزاج اور حساس ہونے کے علاوہ شائستہ بھی ہوتے ہیں اس لیے اغلب ہے کہ قابلؔ نے تو احتراماً ہی سلام کیا ہوگا اور وہ بھی لہک کر!! جب احترام سے سلام کیا جاتا ہے تو یہ ہی امید کی جاتی ہے کہ جواب بھی گرم جوشی سے آئے۔ قابلؔ کے پیشِ نظر یہ حکم رہا ہوگا کہ اگر کوئی سلام میں پہل کرے تو جواب میں زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کیا جائے۔ قابلؔ کو خیال نہیں رہا، یہ حکم مردوں کے لیے ہے خواتین کے لیے نہیں اور خاتون نے بجا طور پر روکھے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیکر قابلؔ کو شکائت کا موقع فراہم کردیا جو ہم لوگوں تک ایک بہترین شعر پہنچانے کا ذریعہ بن گیا۔

یہ تو ہوئی شاعری، نازک مزاجی اور احساس کی بات ورنہ عام زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے کے رویہ کا انتظار کیوں کیا جائے۔ خود ہی احترام کا دعویٰ کرے۔ اور خود ہی دشنام طرازی سے کام لیتے ہوئے ساری کارروائی انتقاماً ہی نمٹا دے۔ احترام اور عزت کرنے کی نوید کے بعد 'لیکن' کسی بم سے کم نہیں ہوتا۔ قابل احترام و عزت ٹھہرایا جانے والا بے چارہ کسی جواب دینے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ یہ طریقہ رائج الوقت ہے کہ اس میں سارے سیاستداں بالعموم اور برسرِ اقتدار طبقہ بالخصوص ید طولیٰ رکھتا ہے۔ تقریباً روزانہ ہی کسی نہ کسی ٹاک شو میں یہ سننے کو ملتا ہے۔ 'میں ان صاحب کا احترام کرتا ہوں لیکن۔۔۔'، یا۔ 'یہ میرے بھائی ہیں میں ان کی عزت کرتا ہوں لیکن۔۔'، یا۔ 'میں اپنے بھائی سے متفق ہو لیکن۔۔'، پھر اس لیکن کے بعد جو جو پھول جھڑتے ہیں وہ اس قابلِ احترام شخص کی مٹی پلید کرانے کے لیے کافی ہے۔ یہاں تک تو سہا جاتا رہا اور ہمیں کچھ لکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی لیکن این۔ آر۔ او، (N.R.O) پر عدالتی فیصلے کے بعد تو ایسی ایسی باتیں احترام کی آڑ میں کی جارہی ہیں کہ خواہش ہورہی ہے کہ کاش ان سب کے بیانات کی روشنی میں ان سب کو احتراماً سلاخوں کے پیچھے کردیا جائے۔ غور فرمائیے چند ایک نمونے :۔

☆ ہم عدلیہ کا احترام کرتے ہیں لیکن اداروں کو اپنی حدود میں رہنا چاہیے۔۔۔ ایک سیاستداں (حدود کا تعین بھی فرمادیتے تو اچھا ہوتا)

☆ عدلیہ کا احترام کرتے ہیں تمام ادارے اپنی حدود میں رہیں۔۔۔ وفاقی وزیر ریلوے (کاش ٹرینز "Trains" کو بھی حدود میں رکھتے تاکہ بار بار پٹریوں سے باہر نہ نکلتی)

☆ موجودہ آئین قابل احترام نہیں۔ پارلیمنٹ بالا تر ہے۔ سینیٹر حاجی عدیل (عدیل صاحب کہنے کی کیا ضرورت؟ پارلیمنٹ کی برتری کا مظاہرہ تو ہالبروک کے روبرو ہوچکا۔ جب ہالبروک نے ہمارے ارکان پارلیمنٹ کو ہمارے اپنے ملک میں اس طرح ڈانٹ پلادی کہ بے چاروں کا استحقاق بھی مجروح نہیں ہوا)۔

ایک سیاستدان جنہیں مولانا کہلوانے کا بھی شوق ہے فرماتے ہیں کہ وہ حکومت پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ بجائے جی ایچ کیو کے پارلیمنٹ سے رہنمائی لی جائے۔ ایک نجی ٹی وی کے مطابق موصوف نے یہ بھی بتایا ہے کہ آزاد عدلیہ کا مطلب بے لگام عدلیہ نہیں۔ ویسے عوام کے مطابق ایسے بیان بازوں کی زبان کو لگام دینا

ضروری ہے جنہیں یہ نہیں پتہ کہ عدلیہ اور افواج کے بارے میں الفاظ کا استعمال سوچ سمجھ کے کرنا چاہیے۔لیکن ہم تو یہ ہی کہہ سکتے ہیں ع۔

'ایسے لوگوں کا کیا گلہ کیجئے، جن کی نیت کا اعتبار نہیں'۔

اور ہم یہ اس لیے کہہ رہے کہ یہ تو عدلیہ ہے موصوف تو قران کی آیات کے منافی بھی کہہ چکے ہیں کہ 'وعدے اہم نہیں ہوتے'۔بس' بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ' والی کیفیت ہے۔شائد اس ہی لیے اب تک کنٹیمپٹ آف کورٹ (contempt of court) کی خبر نہیں آئی۔

۲۲ر جنوری ۲۰۱۰ء

مولانا فرزانہ

پنجاب اسمبلی میں خواتین کے مسائل پر گفتگو نے نئے مسائل پیدا کر دیے۔نتیجتاً ایک خاتون ممبر ثمینہ خاور کو کفِ افسوس ملنے کا موقعہ مِل گیا کہ پڑھی لکھی خواتین کو عائلی قانون کے بارے میں علم ہی نہیں ۔یہ کوئی ایسی بڑی بات ہی نہیں جس پر افسوس کیا جائے۔یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے ہم , یونیورسٹی طلباء یونین میں جائنٹ سیکریٹری تھے۔دور ایوبی تھا جس میں ایک آرڈیننس نافظ ہوا جس کا نامِ نامی ''یونیورسٹی آرڈیننس'' تھا۔نہ جانے کیسے،لیکن معلوم ہوا کہ طالب علموں میں اس آرڈیننس سے بے چینی پھیل رہی ہے۔یہ جان کر ہم ہی نہیں دیگر طالب علم لیڈران بھی بے چین ہو کر سڑکوں پر نکل آئے ۔اب روزانہ ہی جلسے جلوس ہونے لگے۔گرفتاریاں بھی ہوئیں ، لاٹھی چارج بھی ہوئے۔سنا تھا کہ ڈھاکہ مشرقی پاکستان میں کچھ شہادتیں بھی ہوئیں (واللہ اعلم)۔معاملے کی سنجیدگی کا یہ عالم تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کے صدر نے تمام طلبا انجمنوں کو، اس سلسلے میں ایک کنونشن منعقد کرنے کے لیئے مدعو کرلیا۔حکومت نے بھی جان توڑ کوششیں شروع کر دیں کہ کنونشن نہ ہو پائے۔ہم کسی نہ کسی طور لاہور پہنچے لیکن پنجاب یونیورسٹی کے ڈین (Dean) اور یونین کے جنرل سیکریٹری (جو کہ بنگالی تھا) نے بتایا کہ کوئی کنونشن ونیشن نہیں ہو رہا اور یونین کے صدر نے جن کا تعلق اتفاق سے اسلامی جمعیت سے تھا، یہ کنونشن جمعیت کی طرف سے بلایا ہے نہ کہ پنجاب یونیورسٹی کے صدر کی حیثیت سے۔اب اس واقعہ کا آج کے موضوع سے تعلق نہیں اس لیئے اس تفصیل کو، کہ کیسے ہم نے کنونشن تک رسائی حاصل کی، کسی اور وقت کے لیئے اٹھا رکھتے ہیں۔ہم صرف اتنا بتانا چاہیں گے۔کنونشن ہوا، دھواں دار تقاریر ہوئیں۔قراردادیں پاس ہوئیں۔لیکن ہمیں آج تک نہیں معلوم ہوا کہ یہ آرڈیننس تھا کیا؟ یہ تو کچھ بھی نہیں کہ طالب علمی کا زمانہ تھا۔بات تو یہ ہے کہ 90% سیاسی جماعتوں کو پتہ نہیں کہ کالا باغ ڈیم ہے کیا اور اس سے کس صوبے کو فائدہ پہنچے گا اور کس کو نقصان۔لیکن ہر کوئی اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہے۔ٹیکنکل حضرات، انجینئر اور غیر سیاسی لوگ جانتے ہیں کہ اس سے کسی کو نقصان نہیں ہوگا۔لیکن بن گیا تو صوبائی سطح پر سیاست

کرنے والوں کی دال روٹی کا کیا ہوگا؟

ان دومثالوں کے تناظر میں دیکھئے تو محترمہ ثمینہ خاور کا افسوس کرنا بے وجہ لگتا ہے۔ان دومثالوں میں یونیورسٹی لیول کے طلبا لیڈرز کی لاعلمی کے علاوہ سیاستدانوں کی گمراہی کی نشاندہی کردی گئی ہے تو تعلیم یافتہ خواتین پر افسوس بے کار ہی ہوا۔انہیں یہ بھی گلہ ہے کہ اسمبلی میں دوسری شادی کا مذاق اڑایا گیا۔شاید محترمہ کے ذہن میں اسلام کے احکامات تھے یا پھر ہوسکتا ہے ان کی بھی ہماری بیگم کی طرح کسی ایسی عرب خاتون سے ملاقات ہوگئی ہو جس نے بڑی رازداری سے ہماری بیگم سے پوچھا تھا کہ کیا تمہارا شوہر ''مسکین'' ہے جواب تک دوسری شادی نہیں کی؟ اسکے بعد ہم نے اپنی مسکینی دور کرنے کی خواہش کے باوجود مسکین ہی رہنا پسند کیا کیونکہ ہمیں لیبیا نہیں، پاکستان میں رہنا تھا۔

اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے محترمہ ثمینہ نے فلور آف داہاؤس اپنے شوہر کو دوسری شادی کا عندیہ بھی دیدیا۔ یہاں ایک بات اور بھی ثابت ہوتی ہے، ثمینہ خاور حیات کو اپنے شوہر سے بہت محبت ہے اس لیئے اپنے نام کے ساتھ خاور حیات لکھتی ہیں (ہمیں یقین ہے یہ ان کے شوہر کا ہی نام ہے)۔جبکہ دوسری ممبر اسمبلی محترمہ فرح دیبا جو اس قسم کا لاحقہ نہیں رکھتی، فرماتی ہیں کہ ثمینہ کی اس بات سے کچھ نوجوانوں کی بتیسی باہر آ گئی ہے (خدا جانے کیسے؟ ہم نے تو یہ سنا ہے کہ گھونسہ مارنے سے بتیسی باہر ہوجاتی ہے۔ہوسکتا ہے ان کی بیویوں نے ایسا کوئی قدم اٹھایا ہو)۔بہرحال ممبرانِ اسمبلی کی اس نوک جھونک سے فلور پر زیر بحث آنے والا یہ ایشو ٹی وی کے ایک شو میں آ گیا اور اینکر پرسن نے بیلنس قائم رکھنے کے لیے ایک مفتی جناب قوی صاحب اور ایک سماجی کارکن محترمہ فرزانہ باری صاحبہ کو دعوت فکر دیکر پاکستانیوں کے دل جیت لیئے۔مفتی صاحب نے تو ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہیں کیا کیونکہ وہ وہی پرانی بات کررہے تھے کہ اسلام نے بے راہ روی سے بچنے کے لیئے چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔جبکہ محترمہ فرزانہ نے ہمارے علم میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ اسلام اور قرآن کی روشنی میں یہ بھی بتایا کہ وہ چار شادیوں کی بات نہیں مانتیں کیونکہ اسلام میں مردوں کو چار شادیوں کی اجازت نہیں۔انہوں نے یہ بھی استدلال پیش کیا کہ اسلام تو غلام رکھنے کی بھی اجازت دیتا ہے اور یہ سوال کرکے سب کو لاجواب کردیا کہ کیا اس دور میں غلامی کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ اس طرح محترمہ نے ثابت کردیا کہ

اسلام کے احکامات آج کے دور سے مطابقت نہیں رکھتے۔محترمہ کے علم و فراست وتدبر اور قرآن پر ان کی سوجھ بوجھ دیکھتے ہوئے ہمیں اپنی کم علمی پر شدت سے رونا آیا کہ ہمیں علم ہی نہیں تھا کہ اسلام غلام بنانے کی اجازت دیتا ہے۔محترمہ کی مذہب پر گرفت کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ انہوں نے غلام رکھنے کی اجازت حضورﷺ کے آخری خطبے سے ثابت کی ہے۔انہوں نے انکشاف کیا کہ حضورﷺ نے غلاموں کے ساتھ نیک برتاؤ کی تلقین فرمائی تھی اب چونکہ نیک برتاؤ کی بات ہے تو ثابت ہوا کہ اسلام میں غلام رکھنے کی اجازت ہے۔ہم نے اسے محترمہ کا انکشاف اس لیئے کہا کہ ہم جیسے کم فہم کو آخری خطبے میں ایسی کوئی بات دکھائی ہی نہیں دی اور مزے کی بات یہ کہ اینکر پرسن نے بھی اس کی تائید یا تردید نہیں کی۔اس لیئے ثابت ہوا کہ محترمہ کا استدلال صحیح ہے کہ اسلام میں غلام رکھنے کی اجازت کے باوجود اس دور میں غلام نہیں رکھے جاسکتے اس ہی طرح چار شادی کی اجازت کے باوجود چار شادیاں نہیں کی جاسکتیں۔سبحان اللہ۔ہم تو محترمہ کو فقط سماجی کارکن سمجھتے تھے لیکن قرآن کی جس طرح تشریح انہوں کی اور جس طرح آخری خطبے سے وہ بات نکالی جو ہم جیسوں کو دکھائی ہی نہیں دی۔اس سے تو یہ ثابت ہوگیا کہ وہ بھی مولانا کہلوانے کی حقدار ہیں۔اب یہ اردو ٹیکسٹ بک بورڈ کا کام ہے کہ بتائے محترمہ کے لیئے 'مولانا' صحیح ہوگا یا 'مولانی' کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق لفظ ''ملانی'' تو پیش امام یا موذن کی بیوی کو کہتے ہیں۔اب جب تک یہ طے نہیں پاجاتا ہم سمجھتے ہیں ہمیں محترمہ کو مولانا فرزانہ ہی کہنا چاہیے۔جس طرح مولانا فرزانہ نے اسلام کی تشریح کی ہے ویسی تو اکبرالہ آبادی کے دور کی مس صاحبہ نے بھی نہیں کی تھی جس کے لیے اکبر نے کہا تھا۔ع

وہ ریش دکھا کر بولے 'اسلام' کو دیکھو
مس زلف دکھا کر بولیں اس 'ل' کو دیکھو

۲۱ر فروری ۲۰۱۰ء

فوڈ فور تھوٹ (Food for thought)

کہتے ہیں سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ پھر بھی غور کرنے میں کیا حرج۔ دیکھتے ہیں کیا واقعی سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔

۱۔ ابن انشا نے لکھا تھا کہ شہنشاہ اورنگزیب نے کبھی کوئی نماز نہیں چھوڑی نہ کوئی بھائی چھوڑا۔ واقعی دین دار بادشاہ تھا، اتنا کہ ہماری دانست میں واحد بادشاہ تھا جس کے نام کے ساتھ رحمت اللہ علیہ اہتمام کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے اپنے سب بھائیوں کو قتل کروادیا تھا اور باپ کو زنداں میں ڈالدیا تھا اور بے چارے کی سیاہ سنگِ مرمر کا محل بنوانے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔

۲۔ جولیس سیزر کو قتل کرنے میں اسکے عزیز ترین دوست نے بھرپور حصہ لیا تھا اور سیزر بیچارے کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس کا دوست ایسا کرسکتا ہے اس ہی لیئے اس کے مونہہ سے صرف اتنا ہی نکل سکا تھا " et tu -"Brutus!! (بروٹس تم بھی!!)۔

۳ نواب سراج الدولہ بھی حیرت زدہ رہ گئے تھے جب انہوں نے دیکھا تھا کہ ان کی پیٹھ میں خنجر مارنے والا کوئی اور نہیں انکا اپنا خادمِ خاص تھا۔ وہ بھی سیزر کی طرح ہکا بکا رہ گئے اور مرتے وقت صرف اتنا ہی کہہ سکے۔ ''محمد، تم بھی''۔

۴۔ شطرنج میں پیادوں کو پٹوایا جاتا تو ہے ہی لیکن بسا اوقات بادشاہ کو بچانے کے لیے سب سے قیمتی مہرہ، یعنی وزیر کو بھی خود ہی پٹوادیا جاتا ہے۔

۵۔ اکثر لوگ اپنے مخالفین کو پھنسوانے کے لیئے خود اپنے آپ کو زخمی کر لیتے ہیں اور ایف آئی آر کٹوادیتے ہیں اپنے کسی مخالف کے خلاف۔

شطرنج کے علاوہ سارے حوالے تاریخ سے لیئے ہیں تاکہ کسی کو کوئی شکوہ نہ رہے۔ ورنہ آج بھی اقتدار تو بڑی بات، معمولی جائداد کے لیے سگی ماں اور سگے باپ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ الیکشن میں مخالفین

پر حملہ یا قاتلانہ حملہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ نئی بات نہیں تو پھر یہ سب کچھ لکھنے کی کیا ضرورت؟ ضرورت ہے! کیونکہ ہم لوگ سب جانتے ہیں لیکن غور نہیں کرتے۔ دماغ پر زور نہیں ڈالتے۔ ماضی سے سبق نہیں لیتے۔ تجزیہ نہیں کرتے۔ کسی بات کو ماضی حال اور مستقبل کے تناظر میں نہیں پرکھتے۔ غور نہیں کرتے فیصلہ سنادیتے ہیں۔ فوراً نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ اس لیے ایک سیاستداں (شیخ رشید) پر مبینہ حملے کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ 'سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا' چند مثالیں پیش کردی ہیں جو تجزیے کے دوران ذہن میں رہیں تو اچھا ہے۔

اس امیدوار نے حملے کے فوراً بعد اپنے سب سے مضبوط مخالف پر الزام رکھدیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے

☆ کیا مخالف اتنا بونگا تھا کہ اسے یہ نہیں معلوم الزام اس ہی کہ سر آئے گا اور ووٹروں کی ہمدردیاں متاثرہ امیدوار کے ساتھ ہو جائیں گی یا اتنا چالاک کہ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ عوام تو یہ ہی سمجھیں گے کہ 'اپنے پر الزام آنے کے خوف سے میں ایسا کر ہی نہیں سکتا'۔

☆ کیا امیدوار نے خود اپنے اوپر حملہ کروایا تاکہ ہمدردیاں حاصل کر سکے۔ سوال پیدا ہوگا کہ ایسا کر کے وہ اپنے ساتھی کیوں گنوائے گا۔ (اس سوال کے جواب میں سیاست کے سینے میں جھانکنا پڑے گا۔ (مندجہ بالا مثالوں سے استفادہ کیجیے)۔ دوست اور محافظ ماں باپ یا بہن بھائی سے زیادہ عزیز تو نہیں ہوتے۔ شطرنج کی مثال بھی ذہن میں رہے تو اچھا ہے۔ اب سوچ کا دائرہ کچھ اور وسیع کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ اس واقعہ سے ہر دو صورتوں (یعنی کامیاب یا ناکام حملے) میں

☆ فائدہ کس کس کو پہنچ سکتا ہے

☆ کیا اس چھوٹے سے واقعے سے کوئی بہت بڑا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔

☆ کیا اس واقعے کی بدولت کسی اہم چیز کی طرف سے توجہ ہٹانا تو مقصود نہیں

☆ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ اس میں کسی ایسے کا ہاتھ ہو جس کا کوئی تعلق ان امیدواروں سے بنتا ہی نہ ہو۔

☆ کیا اس میں وہ بیرونی ہاتھ تو نہیں، جو نام بدل بدل کر سیکیورٹی فراہم کرتا ہے۔ جس کی موجودگی بھی ظاہر کرنے سے ارباب اقتدار کو غش آتا ہے، ہم سب کو تحمل سے کام لیتے ہوئے ایک دوسرے پر الزام لگانے کی

بجائے اپنے اریب قریب کے لوگوں کے ساتھ مل کر اصل دشمن کو تلاش کرنا چاہیے۔غور کرنے کے لیئے تو یہ بھی ہے کہ لیاقت علی خان تو اسٹیج پر نشانہ بن جاتے ہیں۔بی بی بھری پری سڑک پر ہزاروں کی موجودگی میں نشانہ بن جاتی ہیں لیکن پرویز مشرف پر منظّم حملے میں وہ محفوظ رہتا ہے اور شائد دو چار اردگرد والے نشانہ بنتے ہیں۔ شوکت عزیز محفوظ!! شائد ڈرائیور یا کوئی اور اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔امیر مقام جیسے غیر اہم وزیر پر خودکش حملے کے نتیجے میں بھی صرف دو تین پولس والے ہی کام آتے ہیں۔بے چارے خودکش کے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ وزیر کے باہر آنے کا انتظار ہی کر لیتا۔جان پر کھیلنے نکلا اور ناداں چند سپاہیوں پر قناعت کر گیا۔شیخ رشید پر جان لیوا حملہ کرنے والے اپنی جان داؤ پر لگا کر نکلے لیکن اتنے بُودے تھے کہ شیخ کے دھوکے میں کسی اور پر گولیاں برسا گئے۔اس سے ایک اور بات بھی صاف ہوتی ہے کہ ایسی ناکام پلاننگ کرنے والے '9/11' جیسی کامیاب پلاننگ میں کیسے ملوث ہو سکتے ہیں۔آخری بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جان بوجھ کر ناکام پلاننگ کی گئی ہو تا کہ سی۔آئی۔اے پر کسی کو شک ہی نہ ہو کہ وہ تو ۹/۱۱ جیسی کامیاب پلاننگ کرتے ہیں اور اپنے مقصد کے لیے اپنے ہی ہزاروں شہریوں کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے ہماری قوم کے پاس سوچنے کے لیے وقت نہیں۔دوسری قوموں نے تھنک ٹینک بنا لیے ہیں ہم باتیں بنانے کے لیے ٹاک شوز کرتے ہیں۔۶۵ کی جنگ کے بعد بھارتیوں نے ہمیں شکست دینے کے لیے سوچنا شروع کر دیا اور چھ سال بعد کامیاب ہو گئے ۔ہم اس دوران دس سالہ جشن مناتے رہے دشمن نے اس دوران عصبیت کا بیج بو دیا اور نتیجہ سب نے دیکھ لیا۔آج بھی کوئی گہرائی سے تجزیہ نہیں کر رہا۔ہر ایک کی سوچ سطحی ہے۔چلیے ہم نے اردو میں دعوت فکر دیدی اور انگریزی میں فوڈ فور تھوٹ پیش کر دیا، وما علینا اِلا البلاغ المُبِینُ

۱۰/فروری ۲۰۱۰

پیمانہ

ہمارے ذاتی غموں میں ایک یہ بھی ہے کہ کوئی ہماری نہیں سنتا۔اس لیے خواہش ہوتی ہے کہ کاش ہم بھی کسی اعلیٰ منصب پر فائز ہوتے۔بادشاہ ہوتے تو اور بھی اچھا تھا۔اب آپ خود غور فرمایئے شہنشاہ اکبر ننگے پیر حضرت سلیم چشتیؒ کے دربار میں گیا تو واقعہ تاریخ میں رقم ہوا۔فلموں میں ننگے پاؤں چلتے ہوئے دکھایا۔جبکہ ہم خود کئی بار مسجد سے ننگے پیروں واپس آئے لیکن کسی نے توجہ نہ دی۔ہاں مسجد سے روانگی پر ایک دو نے اظہار افسوس ضرور کیا۔بادشاہ ننگے پیروں گیا تھا واپس نہیں آیا تھا۔ہمیں یقین ہے کہ کبھی ہم نے مسجد ننگے پیروں جانے کی جسارت کی تو لوگ سمجھیں گے جوتی چرانے آیا ہے۔شہنشاہ اکبر کو یہ خوف نہیں تھا پھر بھی وہ کبھی ننگے پاؤں مسجد نہیں گیا۔اگر جاتا تو بھی تاریخ میں جگہ نہ بنا پاتا۔

اب شہنشاہ اور مسجد کا ذکر آ گیا ہے تو ذہن میں یہ سوال اٹھ رہا ہے کہ کیا بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کسی نے حج بھی کیا تھا یا نہیں۔اگر کیا ہوتا تو کسی نہ کسی فلم میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا۔جیسے اکبر کا ننگے پاؤں چلنا۔شہنشاہ عالمگیر تو دیندار تھا اسنے حج تو ضرور کیا ہوگا لیکن کہیں پڑھا نہیں۔یہ بات تو خواہمخواہ نکل آئی ورنہ بات تو ہمارے غم کی تھی کہ کوئی ہمیں درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔

ایک بار ہم نے اپنی قابلیت جتانے کے لیے چند دوستوں سے پوچھا ''بتا سکتے ہو کتنے وزن کو ایک پاؤنڈ کے برابر سمجھا جاتا ہے اور کتنی لمبی چیز کو ایک فُٹ سمجھا جاتا ہے''۔اتفاق دیکھیے کسی کو علم نہیں تھا لیکن بجائے اپنی لا علمی کا اعتراف کرنے کہ مذاق پر اتر آئے۔کہنے لگے ''بھئی ایک پاؤنڈ ایک پاؤنڈ کے اور ایک فٹ ایک فٹ کے برابر ہی ہوگا۔اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے''۔ہم نے وضاحت کی کہ ہماری مراد اس پیمانے سے ہے جس سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ایک صاحب نے کہا بھئی ہمیں تو نہیں معلوم اگر تمہیں علم ہے تو بتا دو۔

ہم نے فوراً اپنی قابلیت جھاڑنے کے لیے بتا دیا کہ برٹش میوزیم میں ایک پلاٹینم کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔اس ٹکڑے

کے وزن کے برابر وزن کو ایک پاؤنڈ کہتے ہیں اور اس ہی طرح پلاٹیم کے ایک لمبے ٹکڑے کے برابر لمبائی کو ایک فٹ کہا جاتا ہے۔ سن کر کسی نے بھی ہماری تعریف نہیں کی۔ اس وقت ذہن میں یہ ہی آیا کہ اگر وزیر مشیر ہوتے تو خوب خوب تعریف ہوتی۔ دکھ تو ہوا تھا لیکن اس دکھ میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب پارٹی ترجمان محترمہ ارباب اقتدار نے مہنگائی ناپنے کا ایک پیمانہ بتلایا اور جسے ٹی وی والوں نے خوب اچھالا۔ بقول محترمہ اگر چینی مہنگی ہوتی تو مٹھائی کی دکانیں بند ہو جاتیں۔ یہ بھی پوچھا 'کیا کوئی دکان بند ہوئی'۔ اب چونکہ ایک بھی مٹھائی کی دکان پر تالے نہیں پڑے تو ثابت ہوا ملک میں نہ چینی کی قلت ہے نہ وہ مہنگے داموں فروخت ہو رہی ہے۔ اب ہمیں یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ پاؤنڈ اور فٹ کا پیمانہ تو پلاٹینم کی صورت میں برٹش میوزیم میں محفوظ کر دیا گیا ہے لیکن مہنگائی کے اس پیمانے کو کس طرح محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ ایسا ہی ایک پیمانہ غربت ناپنے کے لیئے پرویز مشرف نے بتایا تھا لیکن وہ پیمانہ بھی محفوظ نہ کیا جا سکا۔ مشرف کا کہنا تھا کہ ملک میں موٹر سائیکلوں کے کارخانے بند نہیں ہوئے تو ثابت ہوا ملک میں غربت نہیں ہے۔ اب تنزانیہ اور چاڈ جیسے ممالک کو چاہیے کہ غربت ختم کرنے کے لیے آئی۔ ایم۔ ایف سے قرضے لیکر موٹر سائیکلوں کے کارخانے لگوالیں انشا اللہ وہاں بھی غربت ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ اللہ توفیق دے تو ہمارے ایک اور ڈکٹیٹر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دس سالہ ترقی کا جشن بھی منائیں تا کہ ان کے حکمرانوں کی تصاویر بھی ٹرکوں کی زینت بن سکیں اور قوم قرضے اتارتے ہوئے کہے 'تیرے جانے کے بعد تیری یاد آئی'

محترمہ ارباب اقتدار کے دیئے ہوئے پیمانے کے ذکر سے ہمیں محترمہ کے مختلف ٹاک شوز میں دیئے جانے والے دیگر پر مغز بیانات بھی یاد آ رہے ہیں جن کی بدولت ہماری بچپن کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اب سب کا ذکر تو ممکن نہیں لیکن ایک دو سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہ جانے کیوں ہمیں ان کے بیانات یا فرینڈلی اپوزیشن پر لگائے گئے الزامات سے بچپن میں پڑھی ہوئی وہ کہانی یاد آ جاتی ہے جس میں ایک بھیڑیا بھیڑ کے بچے پر الزام لگاتا ہے کہ تو نے پچھلے سال مجھے گالی دی تھی۔ بیچارہ میمنہ مفاہمت کے چکر میں صرف یہ ہی کہہ پاتا ہے کہ جناب میری تو عمر ہی چھ ماہ کی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے بچپن کے وہ دوست بھی یاد آ جاتے جو آپس کے جھگڑوں میں اپنے مخالفین کے زبانی حملوں سے لاجواب ہونے پر یہ ہی کہتے رہ جاتے

تھے کہ ''تو خود جھوٹا، تیرا باپ جھوٹا'' یا ''تو نے بھی تو پہلے ایسا ہی کیا تھا۔ اب میری باری آئی تو اترا رہا ہے'۔ یا ''میری بیٹنگ آئی تو بھاگ رہا ہے۔ دام دیکر جا''۔ ''ہمیشہ ہماری باری پر تجھے کام یاد آ جاتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ ان بچپن کے دوستوں کو یاد کروانے کا سہرا فقط محترمہ کی فراہم کردہ اطلاعات کے ہی سر نہیں بلکہ دیگر صاحب اطلاعات کے سر بھی ہے۔ ایسے ہی ایک صاحب اطلاعات کے بموجب اگر سوئس بینکوں کا ذکر ہو گا تو پھر دوسروں کے کیس بھی کھلیں گے۔ دیکھا! ہوئی نہ بچوں والی بات کہ ''تو نے بھی تو کیا تھا''۔ اب اس 'بھی' سے یہ اقرار تو ہو جاتا ہے کہ ہم نے تو کیا ہے لیکن تو نے بھی تو کیا تھا۔ نادان نادانستگی میں کہہ رہے ہیں کہ 'ہاں یہ الزامات درست ہیں مگر تم نے بھی تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے'۔۔۔ اس ہی لیئے تو کہتے ہیں نادان دوست سے دانا دشمن بہتر!!!

۱۱ر فروری ۲۰۱۰

ہیومن رائٹس

ہمیں، ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی ایک کرتا دھرتا سے ہمدردی ہے کیونکہ محترمہ کو خدشات گھیرے رہتے ہیں۔انہیں آج یہ خدشہ ہے کہ ملک اب عدالتی آمریت کی جانب بڑھ رہا ہے۔بقول ان کے اب فوجی مارشل لا تو آ نہیں سکتا لیکن فوج آج بھی پس پردہ طاقتور ہے۔انہوں نے میٹ دی پریس میں کئی خدشات کا ذکر تو کیا لیکن وجہ ایک کی بھی نہیں بتائی یا ہوسکتا ہے اخبار نے رپورٹ نہیں کی۔انہوں نے نئی شیروانیوں اور اچکنوں کے بننے کی اطلاع بھی دی لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ بریکنگ نیوز انہیں درزیوں سے ملی یا کپڑے کے دکانداروں سے۔انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ملک پر برا وقت آ رہا ہے(گویا محترمہ کی دانست میں اس وقت اچھا وقت ہے)اور اس برے وقت کے آنے سے لوگ سیاسی آمریت کو بھول جائیں گے۔اب یہ علیحدہ بحث ہوگی کہ سیاسی آمریت اچھی چیز ہے یا بری!اگر سیاست آئین کی پابند ہے تو یہ ہوگی آئینی آمریت ورنہ یہ سیاسی آمریت نہیں ہوگی۔جیسے دورِ پرویزی میں ایک سیاسی جماعت اور ایک وزیراعظم کے ہوتے ہوئے بھی حکم آمر کا ہی چلتا تھا۔موصوفہ کے پورے بیان میں کوئی بات بھی واضع نہیں۔ہمارا خیال ہے یہ رپورٹر کی غلطی ہے کہ اس نے صحیح رپورٹنگ نہیں کی۔یا ہوسکتا ہے محترمہ ذہنی طور پر الجھی ہوئی ہوں۔ایک طرف ان کا کہنا ہے،فوجی آمریت کھلے عام نہیں آئے گی۔شاید وہ کہنا چاہتی ہوں کہ ڈھکے چھپے آئی گی کیوں کہ پس پردہ فوج طاقتور ہے۔اگر ایسا ہے تو پھر عدالتی آمریت کیونکر آئے گی (یہاں ہم پھر یہ ہی کہیں گے عدالتی آمریت تو اچھی ہوئی نا!۔حکمرانی قانون کی ہوگی اور عوام یہ ہی تو چاہتے ہیں)۔

اور پھر سیاسی آمریت کس چڑیا کا نام ہے جسے لوگ بھول جائیں گے۔وللہ عالم کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ایسے میں اچکن اور شیروانیاں کیوں سلوائی جارہی ہیں۔فوجی تو وردی پہنتے ہیں۔عدالتی اراکین بھی اب کوٹ ٹائی میں ہوتے ہیں۔عرصہ ہوا جج صاحبان نے شیروانی یا اچکن کا استعمال چھوڑ دیا ہے۔یہاں سوال اٹھتا ہے کہ ہیومن

رائیٹس کمیشن کو ان باتوں سے کیا مطلب؟ ہوسکتا ہے یہ این جی اوز (N.G.Os) آزاد عدلیہ سے خوفزدہ ہوں کیونکہ ہمارے خیال میں (جو غلط بھی ہوسکتا ہے) یہ سب امریکہ کے زیرِ سایہ پنپ رہی ہیں ورنہ کارکردگی کو کارِ ندارد کہہ سکتے ہیں۔اب امریکہ کی نظر میں کون ہیومن ہے اور کون نہیں۔یہ تو اس بیان کے تناظر میں دیکھنا ہوگا جس میں ایک امریکی جنرل نے بتایا تھا ڈرون حملوں میں ہلاک ہونے والے 700 میں سے صرف 14 مطلوبہ افراد تھے بقایا معصوم تھے۔اس بیان کے بعد ہیومن رائیٹس والے نہ سڑکوں پر آئے نہ کوئی بیان آیا۔پس ثابت ہوا کہ مرنے والے ہیومن نہیں تھے تو انکے حقوق کہاں ہونگے۔ہمارے ملک میں ایسی تمام 'فلاحی' تنظیمیں بھارتی قیدیوں کے حق میں آواز بلند ہی نہیں کرتیں بلکہ ان کو آزاد کرانے کے بعد ان کو بحفاظت تمام انکے ملک پہنچانے کا بھی انتظام کرتی ہیں۔ہم نے خود ٹی وی پر دیکھا تھا کہ جناب انصار برنی ایک بھارتی قیدی کے وارے صدقے جارہے تھے۔ان تنظیموں کو ڈاکٹر عافیہ دکھائی نہیں دیتی۔ہوسکتا ہے کبھی اس کے لیئے آواز اٹھائی بھی ہو تو بہت ہی غیر محسوس انداز میں کہ کہیں امریکہ ناراض نہ ہوجائے۔یہ پاکستانی جیلوں میں قید مجرموں کے حقوق کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ ان کو جیل مینیول کے مطابق مراعات حاصل ہیں یا نہیں۔انہیں اس کی فکر نہیں کہ بھارتی جیل میں بند بیگناہ پاکستانیوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے کہ اکثر بے چارے مردہ حالت میں ہی واپس آتے ہیں۔انہیں جیل کے باہر پاکستانیوں کے حقوق کی بھی کبھی پرواہ نہیں ہوئی۔ اسلام اور پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے مختاراں مائی کو تو سڑکوں پر اس طرح لاتے ہیں جیسے اس قسم کے واقعات صرف پاکستان میں ہی رونما ہوتے ہیں۔ڈاکٹر عافیہ کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں انہیں نظر نہیں آتیں۔انہیں واہگہ بارڈر پر دیئے جلانے کا شوق بھی ہے اور بھارت سے اچھے تعلق کی خواہش بھی۔انہیں کشمیریوں کے حقوق بھی دکھائی نہیں دیتے شاید کشمیری بھی ہیومن ہونے کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ہمیں تو لگتا ہے یہ سب امریکی ایجنڈے کے ماتحت ہیں۔جب عدلیہ کی بحالی میں امریکیوں کو اپنا مفاد نظر آرہا تھا تو یہ تنظیمیں فعال تھیں۔اب جب امریکیوں کو آزاد عدلیہ سے خوف آرہا ہے تو محترمہ عدالتوں کو متنازعہ بنانے کی آرزومند ہیں۔جب سے عدالت میں N.R.O کا بکس کھلا ہے۔محترمہ عجیب وغریب بیانات دے رہی ہیں۔ناسمجھ آنے والے بیانات سے پتہ ہی نہیں چل رہا کہ کہنا کیا چاہ رہی ہیں۔ہمارا خیال ہے کہ معاملہ

کومپلیکیٹڈ (coplicated) ہوگیا ہے۔ وہ اس طرح کہ این۔آر۔او۔تو امریکہ اور مشرف کا ناجائز آرڈننس تھا۔ جب کہ ہر پاکستانی سوائے ان کے جنہیں اس سے فائدہ ہوسکتا ہے اس کا مخالف ہے۔ ایسے میں امریکہ کے لے پالکوں کے لیے ایک مصیبت کھڑی ہوگئی ہے یعنی سانپ کے مونہہ میں چھچھوندر۔۔طرفداری کریں یا مخالفت۔۔جب عقل کام نہ کرے تو بیانات میں 'عدالتی آمریت۔پس پردہ فوجی طاقت۔سیاسی آمریت' جیسے الفاظ کا درآنا تعجب انگیز نہیں۔شیروانیوں کا ذکر بھی شائد تڑکے کے طور پر لگایا گیا ہے۔

۲۰ر فروری ۲۰۱۰

پریزیڈنٹ اور پری سی ڈنٹ

بظاہر پریزیڈنٹ (President) اور پری سی ڈنٹ (precedent) ایک جیسے لگتے ہیں لیکن معنوں میں بہت فرق ہے اس کے علاوہ تلفظ میں بھی واضع فرق ہے جسے ادا کرنے میں لوگ عموماً غلطی کر جاتے ہیں۔اس لیے ہم نے اردو میں اس طرح لکھا ہے فرق واضع ہوجائے۔ پریزیڈنٹ تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ سربراہ کو کہتے ہیں اور وہ اگر ملک کا سربراہ ہو تو اسے کئی چیزوں سے استثنیٰ بھی حاصل ہوجاتی ہے۔جبکہ پری سیڈنٹ کے معنی ہیں مثال، سند، روایت، رواج وغیرہ۔آپ سے گزارش ہے کہ پری سیڈنٹ کو آپ اپنے حافظے میں اس کالم کے ختم ہونے تک محفوظ کرلیں۔کیونکہ اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔فی الحال ہم ایک خبر کو دہرا رہے ہیں جو کل ہی ٹی وی پر نشر ہوئی اور اخبارات کی زینت بھی بنی۔

خبر ہے کہ کوئٹہ میں پریزیڈنٹ کے پروٹوکول کی وجہ سے ایک خاتون سے ۹ ماہ دس دن کے انتظار کے بعد مزید چند گھنٹوں کا انتظار نہ ہوسکا اور اس نے بچے کو رکشہ میں ہی جنم دے دیا۔اس خبر کے بعد بڑی لے دے ہوئی اور ایک کالم نویس تو اتنے چراغپا ہوئے کہ ٹی وی پر ارباب اقتدار کو بے نقط سنادی۔حالانکہ اس خبر کا ایک مثبت پہلو یہ بھی تھا کہ ایک غریب گھرانے کے نومولود کی خبر ٹی وی پر نشر اور اخبار میں شائع ہی نہیں ہوئی بلکہ بچے کی تصویر بھی چھپ گئی جو کہ عام حالات میں ناممکن تھا۔رکشہ میں ولادت کی وجہ سے ڈاکٹر یا دائی کے اخراجات سے اس کے شوہر کو استثنیٰ بھی مل گیا (یا مل گئی)۔

ہماری قوم جذباتی تو ہے ہی اور اسے سوچنے سمجھنے کی فرصت نہیں۔اس لیئے آئے دن یہ موضوع زیر بحث رہتا ہے کہ پروٹوکول کی وجہ سے ٹریفک جام ہوگیا اور ایک شخص ایمبولنس میں ہی اللہ کو پیارا ہوگیا۔ایک صاحب کی فلائٹ مس ہوگئی اور ایک شخص نوکری سے محروم رہ گیا۔لاکھوں کا ایندھن جل گیا۔لوگوں کی گاڑی کا پٹرول ختم ہو گیا۔سرکاری قافلے کے گذرنے کے بعد لوگوں کو گاڑیوں کو دھکا لگاتے دیکھا گیا وغیرہ وغیرہ۔کافی بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ ہر کوئی حکومت پر تنقید شروع کردیتا ہے۔کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اس قسم کے پروٹوکول کو روکنا

آسان ہے نہ حکومت کے اختیار میں ہے۔ یہ سیکیورٹی اور پروٹوکول بلیو بک (Blue Book) کے عین مطابق فراہم کیا جاتا ہے۔ اگر اسے ختم کرنا ہے تو بلو بک میں ترمیم کرنا پڑے گی اور یہ کسی ایگزیکٹیو آرڈر (executive order) سے نہیں ہوسکتی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ ترمیم کیوں نہیں کی جاتی۔ اس کا مجاز کون ہے۔ اس کا تو اللہ کو ہی پتہ ہوگا لیکن ہمارے خیال میں یہ مشکل اس لیے ہے کہ شاید بلو بک آئین سے زیادہ مقدس ہے۔ آئین میں تو آئے دن ترمیمات ہوتی رہتی ہیں اور اتنی ترامیم ہوچکی ہیں کہ اصل آئین کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ ہے کہاں؟ لیکن ایک عرصہ گذر گیا اس بلو بک میں ۱۷ یا اٹھارہ ترامیم تو درکنار ایک بھی ترمیم نہ ہوسکی۔ ایسا لگتا ہے کوئی یہ کرنا بھی نہیں چاہتا۔ بہرحال اس تازہ واقعے کے بعد یار لوگوں کو موقعہ مل گیا اور پروٹوکول اور سیکیورٹی کے خلاف غم و غصے کا برملا اظہار شروع ہوگیا۔ اس بار تو دو وجوہات تھیں ایک بچے کی پیدائش اور دوسرے اس واقعہ کا بلوچستان جیسے حساس علاقے میں ظہور پذیر ہونا۔ اب یہ بھی اتفاق ہے کہ اس ہی دن وزیراعظم کی وجہ سے کراچی میں بھی ٹریفک جام ہوا لیکن سب کی توجہ کوئٹہ پر ہی رہی۔ اب چونکہ ایسی کسی بھی جلتی پر پانی ڈالنے کا کام وزیراعظم نے اپنے سر لے رکھا ہے اس لیئے انہوں نے کراچی میں اپنے پروٹوکول کی صفائی میں تو کچھ نہیں کہا لیکن کوئیٹہ کے معاملے پر ایک موثر بیان دے دیا کہ بچے کی پیدائش تو ہوائی جہازوں میں بھی ہوجاتی ہے تو رکشہ میں ہونا کونسی انہونی ہے۔ بیچارے وزیراعظم اپنی سی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں کوئی معاملہ بگڑنے نہ پائے اس لیئے انہوں نے فوری نوٹس لیتے ہوئے بیان جاری کردیا جس سے امید ہے کہ لوگوں کا غم اور غصہ اگر ختم نہیں تو قدرے کم ہوجائے گا اور مخالفین کی زبان بند ہوجائے گی۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ مخالفت نہایت آسان ہے جبکہ مفاہمت اور درگذر میں بڑی صعوبتیں ہیں۔ ہمیں بھی یہ خدشہ ہے کہ لوگ کہیں اس بیان کو 'بچے تو جہاز پر بھی پیدا ہوتے ہیں' پریسیڈنٹ (مثال) نہ بنالیں۔ کہیں کوئی قتل ہو تو کہہ دیں کہ بھئی موت تو برحق ہے کسی طرح بھی آسکتی۔ یا چوری ہوجائے تو کہدیں گے کہ مال تو کہیں بھی کھویا جاسکتا ہے، چوری ہوگیا تو کیا ہوا۔ ہمارے اس کالم کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ عوام کو اب باور کرایا جائے کہ حکومت پر تنقید کرنے کی بجائے بہتر تو یہ ہوگا کہ بلو بک میں ترمیم کروائی جائے۔ پولس اور قانون نافظ کرنے والے دوسرے اداروں پر عوام کا غصہ بے وجہ ہوتا ہے۔ وہ بے چارے ہی تو ہیں جو بلو بک کے مطابق اپنی ذمہ داری

پوری کرتے ہیں ورنہ یہاں تو حکومت بھی آئین کے مطابق نہیں چلائی جاتیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جس طرح بلو بک پر عمل ہوتا ہے، اس ہی طرح آئین پر عمل ہو تو ہماری مشکلات ختم ہوجائیں گی۔۔

۲۶ فروری ۲۰۱۰ء

کراچی۔۔۔

ہمارا شہر کراچی ایک منفرد شہر ہے۔ پاکستان کا سب سے بڑا شہر۔ دلّی تو کئی بار اجڑی اور کئی بار بسائی گئی اور اس کے باوجود اسکی راجدھانی والی حیثیت برقرار رہی لیکن کراچی کو ایک ہی جھٹکے میں ایک ڈکٹیٹر نے اس حیثیت سے محروم کر دیا۔ یہ اور بات کہ اس گناہ کا وہ آج تک خمیازہ بھگت رہا ہے اور بار برداری کے ٹرکوں کی زینت بنا ہوا ہے اور وہ بھی بلا شرکتِ غیرے نہیں!! کیوں کہ مسرت شاہین کی تصاویر کو بھی یہ ہی سعادت ملی ہوئی ہے۔ دلّی تو دلّی سے دہلی اور پھر نئی دہلی بن کر مشہور ہو چکی۔ لیکن، کراچی میں، نئی کراچی ایک بدنما داغ کے سوا کچھ نہیں۔ دوسرا ظلم یہ ہے کہ سب سے زیادہ ریونیو جینیریٹ کرنے کے باوجود، بنیادی سہولتوں سے محروم اس شہر میں لوڈ شیڈنگ مستقل ڈیرہ جمائے ہوئے ہے اور سونے پہ سہاگہ کہ سرکار ماننے کو تیار نہیں کہ یہاں لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے۔ بات ٹھیک ہی لگتی ہے کہ ہم نے بھی بھری دوپہر میں اسٹریٹ لائیٹس کو اکثر و بیشتر روشن ہی دیکھا ہے۔ یہاں ہمیں یہ بتانے میں کوئی عار نہیں کہ ایک بار ہم نے بھی سرکار کی طرح اس ہی قسم کی غلط بیانی کا مظاہرہ کیا تھا

یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی انلائٹمنٹ (enlightenment) نے پَر پُرزے نہیں نکالے تھے اور کراچی عروس البلاد اور روشنیوں کے شہر کے ناموں سے پہچانا جاتا تھا۔ ہم نے اپنے ایک لاہوری دوست کو جب کراچی کے بارے میں بتایا کہ کراچی کو روشنیوں کا شہر کہا جاتا ہے تو اسے کراچی دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ ہم نے اسے کراچی آنے کی دعوت دیدی لیکن مصروفیت کے باعث وہ کافی عرصہ تک کراچی نہ آ سکا۔ جب آیا تو حالات بدل چکے تھے۔ اب اینلائٹمنٹ کا دور دورہ تھا۔ ہم اسے لینے ایر پورٹ پہنچے تو رات کے تقریباً آٹھ بج رہے تھے۔ ہماری کار جب شاہراہِ فیصل سے گذر رہی تو ہمارے مہمان نے کہا یار یہ کیسا روشنیوں کا شہر ہے کہ کاروں کی ہیڈ لائٹس کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔ ہم پہلے تو سٹپٹائے پھر سنبھالا لیکر عرض کیا ارے یار ابھی تو رات ہے نا، کل دن میں دیکھنا۔ سمجھدار آدمی تھا، سمجھ گیا اور ہمیں مزید شرمندہ نہیں کیا۔۔ ہمارا یہ شہر، موسمی مذاق

کا نشانہ بھی بنتا رہتا ہے اور یہاں کے باسی فخریہ کہتے ہیں۔

'' صبح کو نزلہ، شام کو کھانسی ، ہائے کراچی ، ہائے کراچی!''

کراچی کو غریب پرور شہر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ بڑا ہی (accomodative) شہر ہے جو آتا ہے اس پر اپنا حق جتاتا ہے۔ یہاں آنے والے زیادہ تر اکیلے آتے ہیں، کماتے خوب ہیں پر خرچ کچھ نہیں کرتے ،ساری رقم اپنے آبائی گاؤں بھیج کر بھی کراچی والے ہی رہتے ہیں۔ ہماری پوسٹنگ جب کوئیٹہ میں ہوئی تو ہم نے وہاں مکان کرایہ پر لیا اور بیوی بچوں سمیت منتقل ہو گئے اور جو کمایا وہیں خرچ کیا پھر بھی مقامی دوستوں کے طعنے سننے کو ملتے کہ لوٹنے آ گئے، آخر ایک دن اپنے ایسے کرمفرماؤں کو جتلانا پڑا کہ مکان کا کرایہ دیتے ہیں۔ جو کچھ تنخواہ کراچی سے آتی ہے یہیں خرچ کرتے ہیں۔ بچوں کی اسکول کی فیس بھی یہیں جاتی ہے۔ اس دن کے بعد ان کے طعنوں سے گلوخاصی ہوئی۔

کراچی کو ہم نے اس ہی لیئے اکوموڈیٹیو کہا ہے کہ یہاں باہر سے آنے والے، مقامیوں کے مقابلے میں زیادہ طمطراق سے رہتے ہیں۔ بیوی بچوں کی غیر موجودگی میں کچھ زیادہ ہی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لڑنے مرنے پر ہر دم آمادہ کیونکہ پردیسی ہونے کے ناطے آپس میں ایکا جو ہوتا ہے۔ کراچی میں باہر سے آنے والوں کا طریقہء واردات بھی خوب ہوتا ہے۔ آتے ہی خود ساختہ چوکیدار بن بیٹھتے ہیں۔ ایک ڈنڈا لیا ایک سیٹی پکڑی اور شروع ہو گئے۔۔ ''جاگتے رہو''۔ وہ تو بھلا ہو ان لوگوں کا، جنہوں نے سیکیوریٹی کے ادارے جا بجا کھول لیئے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ گارڈز کے بغیر کوئی آفس کوئی ادارہ، بشمول بنک محفوظ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کئی بڑی ڈکیتیوں میں نجی کمپنیوں کے گارڈز ملوث پائے گئے۔ کئی گھریلو خواتین کے قتل میں بھی ان کا ہاتھ پایا گیا اور کیوں نہ ہو۔ اسلحہ ان کے پاس ٹرانسپورٹ ان کے پاس!۔ کہاوت ہے کہ چوروں کو چوکیدار بنا دو تو اخلاقاً چوری سے تائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن چوکیدار ہی چوری پر کمربستہ ہو جائیں تو؟۔۔ یہ ہے سوچنے کی بات۔ چلتے چلتے ایک لطیفہ۔۔ ایک صاحب یہ سن کر کہ کراچی میں روزگار کے بڑے مواقع ہیں، کراچی آ گئے۔ اتفاق سے کوئی کام نہ ملا تو گھومتے گھامتے ایمپریس مارکٹ پہنچ گئے۔ وہاں کی گہما گہمی دیکھ رہے تھے کہ نظر جا ٹھہری ایک ایسے شخص پر جو ایک طوطا لیئے کھڑا تھا۔ یہ دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے، تھوڑی ہی دیر میں ایک گاہک

آیا اور طوطے کی قیمت پوچھی۔ طوطے والے نے قیمت ۵۰۰ روپے بتلائی۔ گاہک نے پوچھا کچھ بولتا بھی ہے۔ جواب ملا جی ہاں اور طوطے سے بولا کہو نبی جی چُوری بھیجو، طوطے نے فوراً یہ الفاظ دہرا دیئے۔ گاہک نے دام چکائے اور طوطا لے گیا۔ اس شخص کو بڑی حیرت ہوئی اور اس نے سوچا یہ کام ٹھیک رہیگا۔

دوسرے دن اس نے بھی کہیں سے ایک طوطا پکڑا اور آ کر اس ہی جگہ کھڑا ہو گیا۔۔ کافی دیر بعد ایک گاہک آیا اور قیمت پوچھی۔ اسنے کہا ۵۰۰ روپیہ۔ گاہک نے پوچھا کیا کچھ بولتا ہے۔ اس نے جواب دیا ہاں اور طوطے سے کہا بولو نبی جی چوری بھیجو۔ طوطا خاموش رہا اور گاہک کچھ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اب اسے پریشانی لاحق ہوئی۔ اسی اثنا میں ایک خاتون آ گئیں اور قیمت پوچھی گھبراہٹ دیدنی تھی لیکن کمال ہوشیاری سے فوراً بولا ’ ۱۰۰۰ روپیہ‘۔ خاتون نے پوچھا اس میں کیا خاص بات ہے۔ کیا بولتا ہے؟ جواب دیا نہیں بولتا تو نہیں ہے۔ خاتون نے تعجب سے کہا پھر ہزار روپے کس بات کے؟ اس نے اطمینان سے شہادت کی انگلی کنپٹی پہ ٹھوکتے ہوئے کہا۔۔ ’’جی یہ سوچتا ہے۔‘‘۔

۱۳ مارچ ۲۰۱۰

سید قاسم محمود

ایک مشہور کالم نگار نے سید قاسم محمود صاحب کے انتقال پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی موت پر میڈیا نے کوئی خاص ذکر نہیں کیا۔ نہ کوئی فلم چلی۔ نہ کوئی تعزیتی پیغام نشر ہوا۔ سولہ کروڑ مٹی کے مادھوؤں کو تو انکے بارے میں علم ہی نہیں کہ وہ کون تھے اور کیا تھے؟ بہرحال خوشی ہے کالم نگار نے کچھ آگاہی تو بخشی۔ آگاہی ہوئی کہ سات سال کی عمر میں مرحوم نے اپنے ایک ہندو استاد کو اس لیے تختی کھینچ ماری تھی کہ اس نے پیغمبرﷺ کی شان میں کچھ نازیبا الفاظ کہے تھے اور بدلے میں ہندو لڑکوں نے ٹھیک ٹھاک پٹائی کر دی تھی۔ کام تو غازی علم دین شہید جیسا ہی تھا لیکن پزیرائی وہ نہ مل سکی۔ ادب کی خدمت میں جو کچھ کیا، وہ ماسوائے چند صاحبان نظر کے کسے خبر؟ پڑھنے لکھنے والے ہیں ہی کتنے؟ اب ادب کی خدمت تو میڈیا کی توجہ مبذول کروانے سے رہی۔ ہاں کسی کھیل میں نام پیدا کیا ہوتا یا موسیقی میں کوئی کارنامہ کیا ہوتا تو کوئی بات ہوتی۔ عوام بھی جانتے کہ بھئی یہ ثانیہ مرزا ہے یہ شعیب ملک ہے یا یہ عدنان سمیع ہے۔ ان کی شادی کی خبریں اتنی اہم ہیں کہ سید قاسم محمود کی تعزیت کے لیے وقت کہاں؟ سید صاحب نے بھی خوب کیا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ کتابیں لکھ دیں۔ کون پڑھتا ہے؟ ہم نے بھی ایک کتاب لکھی اور جیب سے تیس ہزار خرچ کر کے دو سو کاپیاں چھپوا دیں۔ کوئی بک سیلر رکھنے پہ راضی نہ ہوا۔ ہر کوئی یہ کہتا تھا بھئی اب کتابیں کوئی نہیں خریدتا۔ رکھوا دو بک گئی تو پیسے لے جانا۔ پچاس پرسنٹ کمیشن ہو گا یعنی سو روپیہ۔ فی کتاب ڈیڑھ سو میں چھپی تھی۔ ظاہر ہے ہر کتاب پر فقط پچاس روپے کا نقصان تھا لیکن راضی ہو گئے یہ اور بات کہ کچھ دن بعد واپس لینی پڑ گئیں کہ ایک بھی نہ بک سکی۔ مجبوراً دوستوں کو پانچ پانچ دس دس دے کر تعلقات کی بنا پر بکوا دیں۔ گمان ہے کہ دوستوں نے از راہ مروت خرید لیں۔ کئی دوستوں نے اس طرح مدد فرمائی کہ دس دس کتابیں لے کر دو دو ہزار پکڑا دیے۔ واللہ اعلم کتابیں ضائع کر دیں یا دوسروں کو تحفتہً دے دیں۔ ہر دو صورتوں میں پڑھی نہیں گئیں کیونکہ کہیں سے بھی کوئی تبصرہ نہیں آیا۔ ہاں جن چند لوگوں نے پڑھی انہوں نے تعریف کی۔ کچھ بھی ہو، تیس میں سے بیس ہزار کی واپسی

ہوگئی۔اس لیئے کچھ لوگوں کو مفت بھی بھجوادیں۔جنہیں تحفے میں بھجوائیں ان میں سے فقط ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی شخصیت ایسی ہے جس نے تیسرے ہی دن SMS پر اپنا تبصرہ شکریے کے ساتھ بھجوادیا۔ڈاکٹر صاحب نے جس انداز سے تعریفی کلمات لکھے اس کے جواب میں ہم نے یہ ہی لکھا کہ یہ الفاظ تو ہماری کتاب سے زیادہ ہمارے لیئے باعث افتخار ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے SMS سے ہمیں حیرت بھی ہوئی کیونکہ لوگوں نے تو یہ بھی نہیں لکھا کہ ''کتاب مل گئی۔شکریہ!!''۔ڈاکٹر صاحب کے علاوہ جنہوں نے تعریف کی یا ملنے کی رسید دی،ان کے نام ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔اس سے یہ نہ سمجھیے کہ ہم نے انگلی کی پوروں پر گنا ہوگا۔جی نہیں ایک انگلی ایک شخص! ویسے ہمت افزائی کے لیے یہ بہت ہیں کہ پانچوں اشخاص یا تو کسی نہ کسی ادبی جریدے کے مدیر ہیں،شاعر ہیں یا افسانہ نگار۔اگر کوئی پوچھے کہ کتاب لکھ کر کیا پایا تو ہمارا جواب ہوگا ڈاکٹر عبدلقدیر خان صاحب کا فون نمبر اور تعریفی الفاظ۔۔

ہمارا اپنا ذکر تو برسبیل تذکرہ نکل آیا ورنہ بات ہو رہی ہے جناب سید قاسم محمود کی جنہوں نے شائد ہی کوئی بڑا مصنف چھوڑا ہو جسکا ترجمہ نہ کیا ہو۔یہ ہی نہیں بلکہ اپنے تمام کام کو نہایت کم قیمت پر شائع کیا۔لیکن بات تو وہی ہے کہ قدردان ہیں ہی کتنے؟ یہاں تو وہ کالم نگار جو اہتمام سے اپنا ای میل اڈریس شائع کرتے ہیں انہیں ای میل بھیجو تو 90% ڈیلیور ہی نہیں ہوتیں۔جو ہو بھی جاتی ہیں تو پڑھی نہیں جاتیں حالانکہ تقریباً ہر کالم نگار یہ ہی لکھتا ہے کہ ایک قاری نے ای میل میں لکھا ہے۔۔۔ایک صاحب رقم طراز ہیں۔۔ایک کرم فرمانے فون پر توجہ دلائی ہے۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔سید قاسم محمود صاحب اب ہم میں نہیں رہے۔ہوسکتا ہے اگر موت کچھ دن اور نہ آتی اور ثانیہ مرزا کی شادی کا شور وغوغا نہ اٹھتا تو شائد ہمیں یہ کالم لکھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔پھر بھی ہمیں خوشی ہے کہ ایک کالم نگار نے اپنا فرض نبھاتے ہوئے آج ایک کالم لکھدیا اور دوسرے نے اپنے کالم کے آخر میں فقط ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ کل یا پرسوں اس پر لکھیں گے۔اللہ کرے ایسا ہی ہو ہمیں تو مشکل ہی لگ رہا ہے کیونکہ ثانیہ مرزا اور شعیب کی شادی سے پہلے ہی ثانیہ کی ایک سوکن کا ظہور ہوگیا ہے۔اب اس دلچسپ سچویشن میں مرحومین کا ذکر کسے پسند آئے گا۔لیکن ایسا بھی نہیں ہے کیونکہ ایک چینل کی بدولت ہمیں کل ہی معلوم ہوا کہ مینا کماری کو ہم سے بچھڑے ہوئے 38 برس بیت گئے۔یہ بہت ہی خوش آئند

ہے کہ مرحومہ کو اڑتیس سال بعد بھی یاد رکھا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جناب سید قاسم محمود مرحوم کو بھی ہر سال یاد کیا جائے گا۔آخر خوش فہمی بھی تو کوئی چیز ہے

۱۳ اپریل ۲۰۱۰ء

اونٹ سستا، بلی مہنگی

اللہ کا شکر کہ ہمارے ملک کے سارے مسائل آخر کار حل ہو ہی گئے۔ یہ مسائل یا اشوز (issues) پاکستان بننے کے بعد سے حل طلب تھے۔ کچھ اشوز پاکستان سے بھی پہلے کے تھے، کچھ بعد میں پیدا ہوئے۔ پہلے والے انگریزوں کے زمانے کے تھے اس لیے انہیں اس ہی دور میں حل کروانے کے لیئے کسی بھی لیڈر کے پیٹ میں مروڑ نہیں اٹھا۔ نصف صدی کے بعد اٹھا ہے تا کہ اور کچھ نہیں تو اس شعر کی لاج رہ جائے کہ ؎ نصف صدی کا قصہ کا ہے، دو چار برس کی بات نہیں۔

ایک تماشہ اور بھی ہے کہ پیٹ میں مروڑ صرف اقتدار سے باہر والوں کو ہی ہوتا ہے۔ اقتدار میں سارے مسائل زیر غور آتے ہی نہیں۔ تازہ مثال ایک سابق وزیر کی ہے جو دورِ پرویزی میں قلم اور نوٹ بک لے کر ٹاک شوز میں اس طرح آتے تھے جیسے کوئی اسٹینوگرافر، صاحب کے بلاوے پر آتا ہے۔ اقتدار میں فرصت ہی نہیں ملی کہ باس سے کہہ کر سرائیکی صوبہ ہی بنوا دیتے۔ کوئی مشکل بھی نہیں تھی۔ صرف ایک آرڈر کی مار تھی۔ لیکن نہیں اس وقت کیا ضرورت! ہاں اب، جب حکومت سے 'آؤٹ' ہوئے تو میڈیا میں 'ان' رہنے کے لیے سرائیکیوں کے حقوق نظر آ گئے۔ ہم اپنے تجربے کی روشنی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر موصوف کو اس مطالبے سے دستبردار کروانا ہو تو انہیں فوراً اقتدار میں شامل کر لیا جائے۔ غور فرمایا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ فوجی ڈکٹیٹر سے لیکر سول حکمرانوں تک ہر ایک جس مطالبے کے بل بوتے پر حکومت پر قابض ہوتا ہے اس مطالبے کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اب چاہے وہ مطالبہ کرپشن کا ہو یا مہنگائی کا۔ کالا باغ ڈیم کا ہو یا کشمیر کا۔ عدلیہ کی آزادی کا ہو یا میڈیا کا۔ غریبوں کے لیئے مفت تعلیم کا ہو یا صحت کا۔ اس صورت حال میں یہ انہونی ہوئی کہ سارے اگلے پچھلے مسائل حل ہو گئے۔ انہونی اس لیئے کہ ایک دو نہیں بیسیوں مسائل یک جا کر کے انہیں سترھویں (17th.) ترمیم سے نتھی کر دیا بالکل اس طرح جیسے ایک اونٹ والے نے اونٹ کی گردن کے ساتھ ایک بلی باندھ دی تھی

۔ اونٹ کی قیمت کم رکھی اور بلی کی قیمت زیادہ۔ شرط یہ تھی کہ دونوں ساتھ ہی بکیں گے ورنہ نہیں۔ اس لیئے ہم جیسے کم فہم تجزیہ نگاروں کا خیال تھا کہ بلی کی وجہ سے اونٹ نہیں بکے گا۔ لیکن جناب اونٹ بک گیا اور سترھویں ترمیم بھی دفن ہو گئی۔ اب اونٹ والے کی قسمت کہ اونٹ بیٹھتا کس کروٹ ہے اور ۱۸ ویں ترمیم کیا گل کھلاتی ہے۔ جو مسائل حل ہوئے ان کی تعداد گو بہت زیادہ ہے لیکن چند ایک اہم ترین مسئلوں کو زیر بحث نہ لانا صریحاً زیادتی ہو گی۔ یہ حل شدہ ایشوز اتنے زیادہ ہیں کہ ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا اس لیے یہ واقعہ سنانا چاہیں گے ویسے بھی ہماری ایک خامی یہ بھی ہے کہ ہم ایک آدھ بات موضوع سے ہٹ کر کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ سننے یا پڑھنے والے اس بات اور موضوع میں کوئی نہ کوئی ربط ضرور پیدا کر لیں گے۔

ہم یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹ لیڈر تھے۔ اسٹرائیک کا زمانہ تھا۔ اسٹوڈنٹس ایوب خان کے خلاف ہو رہے تھے۔ حالات زیادہ بگڑے تو ہماری ایک میٹنگ کرنل رحیم الدین (اب ریٹائرڈ جنرل رحیم الدین جو جنرل ضیا الحق کے سمدھی ہیں) سے ہوئی۔ کرنل صاحب نے از راہ ہمدردی ہم سے کہا 'بیٹے اپنے تمام مطالبات لکھ کر دے دو، میں طلبا کے لیئے کوشش کرونگا کہ آپ لوگوں کے مطالبات منظور ہو جائیں'۔ ہم نے کہا ہمارا ایک ہی مطالبہ ہے کہ کوٹہ سسٹم ختم کیا جائے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ جتنے مطالبے ہیں لکھ دو۔ ہمارا جواب یہ ہی رہا کہ مطالبہ ایک ہی ہے۔ کرنل صاحب کافی جز بز ہوئے۔ کرنل صاحب کی زبردست پرسنالٹی تھی۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم ان سے کافی مرعوب ہوئے حالانکہ ہم عادتاً کسی سے مرعوب نہیں ہوتے۔ لیکن یہ بھی طرفہ تماشہ رہا کہ باوجود امپریس ہونے کہ ہم نے ان کی بات نہیں مانی۔ ہم جانتے تھے کہ دس بارہ مطالبات کی فہرست تھما دی تو سوائے اصل کے سارے مطالبات مان لیئے جائیں گے اور کہا جائے گا اسٹوڈنٹس کے ۹۰ پرسنٹ مطالبات مان لیئے گئے۔ اس واقعے کے پیش نظر ہمیں ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو سارے مسائل حل ہو جائیں اور ۱۷ ویں ترمیم جوں کی توں رہ جائے۔ شکر ہے ہمارے خدشات غلط ثابت ہوئے اور ۱۷ ویں ترمیم کے ساتھ صوبے کا نام تبدیل ہو گیا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو عوام بھوکوں مر جاتے۔ لوگ آخرت میں کیا بتاتے کہ وہ کس صوبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتنا بڑا ایشو تھا۔ شکر ہے حل ہو گیا لیکن بدخواہ لوگ اب کہیں گے کہ سندھ میں رہنے والے سندھی کہلاتے ہیں۔ پنجاب میں رہنے والے پنجابی ہیں تو پختونخواہ میں رہنے والے کیا کہلائیں

گے؟ پختونخواہی؟ ہمارے اندر کا بغلول بھی پوچھ رہا ہے کہ بلوچستان میں رہنے والے پٹھان کیا بلوچی کہلائیں گے ایک اور جان لیوا ایشو بھی حل ہو گیا۔ سندھ اور بلوچستان کے ناموں کی اسپیلنگ (Spelling) بھی صحیح کر دی گئی۔ اب تک غلط املا لکھ کر نہ جانے ہم لوگوں نے کتنا نقصان کر لیا ہوگا؟ ایک اور اہم ایشو بھی ٹھکانے لگا۔ پارٹیوں میں انتخابات!! توبہ توبہ!! اگر پارٹیوں کے سربراہوں کو دھڑکا لگا رہے گا کہ قیادت خاندان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے تو خاک کام کر سکیں گے۔ اس لیئے پارٹی انتخابات کی شرط ختم کر دی گئی۔ اب پارٹی سربراہ بجا طور پر کہہ سکیں ؎ رہا کھٹکا نہ لٹنے کا۔

بہر حال ۱۰۲ ایشوز کے حل ہونے سے ایک فائدہ بھی ہوا۔ ۱۷ ویں ترمیم ختم کرانے کے لیئے جتنا وقت اور پیسہ لگا اگر اس میں صرف سترھویں ترمیم ہی ختم کی جاتی تو مہنگی پڑتی۔ ہوسکتا ہے آڈٹ اوبجکشن ہو جاتا۔ اب سارے خرچے کو ۱۰۲ پر تقسیم کر دو تو سودا مہنگا نہیں لگے گا۔ شائد ایسی ہی وجہ تھی کہ کرنل صاحب ہم سے ایک مطالبے کی بجائے مطالبات کی لسٹ مانگ رہے تھے۔

۱۰ اپریل ۲۰۱۰ء

ایک ادبی محفل

ہمارے کرم فرما جناب امین جالندھری نے ایک دن ہم سے پوچھا کہ کیا ہم نے اپنی کتاب 'ایک غیر مطبوعہ کتاب' جناب عبدالحمید سندھی صاحب کو بھی پیش کی ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ باوجود خواہش کے آج تک بالمشافہ ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ وجہ یہ رہی کہ کہاں ان جیسی قد آور شخصیت اور کہاں ہم؟ ہمت ہی نہیں پڑی۔ فرمایا۔ 'تو چلو آج ملوا دیتے ہیں'

ہماری خوشی کی حد نہ رہی اور ہم نے فوراً ایک کتاب لی اور امین صاحب کے ساتھ چل دیئے۔ حمید صاحب کے دولت کدہ پر پہنچے۔ ابھی ہم منتظر تھے کہ کوئی ملازم یا چوکیدار نظر آئے تو اندر پیغام پہنچوا دیں کہ دو تین اصحاب آئے اور بلا روک ٹوک اندر چلے گئے۔ ہم کچھ سمجھ نہ پائے تھے کہ ایک اور صاحب تشریف لے آئے۔ ہم نے فوراً ان سے حمید صاحب کے لیئے پوچھا۔ انہوں نے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور ہم کشاں کشاں اندر پہنچ گئے جہاں پہلے سے دس بارہ بزرگ حضرات موجود تھے۔ سلام دعا کے بعد ہمیں بیٹھنے کی دعوت دی گئی اور ہم دونوں بھی بیٹھ گئے۔ سب خاموش تھے۔ محسوس ہوا کہ کسی کے منتظر ہیں۔ اس دوران کئی اور لوگ بھی آتے گئے اور سلام دعا اور مصافحے کے بعد بیٹھتے گئے۔ کچھ دیر بعد امین صاحب نے جناب حمید صاحب کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا کہ وہ تو مورو گئے ہیں۔ جتوئی مرحوم کے چہلم میں۔ ہمیں افسوس ہوا کہ آج بھی ملاقات نہیں ہوسکتی۔ امین صاحب نے دھیرے سے کہا کہ کتاب رکھوا دیتے ہیں بعد میں فون پر بات کر لیں گے۔ ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا اس لیئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ امین صاحب نے سندھی میں اپنے آنے کا مقصد بتایا اور ہمارا تعارف کراتے ہوئے ہماری کتاب پیش کر دی اور درخواست کی کہ جناب حمید صاحب کی خدمت میں پیش کر دی جائے۔ کتاب کا سن کر سب نے ہماری طرف دیکھا اور خوشی کا اظہار کیا۔ پھر بتایا کہ وہ سب لوگ ادیب اور شاعر ہیں اور وہاں ہفتہ وار میٹنگ کے لیئے جمع ہوتے ہیں۔ بس دو ایک لوگوں کا انتظار ہے پھر

تقریب کا آغاز ہوگا۔ہم دونوں نے اجازت چاہی تو ہم لوگوں کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ہمیں چونکہ خود ایک تقریب میں جانا تھا اس لیئے معذرت چاہی۔افسوس کرتے ہوئے ایک صاحب نے سب حاضرین کا تعارف کرایا اور فرمایا اچھا تو کم از کم چائے پی لیجیئے اور کچھ دیر کے لیئے ہی سہی ہماری محفل میں شریک ہو جایئے۔ان کا خلوص دیکھتے ہوئے ہم دونوں نے حامی بھر لی۔سب خوش ہوئے اور ملازم کو جلد چائے لانے کے لیئے کہا۔چائے کے بعد کارروائی کا آغاز ہوا تو ایک صاحب نے ہم سے صدارت کے لیئے استدعا کی۔ہمیں بڑی حیرت ہوئی اور ہم نے اپنے جلد جانے کی وجہ بتاتے ہوئے معذرت چاہی۔اس پر انہوں نے کہا کوئی بات نہیں جتنی دیر بھی آپ تشریف رکھ سکتے ہیں اتنی دیر تک کی کارروائی آپ کی صدارت میں ہی ہوگی۔یہ ہمارے لیئے بڑے اعزاز کی بات تھی اور ساتھ ہی تعجب کی بھی۔کیونکہ دو ایک ایسی ہی محفلوں میں صدارت کے لیے ادیبوں کو لڑتے دیکھا تھا۔روٹھنے اور منانے کی رسم سے ہم سخت نالاں تھے کیونکہ ہمارے خیال میں صدارت کے لیئے لڑنا ادیبوں کو زیب نہیں دیتا۔

بہر حال تقریب کا آغاز ہوا اور ہمیں صدارت سونپ کر جس طرح ہماری عزت افزائی کی گئی وہ ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔وہاں موجود تمام ادیبوں اور شاعروں نے اپنے ادیب ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے جس ادب کا مظاہرہ کیا وہ آج کل کم کم ہی نظر آتا ہے۔یہاں پر ایک قابل ذکر یہ بات بھی تھی کہ یہ محفل سندھی زبان کے ادیبوں کی تھی اور ہم سندھی زبان سے بالکل ناوقف!لیکن کسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور ہماری جلد روانگی کے پیش نظر ہم سے اپنا کوئی افسانہ سنانے کی فرمائش کی۔ہم نے کہا کہ ہم تو کسی تیاری کے ساتھ نہیں آئے تھے اس لیئے کوئی افسانہ یا کلام ساتھ نہیں ہے۔اس پر ایک بزرگ نے فرمایا کہ اپنی اس کتاب سے ہی کچھ پڑھ دیجئے۔حاضرین کی محبت اور دلچسپی دیکھتے ہوئے ہم نے اپنی کتاب سے ایک مضمون پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔اردو زبان میں ہونے کے باوجود سب نے غور سے سنا اور فرداً فرداً ہر شخص نے دل کھول کر تعریف کی اور ہماری کتاب میں دلچسپی ظاہر کی ہم نے انہیں بتایا کہ کم تعداد میں چھپوانے کے باعث کتاب ختم ہوگئی ہے لیکن انشااللہ جلد ہی دوسرے اڈیشن کے ساتھ آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہونگے۔ہماری اور ہماری کتاب کی جس طرح پزیرائی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔اس کے علاوہ ان لوگوں کے اخلاق نے ہمیں بے حد

متاثر کیا۔ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب جناب عبدالحمید سندھی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔رخصت سے پہلے جناب امین جالندھری نے سندھی زبان میں حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جو کچھ بیان فرمایا وہ ہم تو نہ سمجھ سکے لیکن ان سب نے بہت داد دی۔اس تقریب کا نقش ہمارے دل پر محفوظ ہے جسے ہم ان چند سطور میں قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔

۲ مئی ۲۰۱۰ء

دھوتی کا کوئی ذکر نہیں

قصہ پرانا ہے اور تعلق دیہاتی معاشرے سے ہے۔ اب اتنا عام ہو چکا ہے کہ شائد سارا زمانہ جانتا ہوگا۔ پھر بھی مختصراً دہرانے میں کوئی حرج نہیں۔ قصہ یوں ہے کہ ایک زمیندار اپنے ایک میراثی کارندے کے ساتھ زمینوں کی دیکھ بھال کے لیئے محوسفر تھا۔ میراثی کو ساتھ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ میراثی کو تعارف کرانے میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ راستے میں ملنے والے ہر کس وناکس سے تعارف کراتے ہوئے زمیندار کی تعریفوں کے پل کچھ اس طرح باندھتا تھا کہ زمیندار کا دل خوش ہو جاتا۔ اتفاقاً راستے میں زمیندار کی شفاف دھوتی پر کوئی ایسا داغ لگ گیا کہ چھپانے کی کوئی سبیل نہ ہوسکتی تھی۔ ایسے میں میراثی نے اپنی دھوتی سرکار کی دھوتی سے بدل لی اور سفر جاری رہا۔ ایک جگہ ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ میراثی نے فوراً سرکار کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ جناب پچاس گاؤں کے مالک ہیں۔ تین شوگر ملیں ہیں۔ اسمبلی کے ممبر بھی ہیں۔ چار کاریں ہیں دس ٹریکٹر ہیں ، پر جناب دھوتی میری ہے۔ سن کر مخاطب پر جو گزری سو گزری ہاں! زمیندار کو ٹھیک ٹھاک جھٹکا لگا۔ مگر ضبط سے کام لیتے ہوئے ہلکی سی سرزنش کر دی۔ میراثی معاملے کی سنگینی کو نہ سمجھ پایا اور تعارف کے دوسرے موقعے پر پھر یہ ہی کیا اور تمام اثاثے گنوانے کے بعد اپنی دھوتی کا بھی ذکر کر دیا۔ زمیندار کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور موقع ملتے ہی میراثی کو بے نقط سنائی کہ دھوتی کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ خبردار اب دھوتی کا ذکر نہ ہو، ورنہ تمہاری خیر نہیں بیوی بچوں سمیت اندھے کنویں میں پھنکوا دونگا۔ میراثی گالیاں کھا کر بے مزہ تو کیا ہوتا لیکن افسردہ ضرور ہوا کہ اپنی دھوتی کے زمیندار کے زیر استعمال ہونے سے جو عزت افزائی ہونی تھی اس کی تشہیر سے محروم کر دیا گیا۔ اس ہی غم میں ڈوبا ہوا تھا کہ ایک دوسرے چودھری سے مڈبھیڑ ہوگئی میراثی فورا اپنے زمیندار کا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگا 'جناب ہمارے زمیندار صاحب بہت بڑے رئیس ہیں۔ انکے پچاس تو گاؤں ہیں۔ اسمبلی کے ممبر بھی ہیں بیسیوں گاڑیاں ہیں کراچی اور لاہور میں بنگلے بھی ہیں لیکن جناب دھوتی۔'

ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ زمیندار کی شعلہ برساتی آنکھوں پر نظر پڑی تو بول اٹھا 'بس جناب یہاں دھوتی کا کوئی ذکر نہیں۔ اب ''دھوتی کے ذکر کے نہ ہونے'' نے جو قیامت ڈھائی ہوگی وہ تو زمیندار کے دل کو ہی معلوم ہوگا لیکن اس سے ملتے جلتے ایک تازہ تازہ واقعے نے ہمارے دل پر جو وار کیا اس کی تفصیل بتانے کے لیئے ہی ہم نے مندرجہ بالا واقعہ دہرایا ہے۔ یہ تو آپ سب ہی جانتے ہیں کہ پچھلے دنوں بلکہ اب بھی ایک شادی کے سلسلے میں ہمارا الیکٹرونک میڈیا 'عبداللہ دیوانہ' کی تفسیر بنا ہوا ہے۔ اس شادی کی ایسی کوریج ہو رہی ہے کہ بڑے بڑے واقعات گہنا گئے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار کی رحلت ہو یا صدر پاکستان کی تقریر، کوئی بھی واقعہ اہمیت نہ پا سکا۔ لمحہ بہ لمحہ کی خبروں نے کم از کم ہم جیسوں کو تپا کر رکھ دیا۔ ہماری کیفیت اس وقت قابل دید تھی جب ہم ایک نہایت اہم موضوع پر ٹاک شو دیکھ رہے تھے کہ اچانک اسکرین پر 'بریکنگ نیوز' کی سلائڈ نے ہمارے اوسان خطا کر دیئے اور ہمارے مونہہ سے ابھی فقط اللہ خیر ہی نکل پایا تھا کہ خبر نشر ہوئی 'ثانیہ مرزا اور شعیب ملک پاکستان آنے کے لیئے جہاز پر سوار ہو گئے ہیں'۔ سنتے ہی پہلے تو مونہہ سے لاحول ولاقوۃ کے الفاظ نکلے پھر شکرانے کے ، کہ شکر ہے کہیں بم نہیں پھٹا ویسے یہ اور بات کہ یہ بریکنگ نیوز خود کسی بم سے کم بھی نہ تھی کیونکہ اس کے بعد ہم غصے کے مارے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہے۔ ٹاک شو کا رابطہ جہاں سے منقطع ہوا تھا وہیں سے جوڑ دیا گیا لیکن اب ذہن اس قابل نہ تھا کہ میزبان اور مہمانوں کی گفتگو کو کوئی معنی پہنا سکتا، اس لیئے ٹی وی بند کرتے ہی بنی۔ اب سوچتے ہیں ہمارا کڑھنا بے جا ہے۔ میڈیا کا صرف اتنا ہی تو قصور ہے کہ اس نے ہر ہر لمحے کی خبر پہنچانے کا عزم کر رکھا ہے ورنہ دیوانگی تو اس حد تک پھیل چکی ہے کہ ایک خاتون وفاقی وزیر ڈھولکی بجانے اور دلہن کو سونے کا تاج پہنانے بھارت پہنچ گئیں اور یہیں بس نہیں کیا بلکہ تقریب ولیمہ میں دلہا دلہن کے پیچھے چلتے ہوئے تالیاں بجاتے ہوئے بھی دیکھی گئیں۔ کہاں کی ڈگنٹی (Dignity) اور کیسی پرسٹیج (prestige)۔ بہرحال یہ سلسلہ اتنا طول پکڑ گیا ہے کہ اب لوگ اکتانے لگے ہیں اور دبی زبان سے تنقید بھی کر رہے ہیں۔ ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ اب چوٹی کے کالم نویس اور صحافی حضرات بھی اس دیوانگی کے خلاف ٹی وی پر بولنے اور اخبار میں کالم لکھنے لگے ہیں جس سے ہمیں بھی قلم اٹھانے کی تحریک ہوئی۔ اپنے اپنے شوز میں تقریباً ہر اینکر نے میڈیا کی اس کوریج کے خلاف لب کشائی کی لیکن بازی ایک ایسے اینکر پرسن لے

گئے جو پاکستان کے کیپیٹل (Capital) اسلام آباد سے سیاست پر پروگرام کرتے ہیں لیکن نہ جانے انہیں کیا سوجھی کہ ''دھوتی کا کوئی ذکر نہیں'' طرز پر چالیس پینتالیس منٹ کا ایگ پروگرام ترتیب دے دیا جس میں تمام شرکاء نے سیر حاصل بحث اس موضوع پر کی کہ'' کیا میڈیا نے شعیب اور ثانیہ کی شادی کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دے دی''۔اس طرح موصوف نے مزید ۴۵ منٹ ثانیہ اور شعیب کے لیے وقف کر دیئے۔

۲ مئی ۲۰۱۰ء

U.N.O.

نوائے وقت میں ہمارے دو کالم ۲۱ اور ۲۵ جنوری ۲۰۰۹ کو شائع ہوئے تھے۔ ایک (BB.BM.BC) اور دوسرا 'شرلاک ہومز اور اسکاٹ لینڈ یارڈ'۔ پہلے میں بریگیڈیر چیمہ (BC) نے ایک پریس کانفرنس میں ثابت کیا تھا کہ BB کو بیت اللہ محسود (BM) نے قتل کروایا تھا اور وجہ قتل گولی نہیں تھی بلکہ سن روف کا لیور تھا۔لوگ مطمئین نہیں تھے اس لیئے بریگیڈیر چیمہ کو کور دینے کے لیے اسکاٹ لینڈ کی خدمات حاصل کی گئیں اور خطیر رقم کے عیوض اسکاٹ لینڈ یارڈ نے BC کے دعوے کی تصدیق کر دی۔مشرف نے اپنی طرف سے معاملہ ختم کر دیا لیکن حالات پلٹا کھاتے رہے۔بی بی کے شوہر نے الزام بیت اللہ محسود کی بجائے قاتل (ق) لیگ پر رکھ دیا پھر بات نکلی تو دور تک جانے کا خدشہ تھا اس لیئے آصف علی زرداری نے بحث سمیٹنے کی خاطر کہہ دیا کہ مجھے قاتلوں کا پتہ ہے۔لیکن لوگ تو زبان پکڑتے ہیں بس پیچھے پڑ گئے کہ پتہ ہے تو بتاؤ ۔اب یہ تو گوئم مشکل والی کیفیت ہوگئی۔انہوں نے ہمارے خیال میں بات ختم کرنے کے لیئے کہا تھا۔لیکن لوگ پیچھے پڑ گئے، مجبوراً کہنا پڑا میرے بچوں کی ماں اور میری بیوی شہید ہوئی آپ لوگوں کو کیا پریشانی ہے لیکن لوگوں کو تو موقع ملنا چاہیئے ۔بات اتنی بڑھی کہ بالآخر "UNO" کی خدمات حاصل کرنی پڑ گئی۔اب یو این او کے پاس کوئی کالا علم تو ہے نہیں کہ عمل کیا اور قاتل بلبلاتا ہوا یہ کہتے ہوئے آجائے گا کہ قاتل میں ہوں خدارا مجھے بچاؤ میرا پورا جسم جل رہا ہے۔یو این او کے ماہرین بھی جانتے تھے کہ نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی ہوگا لیکن پیٹ تو ان کے بھی لگا ہوا ہے اس لیئے کہ آتے ہوئے ڈالر کسے برے لگتے ہیں۔لوگ تو ڈالر کی خاطر ہزاروں کو غائب کرا دیتے ہیں۔یہاں تو فقط زبانی جمع خرچ ہی تو کرنا ہوگا۔آنا جانا، کھانا پینا مفت۔بس دو چار انٹرویو انٹیروگیشن (interogation) کے نام پر اور بس۔تحقیقات کس چیز کی کریں۔جائے واردات دھل چکی ۔گاڑی کی سروس ہو چکی۔سم غائب۔بلیک بیری کا ریکارڈ ندارد۔بی بی کا دوپٹہ ہوا میں تحلیل

ہو چکا۔ ملے تو کیونکر۔ پوسٹ مارٹم ہوا نہیں تو رپورٹ کہاں سے آئے گی۔ اکثر سنتے ہیں کہ لاش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم بھی کیا جاتا ہے لیکن یہاں بھی شائد کوئی ٹیکنیکل ہچ آڑے آرہی ہوگی۔ دوپٹہ بی بی کا کوئی پرستار لے گیا ہوگا۔ اعلان کرا دیا جائے کہ وہ دوپٹہ بیشک رکھ لے لیکن یہ بتا دے کہ دوپٹے میں کوئی گولی سے پیدا ہونے والا سوراخ ہے یا نہیں۔ یہ سوال بھی اٹھ رہا ہے کہ بی بی گاڑی بدل بدل کر بیٹھتی تھیں تو اس بار ایسا کیوں نہیں ہوا۔ بلٹ پروف گاڑی میں سن روف! چہ معنی دارد!!

بی بی کی گاڑی تک کن لوگوں کی رسائی تھی؟ پتہ نہیں۔ کیا عام آدمی گاڑی تک جا سکتا تھا؟ نہیں تو پھر دس بیس جو جا سکتے تھے کہاں ہیں؟ قابل ممبران یو این او، ڈرائیوروں کو انٹیروگیٹ کرنا بھول گئے تھے کیا؟ اگر نہیں تو معاوضے میں سے کٹوتی کی گنجائش بنتی ہے۔ اس طرح کم از کم قومی خزانے پر سے بوجھ کم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں بھی ایک مسئلہ ہے اگر یو این او کو یہ تفتیشی ٹھیکہ دینے پر کسی نے کوئی کمیشن لیا ہوگا تو لوٹائی جانے وال رقم میں سے وہ بھی منہا کیا جائے گا۔ جو بہر صورت کوئی پسند نہیں کرے گا۔ یو این او کی ساری کارروائی سے ہمیں تو کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں نے تو بریگیڈیر چیمہ کی پریس کانفرنس میں کہی گئی اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ شہادت گولی سے نہیں لیور سے ہوئی تھی۔ لیکن یہاں تو ایسا کوئی کور بھی نہیں ہے ہاں ایک پینڈورا بکس کھل گیا ہے کہ یہ نہیں ہوا۔۔ وہ ہوا۔۔۔ لوگوں نے عقلی گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے۔ عجیب عجیب سوال اٹھ رہے ہیں۔ جائے حادثہ کس نے اور کیوں دھلوائی۔ گاڑی کو فٹافٹ کیوں دھلوا کر قابل استعمال بنوا دیا کیا استعمال کے لیئے کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ سیکیورٹی والے کیوں پہلے چلے گئے۔ سیکیوریٹی والے الزام لگا رہے ہیں کہ فوٹیج میں کوئی پولس والا کیوں نظر نہیں آتا۔ محترمہ نے اپنی ول (WILL) کسی ایسے آدمی کو کیوں دی جسے کوئی جانتا ہی نہیں بلکہ اس کا نام بھی کسی کو نہیں معلوم۔ بس آیا اور شوہر کو پکڑا کر چلا گیا۔ کئی اور سوالات بھی اٹھ رہے ہیں جو معاملے کو اور بھی الجھا رہے ہیں لیکن اعتزاز احسن کا خیال مختلف ہے وہ کہتے ہیں معاملات سلجھ رہے ہیں۔ زرداری صاحب نے ایک اور خوشخبری دی کے **۹۰٪** قاتل پکڑے جا چکے ہیں یعنی اگر دس اشخاص ملوث تھے تو اب صرف ایک رہ گیا ہے۔ لیکن یو این او۔ کی رپورٹ کا تجزیہ کرتے ہیں تو ابھی بہت سے لوگ باہر نظر آرہے ہیں۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قتل میں ہزار ہا لوگ ملوث رہے ہونگے کیونکہ نوے

پرسنٹ پکڑے جانے کے بعد بھی پچاسوں باہر ہیں۔ عقل کام نہیں کر رہی۔ ایسے میں صدر مملکت نے معاملے کو سلجھانے کے لیئے بتلایا کہ جن لوگوں کو ہم نے تیس پینتیس سال پہلے مہمان بنایا وہ ہی قاتل ہیں۔ لیجئے افغانیوں کا کام ہے تو پھر بیت اللہ کا کیا ہوگا۔ جس کا موبائل چیمہ نے ٹیپ کروالیا تھا اور ثابت کر دیا تھا کہ یہ اس ہی کا کیا دھرا ہے۔ اب اگر افغانیوں کا کام ہے تو بیت اللہ کو کیسے افغانی ثابت کیا جائے۔ بس یہاں آکر ہمارا مائینڈ کام نہیں کر رہا۔ ویسے مائنڈ پر یاد آیا کہ ہماری پولس ہر واقعے کے بعد ماسٹر مائنڈ کو پکڑ لیتی ہے بلکہ کئی دفعہ تو ایک ہی واقعے میں وقفے وقفے سے کئی ماسٹر مائنڈ بھی پکڑے گئے۔ اس بار نہ جانے کیوں نوے پرسنٹ پکڑے جانے والوں میں ایک بھی ماسٹر مائنڈ نہیں۔ اس ہی لیئے کہا جاتا ہے کہ موت کو نہیں ٹالا جا سکتا۔ رہ گئے اگر، مگر، کیوں، کیسے تو اس کے لیئے یہ کہہ سکتے ہیں

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثات ایک دم نہیں ہوتے

۷ مئی ۲۰۱۰ء

SEQUEL

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی کامیاب ناول، داستان یا فلم کے کرداروں کی شہرت سے متاثر ہو کر ان ہی کرداروں پر مبنی ایک اور کہانی تخلیق کر لی جاتی ہے۔ جسے گذشتہ تخلیق کا سیکوئل (sequel) کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ واضع کرنا ضروری ہے کہ ایسی کہانیاں جو قسط وار پیش کی جاتی ہوں انہیں سیریل کہا جاتا ہے اور ایسی کہانیاں جو کسی ایک یا چند مرکزی کرداروں کے گرد گھومتی ہوں سیریز کہلاتی ہیں۔ سیریز میں ہر بار کہانی نئی ہوتی ہے لیکن کردار وہی ہوتے ہیں۔ سیکوئل کا تعلق نہ سیریل سے ہے نہ سیریز سے۔ لیکن سیاست میں معاملہ بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ کبھی کبھار یہ طرفہ تماشہ ہوتا ہے کہ نئی حکومت گرچہ پچھلی حکومت کی مخالفت یا ضد میں تشکیل پاتی ہے لیکن عمل پیرا سابقہ حکومت کی پالیسیوں پر ہی رہتی ہیں اور اس ہی لیئے تنقید کرنے والے اسے پچھلی حکومت کا تسلسل گردانتے ہیں۔ اب یہ تو کوئی ادیب یا دانشور ہی بتا سکتا ہے کہ کیا ایسی حکومت کو پچھلی حکومت کا سیکوئل (sequel) کہا جا سکتا ہے یا کچھ اور لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہماری جمہوری حکومت اکثر معاملات میں پچھلی حکومت کا پرتو نظر آتی ہے۔ اور تو اور وزرا بھی اپنے آپ کو پچھلے وزرا کا نعم البدل ثابت کرنے میں کوئی کثر نہیں چھوڑ رہے۔ ایک عام آدمی کی حیثیت سے ہمارا واسطہ وزرا سے صرف ٹاک شوز میں ہی پڑتا ہے اور ان کی کارکردگی ان کے بیانات کی ہی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ ویسے نظر نہیں آتی۔ قطع نظر جنس کے ہمارے وزرا اپنے بیانات کی روشنی میں پچھلے وزرا کی نمائندگی احسن طریقے سے نبھا رہے ہیں۔ کوئی غلط بیانی میں محمد علی درانی کی ترجمانی کر رہا/کر رہی ہے تو کوئی عظیم طارق بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب آپ کو شیر افگن، کشمائلہ، ہیراج، ملک قیوم، سمیرا ملک یا نیلوفر بختیار کے بیانات نئے کرداروں کے مونہہ سے سننے کو ملتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ پچھلے دور کا ہر کردار آج بھی موجود ہے۔ بس شکل بدل لی ہے۔ بلکہ کچھ نے تو جنس بھی بدل لی ہے۔ اگر پہلے کوئی وزیر گالی گلوچ سے کام لیتا تھا تو اب یہ کام کسی میڈم وزیر سے لیا جا رہا ہے۔ پچھلے دور

میں ایک خاتون شعلہ بیان تھی تو اب ایک سینیٹر شعلہ بیان مقرر کی حیثیت سے بلوایا جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ خاتون شعلہ بیانی زبان سے فرماتی تھیں اور چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی تھی جب کہ ان صاحب کے مونہہ، ناک اور کان سے دھواں نکلتا رہتا ہے۔ آنکھیں بھی شعلہ بار رہتیں ہیں۔ شعلہ بیانی یا بے دھیانی میں (اس کے مونہہ میں خاک) اپنے ممدوح کو ان لوگوں کے برابر لانے کی کوشش کرتا ہے جن کے پیروں کی خاک بھی ہم سب سے افضل ہے۔ مخالفین کو منافقین کہتا ہے اور گھما پھرا کر ثابت کرنا چاہتا ہے کہ قران میں جو آیات منافقین کے بارے میں اتریں تھی وہ ان منافقین کے بارے میں تھیں۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ کہ ہر واقعہ کو کھینچ تان کر کربلا تک لیجانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ کربلا سے منسوب رٹی رٹائی تقریر کر کے اپنی شعلہ بیانی کی دھاک بٹھا سکے۔ ہم بھی طالب علمی کے زمانے میں یہ ہی کرتے تھے۔ اپنی سپر ہٹ تقریر کا کوئی سپر ہٹ پیراگراف دہرانے کا ہر تقریر میں جواز پیدا کر لیتے اور پھر محفل لوٹنے میں کیا دیر لگتی۔

یہ تو تھی کرداروں کی حد تک حقیقت۔ اب پالیسیوں کی بھی سن لیجیے۔ اسٹیل مل ہو یا نجکاری۔ بینکاری ہو یا بے کاری۔ وہی تسلسل ہے۔ یہ ہی نہیں بلکہ نان اشوز کو اشو بنانے میں بھی وہی دم خم ہے۔ پچھلی حکومت عوام کا دھیان بٹانے کے لیئے یہ کرتی تھی۔ بلاوجہ کوئی اشو کھڑا کر دیا شور مچا۔ وقت گزرا تو پھر یوٹرن لے لیا۔ مخالفین کو برا بھلا کہا۔ کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا۔ قیمت قومی خزانے سے چکائی۔ اللہ اللہ خیر سلا!! اس کے لیئے پاسپورٹ فارم سے مذہب کا خانہ نکالنے اور اسلامی جمہوریہ کی بجائے صرف پاکستان لکھنے والی مثال کافی ہے ۔۔ظاہر ہے جمہوری حکومت کیونکر پیچھے رہ سکتی ہے اس لیئے اس نے بھی کئی یوٹرن (U-turn) لیئے اور کھائے پیئے بغیر (ہماری مراد گلاس ٹوٹنے والے واقعے تک ہے) گلاس کی قیمت قومی خزانے سے چکائی۔ آج کل پھر کچھ ایسی طغیانی آئی ہوئی ہے کہ قوم کا دھیان بٹانا ناگزیر ہے اس لیے ایک عدد نان اشو کا سہارا لیا گیا اور نزلہ حیدرآباد پر گرا۔ یہ اشو بھی اتنا اہم ٹھہرا جتنا صوبے کا نام تبدیل کرنا یا صوبوں کے بجٹ درست کرنا۔ ظاہر ہے ہر طرف شور و غوغا تھا۔ لوگ سڑکوں پر تھے کہ حیدرآباد کو پچھلی پوزیشن پر بحال کرو ورنہ قیامت آئی کہ آئی۔ اب ہمیں کچھ اور خدشات نے گھیر لیا ہے کیونکہ ایک صاحب کے والد کا انتقال ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے اور کہنے لگے 'والد کے مرنے کا غم نہیں۔ غم یہ ہے کہ ملک الموت نے گھر دیکھ لیا ہے'۔ ہمیں بھی یہ خدشہ ہے کہ اس کے

بعدنواب شاہ ڈسٹرکٹ،نوشہروفیروز ڈسٹرکٹ، لاڑکانہ ڈویژن وغیرہ کے علاوہ کراچی کے پانچ ڈسٹرکٹوں کو بھی پچھلی پوزیشنوں پر بحال کرنے کا سلسلہ نہ شروع ہوجائے۔ یہ بھی کچھ نہیں!! زیادہ خوف یہ ہے کہ کہیں کوئی جیالا کچھ آگے بڑھ کر بھارت کو ۱۹۴۷ کی پوزیشن پر بحال کرنے کا مطالبہ نہ کردے اور ساتھ ہی نعرہ لگادے"QUIT INDIA" یا "Divide and QUIT "۔ویسے ہماری حالت اس سکھ سے مختلف بھی نہیں جس کے بیٹے کو ہر سال فیل ہونے پر تیسری سے دوسری اور دوسری سے پہلی کلاس میں بھیجا گیا تو گھبرا گیا اور بیوی کو بھی ہوشیار کردیا کہ بیگم ہوشیار بیٹا الٹی چال چل رہا ہے۔

۱۰ مئی ۲۰۱۰ء

ذمہ داری

فلاں بلڈنگ پر دہشت گردوں کا حملہ۔۔طالبان نے ذمہ داری قبول کرلی۔۔جہاز اغوا۔۔فلاں گروپ نے ذمہ داری قبول کرلی۔لیڈر شہید۔۔القائدہ نے ذمہ داری قبول کرلی۔ایسے بیانات وقتاً فوقتاً نظروں سے گذرتے رہتے ہیں۔ہم سوچتے ہیں کہ ایسی وارداتوں کے بعد بتانا کیا ضروری ہوتا ہے۔اگر اس سے کوئی فائدہ ہوتا ہے تو پھر کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو ہر ایسی تنظیم یا گروپ ذمہ داری کیوں نہیں قبول کرلیتا۔ہمارے خیال سے ایسی کوئی سچویشن کبھی نہیں ابھری جس میں ایک سے زائد لوگوں نے ذمہ داری قبول کی ہو۔ہر بار کوئی ایک گروپ ہی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔اس کے بعد اس گروپ کے خلاف کریک ڈاؤن ہوتا ہے اور اس گروپ کے نام پر کچھ لوگ پکڑے جاتے ہیں۔اس آپریشن پر کوئی ردعمل نہیں ہوتا۔لگتا ہے یہ ہی تو وہ چاہتے تھے۔ذمہ داری قبول کرنے کا مقصد پورا ہوگیا۔آپریشن کا جواز پیدا ہوگیا اور کچھ لوگ پکڑے گئے۔یہ ہی 9/11 کے بعد ہوا۔عراق میں خطرناک ہتھیاروں کی موجودگی وجہ بنی اور لاکھوں جانوں کا ضیاع ہوا۔اب کس میں ہمت ہے کہ خطرناک ہتھیاروں کے بارے میں پوچھ سکے۔

ہر دہشت گردی کے واقعہ کے بعد پاکستان،افغانستان یا عراق کے کسی علاقے پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔اس کی کوئی مذمت نہیں کرتا۔طالبان، القائدہ، بیت اللہ، ملاعمر، یا اسامہ لادن بھی کچھ نہیں کہتے۔امریکہ میں 9/11 پر جو جانی نقصان ہوا سو ہوا اس کے بعد ایسے دہشت گردی کے واقعات صرف پاکستان کا مقدر بن کر رہ گے۔امریکہ یا یورپ میں بھی ہوئے لیکن نقصانات پاکستان میں ہونے والے نقصانات کا عشرعشیر بھی نہیں۔ہاں امریکی یا یورپی واقعات کے بعد پکڑ دھکڑ زیادہ ہوتی ہے اور خمیازہ بھی پاکستان کو ہی اٹھانا پڑتا ہے۔یورپ میں ہونے والے کسی واقعے کے نتیجے میں کبھی ویزا کا حصول مشکل ہوجاتا ہے۔کبھی امیگریشن قوانین سخت ہوجاتے ہیں تو کبھی تلاشی کے بہانے برہنگی مقدر ٹھہرتی ہے۔کچھ نہیں تو اسکارف پر پابندی تو ہے ہی۔ان باتوں سے ہمای تشویش جائز ہے کہ پھر کیوں ذمہ داری قبول کی جاتی ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں

ایسا تو نہیں کہ کرتا کوئی اور ہے اور قبولیت کسی اور کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہو۔کوئی آئی ڈینٹی فائینگ (Identifying) مشین بھی نہیں ہے کہ بتا دے کہ کس نے کیا ہے کیونکہ یہ ساری تنظیمیں رجسٹرڈ بھی نہیں ہیں۔کوئی بھی کہہ دے یہ میں نے کیا ہے تو حقیقت کیسے واضع ہوگی۔یہ تو ایسا ہی ہے کہ۔ع

جب کہہ کے ریاضؔ اس نے سر بزم پکارا
بن بن کے کئی لوگ میرے نام سے اٹھے

ہمیں تو خودکش حملوں پر بھی شک ہے۔کوئی ایک آدھ ہی ایسا پاگل ہوگا جو مرنے کے لیئے تیار ہو جائے۔آپ لاکھ برین واشنگ کرلیجیئے۔کوئی بم باندھنے کو تیار نہ ہوگا۔ہاں یہ ہوسکتا ہے اسے یہ بتایا ہی نہ جائے کہ جو جیکٹ پہنے کو دی جارہی ہے اس کی اہمیت کیا ہے۔سعادت حسن منٹو نے ایک افسانہ لکھا تھا جس میں ایک شخص نے یہ جاننے کے بعد کہ شہید ہونے والے جنت میں جائیں گے یہ نیک کام اپنے سر لے لیا کہ لوگوں کو شہادت کے درجے پر فائز کرائے۔بہت کوشش کرتا ہے لیکن شہید ہونے کے لیے کوئی راضی نہیں ہوا۔حتیٰ کہ بوڑھے سے بوڑھا،قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا بھی راضی نہ ہوا۔بیمار سے بیمار، جان سے بیزار بھی شہید ہونے پر تیار نہ تھا۔بالآخر اس نے ایسی بلڈنگ اور ایسے پل بنائے جو باآسانی گر جاتے اور سینکڑوں کو بغیر بتائے جام شہادت نوش کروا دیتے تھے۔ہمیں تو یہاں بھی ایسا ہی لگتا ہے۔کسی ہیروئن چی کو ہیروئن کا لالچ دیا اور کہہ دیا یہ پیکٹ فلاں کو دے آؤ۔ادھر یہ چلا ادھر ریموٹ پکڑ لیا اور مناسب وقت اور جگہ دیکھ کر اڑا دیا۔خودکش حملے سے تفتیش کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔بس ایک عدد سر کی ضرورت رہتی ہے۔جیسے ہی پولس کو سر ملنے کی خوشی نصیب ہوئی۔اسکا میک اپ وغیرہ کیا اور فوٹو شائع کرادیا۔آج تک تو کوئی دعویدار آیا نہیں۔ایسے ہیروئن چیوں کو سردیوں میں کوئی جیکٹ مفت مل جائے تو بخوشی پہن کر کہیں بھی جانے کو تیار ہو جائیں گے۔اس کے بعد ایک فون کال کہ یہ کام ہمارا تھا۔کیوں تھا؟ کس لیئے تھا۔یہ نہیں بتایا جائیگا۔ارے بھئی کوئی مطالبہ یا کوئی دھمکی کہ ہمارا مطالبہ نہیں مانا گیا تو ایسی وارداتوں کے لیئے تیار رہو۔بغض امریکہ سے ہے مار پاکستانیوں کو رہے ہیں۔ایسے ہر حملے کے بعد ذمہ داری قبول کرنے والا مطالبہ کرے یا نہ کرے۔امریکہ ضرور کرتا ہے۔''ڈومور'' یا ''فلاں جگہ آپریشن ضروری ہے''۔ارے بم پاکستان میں پھٹا ہے مرنے والے مسلمان

ہیں۔مارنے والے خدا جانے کون ہیں۔مروڑ امریکہ کو اٹھ رہا ہے۔ہمارے دانشور بھی اپنے کانوں کو ہاتھ نہیں لگا رہے، کوّے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں' یہ کیسے مسلمان ہیں؟ اپنوں کو مار رہے ہیں'۔یہ مسلمان نہیں ہو سکتے'۔ارے یہ کیوں نہیں کہتے یہ را، موساد یا سی آئی اے کا کیا دھرا ہے۔کسی کو بھی طالبان یا القائدہ کہا جاسکتا ہے۔کیا ایسی کسی فون کال پر یقین کرلیا جائے گا جس میں دعویٰ ہو کہ یہ کام جارج بش نے کیا ہے۔اب تو ایسی وڈیو بھی موصول ہوسکتی ہے جس میں جارج بش کو یہ کہتے ہوئے بتایا جاسکتا ہے۔ہماری نظر میں ذمہ داری قبول کرنا نری بکواس ہے۔لغو ہے۔اتنی لمبی چوڑی تمہید ہم نے اس لیئے باندھی ہے کہ حال ہی میں ایک نیا ڈرامہ بہ عنوان فیصل شہزاد شروع ہوا ہے۔فیصل شہزاد نامی ایک شخص دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ہوا۔واقعہ امریکہ کا ہے۔فیصل امریکن ہے لیکن رپورٹ ہو رہا ہے پاکستانی نژاد امریکن کے نام سے۔عجیب نہیں لگ رہا ؟ہاں اگر کوئی ایسی رپورٹ آجائے جس میں کہا گیا ہو کہ' کینیا نژاد امریکن اوباما' نے صدارت کا حلف اٹھا لیا تو بہت ہی عجیب لگے گا۔اس ہی لیئے ایسی رپورٹ نہیں آتی۔ہم نے فیصل شہزاد کے واقعے کو ڈرامہ لکھا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یکم مئی کو نیویارک میں ٹائم اسکوئر کے سامنے ایک مشکوک گاڑی رپورٹ ہوئی۔چند منٹوں میں گاڑی میں بم دریافت ہوا اور ناکارہ بھی بنا دیا گیا۔کیمروں کی مدد سے گاڑی کے مالک کا پتہ چل گیا اور میڈیا پر تشہیر ہوتے ہی ایک نوجوان پکڑا گیا جو دبئی جانے کے لیئے فرار ہو رہا تھا۔معلوم ہوا وہ امریکن تو ہے لیکن پاکستانی نژاد!!اگلے جھٹکے میں فیصل نے اعتراف جرم بھی کرلیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس نے پاکستانی قبائلی علاقے جنوبی وزیرستان سے تربیت حاصل کی ہے۔ثابت ہوتا ہے کہ اس نے واقعی وزیرستان میں تربیت حاصل کی تھی اس ہی لیئے ناکام رہا۔بم پھٹا نہیں۔خود گرفتار ہوا، اور فوراً اعتراف بھی کرلیا۔اگر امریکن C.I.A سینٹر میں تربیت لیتا تو 9/11 کی طرح ہسٹری میں 5/1 (یکم مئی) اور ٹائم اسکوائر دونوں جگہ بنا لیتے۔اس ہی اثنا میں حکیم اللہ محسود نے ایک وڈیو کے ذریعے ذمہ داری قبول کر لی اور انکشاف کیا کہ ایسے اور لوگ بھی ہیں جو آئندہ ایسی وارداتیں کریں گے۔اب امریکیوں کو موقع مل گیا اور پاکستانی نژاد امریکیوں کے لیئے پریشان کن لمحات کا آغاز ہوگیا۔امریکیوں نے پاکستان کے خلاف زہر اگلنا شروع کردیا۔ہماری حکومت میں یہ دم نہیں کہ کہہ سکے اب یہ ڈرامہ نہیں چلے گا۔امریکی اتنے ہوشیار کیسے ہوگئے کہ منٹوں میں فیصل شہزاد

گرفتار بھی ہوا اور وزیرستاں کا نام بھی لے لیا۔

ہمارے خیال میں اس بار کا ڈرامہ پاکستانی نژاد امریکیوں کے لیے ہے۔ آناً فاناً سب کچھ ہو گیا۔ پاکستانی طالبان نے ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ اب جنوبی وزیرستان میں ڈومور کے مطالبے کو کون رد کرے گا۔ شائد کچھ دانشوروں کو اسے ڈرامہ ماننے میں تامل ہو تو ان کے لیئے ایک اور واقعے کی تمثیل پیش خدمت ہے۔ مقام لال مسجد۔ فوجی محاصرہ محصورین طالب علم و طالبات۔ تعداد ہزاروں میں۔ فوجی ایکشن کی وجہ اسلامی نظام کے نفاظ کا مطالبہ۔ اس ڈرامے کا آغاز ایک جگت آنٹی کے اغوا سے ہوا۔ اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے والوں کی نظر میں اس آنٹی کے ختم ہونے اور دو چار وڈیو شاپس کے بند ہونے سے تمام برائیوں کا خاتمہ لازمی تھا۔ اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے والوں نے عوام کو متحرک کرنا ضروری نہ سمجھا اس لیئے کوئی راہ بھی ہموار نہیں کی گئی۔ اسکرپٹ مضبوط نہ تھا۔ لیکن جلدی بہت تھی۔ لال مسجد کے مولانا رشید سے مذاکرات جاری تھے۔ کیونکہ مولانا کے بڑے بھائی مولانا عزیز خود ٹی وی پر نہیں آتے تھے۔ معاملہ طول پکڑنے لگا تو گمان گذرا کہ کہیں مذاکرات کامیاب نہ ہو جائیں۔ اور اس ڈرامے کا مقصد ہی نہ فوت ہو جائے۔ اس لیئے ایک اہم اور بڑے فوجی افسر شہید کر دیئے گئے اور آپریشن کا جواز پیدا کر لیا گیا۔ ڈرامے کو کلائمکس پر پہنچانے کے لیئے اعلان ہوا کہ جو خواتین باہر آنا چاہتی ہیں ان کو تحفظ دیا جائے گا۔ اب ہزاروں طلبا و طالبات میں سب ہی تو ریڈیکل (Radical) نہیں ہوتے۔ انخلا شروع ہوا۔ اب ڈرامے میں ایک ٹرننگ پوائنٹ بھی ضروری تھا اس لیئے اغلب ہے کہ مولانا عزیز سے بالمشافہ مذاکرات کی بات ہوئی ہوگی۔ راضی ہونے پر پیشکش ہوئی ہوگی کہ آپ باہر آجائیں طریقہ کار یہ ہوگا کہ آپ برقعہ استعمال کریں اور نکل آئیں تاکہ کسی کو خبر ہی نہ ہو کہ آپ سے مذاکرات ہو رہے ہیں دنیا کو دکھانے کے لیئے مولانا رشید سے بات چیت جاری رہے گی۔ مولان ٹریپ ہوئے اور برقعے میں مونہہ دکھانے کے قابل نہیں رہے لیکن اب تک جو ٹی وی پر نہ دکھائی دیے تھے اب اس طرح جلوہ گر ہوئے کہ نقاب اتری ہوئی لیکن سارا جسم برقعے میں ملفوف۔ اینلائٹنڈ اسلام کے حامیوں نے ایک برگذیدہ شخصیت کی جس طرح تذلیل کی شائد کوئی کافر بھی نہیں کرے گا۔ اینٹی کلائمکس (Anti Climax) کے بعد جب لوگ محو حیرت تھے، خواہشات کی تکمیل ہو گئی اور ہزاروں اساتذہ و طالبات کا سرمہ بنا

دیا گیا۔ مولانا کے فرار کو ناکام بنانا اپنے سپاہیوں کی مہارت ٹھہری۔ مولانا کے طرفدار شش و پنج میں پڑ گئے اور ان سے ہمدردی کا گراف بھی نیچے آ گیا۔ ایسے ڈرامے ہوتے رہتے ہیں جو کسی حصول مقصد کے لیئے اسٹیج کیئے جاتے ہیں۔ ان مقاصد میں کسی پلاٹ کو خالی کرانا۔ کسی بڑے آپریشن کے لیئے جواز پیدا کرنا۔ کسی بڑی طاقت کو خوش کرنا تو ہوتا ہی ہے لیکن کبھی کبھی حصول زر بھی ہوتا ہے۔ سیکیورٹی کے نام پر قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں کا سودا بھی وجہ بنتی ہے۔ ورنہ کیا حکومت کے لیئے مسنگ پرسن (Missing Persons) کا پتہ لگانا مشکل کام ہے۔ ارے ساری جیلوں، ساری ایجنسیوں میں سرچ آپریشن کیا مشکل ہے۔ دو دن میں پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ پاکستان میں ہیں یا باہر۔ باہر جانے والی ہر چیز کا رکارڈ ہوتا ہے۔ لین دین کے بھی کچھ ضابطے ہوتے ہیں۔ اگر اس وقت کے سربراہ کا بازو مروڑا جائے تو سب کچھ اگل دے گا۔ ایک ڈرامہ محسن پاکستان کے ساتھ بھی کھیلا گیا تھا۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ ایٹمی سینٹری فیوج وغیرہ ڈاکٹر صاحب نے کتنے میں بیچے تھے۔ لاکھوں میں تو ہو نہیں سکتے۔ اربوں میں ہونگے، تو رقم کہاں ہے۔ وہ سلیمانی ٹوپی کہاں ہے جس کو پہن کر وہ (C-130) استعمال کرتے رہے تھے اور بالفرض وہ فوجی جہاز استعمال کرتے رہے تھے تو اس وقت کے آرمی چیف کا اس غفلت پر کورٹ مارشل کیوں نہیں۔ اس ڈرامے کے اسکرپٹ رائٹر کو داد دینا چاہیئے کہ اس نے اسکرپٹ اس طرح لکھا کہ ڈاکٹر صاحب بھی ٹریپ ہوئے اور ذمہ داری قبول کر لی۔

۱۷ مئی ۲۰۱۰ء

نیوجرسی سے لندن کا مسافر

بھلا کس کو جانوں برا کس کو مانوں۔سمجھ سے باہر ہے۔میڈیا اڈوانس ہی نہیں آزاد بھی ہے۔انفارمیشن ٹیکنولاجی ہر ایک کی دہلیز پر بیٹھی ہے انفارمیشن ہی نہیں ڈس انفارمیشن کا بھی بول بالا ہے۔کہتے ہیں زیادہ مٹھاس بھی کڑواہٹ میں تبدیل ہوجاتی ہے اس ہی لیے حد سے بڑھی ہوئی معلومات نقصان دہ ثابت ہورہی ہے۔جھوٹ اور سچ آپس میں اتنے مدغم ہیں کہ الگ کرنا دشوار ہے۔جھوٹ کہاں ختم ہوتا ہے اور سچ کہاں سے شروع ہوتا ہے پتہ ہی نہیں چلتا۔ٹاک شوز بھی کنفیوژن پھیلانے میں پیش پیش ہیں۔ہم سننے والے جو جاننا چاہتے ہیں وہ سوال کیا ہی نہیں جاتا۔تازہ مثال آج ایک بریکنگ نیوز کی ہے جو تقریباً ایک گھنٹے سے آن ائیر تھی۔جس میں بتایا جارہا تھا کہ نیوجرسی سے لندن جانے والے جہاز میں بم کی اطلاع کی وجہ سے جہاز کو روک لیا گیا ہے۔جہاز میں پاکستان کا سابق غیر جمہوری صدر بھی سوار ہے۔پوری خبر میں یہ واضع نہیں کہ بم کی اطلاع ملنے کے ذرائع کیا تھے۔بتایا گیا کہ ایک مسافر بالکل آخر لمحات میں آیا وہ بھی کیش ٹکٹ لیکر جسے شبہے میں گرفتار کرلیا گیا۔اب اس سے بم کی موجودگی کی اطلاع کیسے ہوئی۔یہ کوئی نہیں بتا رہا۔کیا کوئی فون کال تھی۔کسی کا مشکوک ہونا اور بات ہے اور بم کی اطلاع ملنا بالکل ہی دوسری بات! ہم گھنٹے بھر سے منتظر تھے کہ یہ نیوز بریک ہو کہ بم کی اطلاع کا سورس (source) کیا ہے لیکن یہ ہی خبر بار بار دہرائی جاتی رہی کہ ''جہاز میں بم کی اطلاع''۔جب صورت حال یہ ہو تو کیا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔اس لیئے ہمارا خیال ہے کہ بجائے اپنا تبصرہ پیش کرنے کے چند ملتے جلتے واقعات دہرادیئے جائیں تاکہ قارئین خود ہی دو اور دو چار کرلیں۔اس کے لیئے ہم کچھ واقعات کی طرف توجہ مبذول کرانے کے علاوہ ایک آدھ لطیفے کا بھی سہارا لینگے جس سے ایک عام قاری کو نتیجہ اخذ کرنے میں آسانی ہوگی۔لطیفہ یہ ہے کہ ریلوے کے افسران کی میٹنگ میں مسئلہ درپیش تھا کہ ٹرین کی

آخری بوگی میں جھٹکے زیادہ لگتے ہیں۔اس کا حل یہ نکالا گیا کہ آئندہ ٹرینوں میں آخری بوگی ہی نہ لگائی جائے۔نہ آخری بوگی ہوگی نہ جھٹکے لگیں گے۔واقعہ ہے۔مبینہ دہشت گرفیصل شہزاد اس وجہ سے پکڑا گیا کہ اس نے آخری لمحات میں کیش پر ٹکٹ خریدا اور وہ بھی یک طرفہ۔اس وجہ سے شبہ ہوا اور دھرلیا گیا۔اس ہی کو مثال یا (precedent) بناتے ہوئے ایک مسافر کو نیوجرسی سے لندن جانے والی فلائٹ، جس پر پرویز مشرف بھی سوار تھا، سے گرفتار کرلیا گیا کیونکہ موصوف نے بھی آخری لمحات میں یکطرفہ ٹکٹ اور وہ بھی کیش پر خریدا تھا۔اب تمام ہوئی اڈوں کے لیئے لازمی قرار دیدیا جانا چاہیئے کہ آئندہ سے ہر آخری لمحات میں بکنگ کروانے والے یا یکطرفہ ٹکٹ یا کیش پر ٹکٹ لینے والے کو گرفتا کرلیا جائے۔اس صورت میں ہمارے لیئے مسئلہ ہوسکتا ہے کیونکہ ہم نے اب تک کریڈٹ کارڈ نہیں بنوایا اور سارا لین دین کیش کرتے ہیں۔ان کے لیئے بھی مسئلہ ہوسکتا ہے جنہیں ایمرجنسی میں مثلاً کسی تدفین میں شرکت کے لیئے آخری لمحات میں جہاز سے سفر کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور جو بچت کی خاطر واپسی ٹرین یا فیری سے کرنا چاہتے ہیں (عموماً لندن، پیرس یا ڈبلن کے باسی ایسا ہی کرتے ہیں)۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لیئے بھی کچھ اقدامت ناگزیر ہوتے ہیں۔جیسے کہ:۔۔

(الف)۔پرویز مشرف پر حملہ۔دو اہلکار کام آئے۔موصوف بچ گئے۔آئندہ کے لیئے سیکیوریٹی بڑھادی گئی۔نئی بلٹ پروف گاڑیوں کا آرڈر پلیس کردیا گیا۔

(ب) شوکت عزیز پر حملہ دو تین اہلکار مارے گئے۔خود بچ گئے۔شوکت عزیز کی سیکیوریٹی ٹائٹ کردی گئی۔لیجئے VVIP موومنٹ پر ٹریفک گھنٹوں بند رکھنے کا جواز پیدا ہوگیا۔

(ج) ایک غیر اہم وزیر پر حملہ ہوا اور وہ وزیر اہم ہوگیا۔ایک خودکش بمبار وزیر کے گھر کے دراوزے پر کھڑے دو تین سپاہیوں کو شہید کرکے خود جہنم واصل ہوا۔جان ہتھیلی پر لے کر نکلا لیکن وزیر موصوف کے باہر آنے کا انتظار نہ کرسکا۔وقت کی تنگی نے اسے صرف سپاہیوں کی جان لینے پر اکتفا کرنے پر مجبور کردیا۔وزیر موصوف بچ گئے اور بلٹ پروف کار کا مطالبہ کردیا۔کار ملی یا نہیں۔اہمیت مل گئی۔

(د) ایک سابق وزیر الیکشن ہارنے کے بعد ضمنی الیکشن میں کھڑے ہوئے۔مقبولیت کا گراف گر رہا تھا کہ

موصوف پر حملہ ہوگیا۔موصوف کے دھوکے میں دوسرے مارے گئے انہیں خراش بھی نہیں آئی۔یہ سمجھے تھے کہ بی بی کی شہادت پی پی کو جتا سکتی ہے تو مجھ پر حملہ بھی معاون ثابت ہوگا لیکن اسکرپٹ بھونڈا تھا۔ڈرامہ فلاپ ہوا۔اب ان واقعات کے تناظر میں سوچئے کہ پرویز مشرف کی سیکیوریٹی ختم کرنے کی باتیں ہونگی تو پھر جس جہاز میں وہ سوار ہوگا اس میں ایساڈرامہ تو ہوگا ہی۔ہوسکتا ہے اب امریکہ اور پاکستان مل کر اسے بلٹ پروف جہاز دے دیں تا کہ وہ بلاخوف بیچے گئے پاکستانیوں کی قیمت بصورت لیکچر فیس وصول کرتا پھرے۔

۲۶ مئی ۲۰۱۰ء

مجرم ٹرین

کہتے ہیں کہ مجرم کو سزا دے دی جائے اور وہ بھی بروقت تو دوسروں کو کان ہو جاتے ہیں۔یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہوتا۔اگر ہوتا تو اب تک جرائم ختم ہو چکے ہوتے۔پولس، تھانہ، کورٹ کچہری ختم ہو چکے ہوتے۔شائد لاء (LAW) کا لجز کی ضرورت بھی نہ رہتی۔اس ہی طرح اگر غلطیوں پر خود احتسابی کے تحت محکمے کے سربراہ اور وزارت کے وزیر/مشیر کے مستعفی ہونے کی روائت عام ہو جاتی تو خالی آسامیاں زیادہ ہوتیں اور امیدوار کم۔وزیروں کے استعفے، ضمنی انتخابات کا باعث بنتے اور ملک میں روزانہ کہیں نہ کہیں انتخابات ہو رہے ہوتے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوتا۔مثالیں ہیں کہ اگر ریل کا حادثہ ہو جائے تو دوسرے ممالک میں وزیر مستعفی ہو جاتا ہے۔ہمارے یہاں ریلیں ٹکراتی بھی ہیں اور پٹری سے بھی اتر جاتی ہیں لیکن وزیر شیخ رشید ہو یا جنرل جاوید قاضی، یا بلور یہ حماقت نہیں کرتے کہ اس میں ان کا کیا دوش۔ہاں ایک آدھ مثال ملتی بھی ہے تو شاید استعفاء پیش کرنے والے ایسا اس یقین دہانی کے بعد ہی کرتے ہیں کہ ان کا استعفاء نامنظور ہو جائے گا۔مثلاً پچھلی حکومت میں ڈاکٹر نسیم اشرف کا استعفاء بوجہ خراب کارکردگی ء کرکٹ ٹیم۔ موجودہ دور میں بھی ایک دو مثالیں ملتی ہیں جن میں وزیر مشیر قسم کے لوگوں کو استعفاء واپس لینے پر بمشکل راضی کیا گیا۔یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ حکومت کو اس کے لیئے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہونگے تب جا کر استعفاء واپس لیا ہوگا۔بہر حال ہر دو صورتوں میں یعنی استعفاء دیا ہی نہ جائے یا دیا جائے مگر منظور نہ ہو، جگ ہنسائی تو ہوتی ہے۔اس لیئے اس سلسے میں کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ہمارے ارباب اقتدار نے حل تلاش کر لیا ہے۔اب کسی وزیر، مشیر یا سربراہ محکمہ جات کو شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی اور نہ ہی میڈیا کو انگلی اٹھانے کا موقع ملے گا نہ ہی جگ ہنسائی ہوگی۔ہمیں کیا کسی کو بھی اس کی خبر نہ ہوتی۔وہ تو بھلا ہو کہ محکمہ ریلوے کا، جس نے اوپر تلے ٹرینوں کو بند کرنا شروع کر دیا۔اس پر لے دے ہوئی تو پہلے پہل یہ جواز بتایا گیا کہ چند ٹرینوں

کے بند کرنے سے ڈیڑھ ارب کا خسارہ پورا ہو جائیگا۔اس پر شور ہوا کہ اگر چند ٹرینوں کے بند کرنے سے اتنا فائدہ ہے تو ساری ٹرینیں بند کرنے سے کیا کیا فوائد نہ ہونگے اور پھر اس فارمولے کے تحت اگر پورا محکمہ ہی بند کر دیا جائے تو کیا ہم آئی۔ایم۔ایف کی غلامی سے نہ نکل آئیں گے۔اس بے جا تنقید نے ارباب اقتدار کو سوچنے پر مجبور کر دیا اور پھر اس نے فول پروف حل تلاش کر لیا اس کے لیئے جو اصول اپنایا گیا ہے وہ اس محاورے کی غمازی کرتا ہے کہ 'سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے' ویسے ہمارا خیال ہے کہ اس میں ''قربانی کا بکرا'' یا"Escape Goat " کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ان دونوں محاروں میں ایک بات تو مشترکہ (common) ہے کہ کسی انسان کا ذکر نہیں۔یہ ہم اس لیئے کہہ رہے ہیں کہ آج محکمہء ریلوے کے جنرل مینیجر نے شالیمار ایکسپریس بند کرنے کی نوید سناتے ہوئے بتایا ہے کہ شالیمار ایکسپریس اپنا مقصد کھو چکی تھی اور بارہ بارہ گھنٹے لیٹ پہنچ رہی تھی اس لیئے اسے جمعرات سے بند کر دیا گیا ہے۔دیکھا آپ نے!۔ایسی ملعون ٹرین کے ساتھ یہ ہی ہونا تھا جو بارہ بارہ گھنٹے لیٹ پہنچتی تھی۔اب ایسی کارکردگی پر کوئی انسان کیسے استعفاء دے سکتا ہے۔قصور ٹرین کا۔تو ہم کیوں بھگتیں؟۔اگر اس ٹرین کو گربہ کشتن روز اول کے تحت بہت پہلے بند کر دیا گیا ہوتا تو قراقرم۔چلتن،عباس ایکسپریس کے علاوہ دیگر ٹرینوں کے بھی کان ہوتے اور وہ سب آج بھی پٹری پر چل رہی ہوتیں۔اب اگر ایک آدھ ٹرین کو پٹری سے اترنے پر پہیئے توڑنے کی سزا سنا دی جائے تو پٹری سے اترنے کا سلسلہ بھی بند ہو سکتا ہے۔مزید یہ کہ ٹرینوں کے ٹکرانے کی صورت میں پھانسی سے ملتی جلتی کوئی سخت سزا تجویز کر دی جائے تو ریلوے کا سفر محفوظ ترین ہو سکتا ہے۔

ہماری تجویز ہے کہ دوسرے محکموں مثلاً فضائی یا زمینی ٹرانسپورٹس کو بھی ریلوے سے سبق سیکھنا چاہیے لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔بارہ گھنٹے لیٹ آنے پر بندش کی سزا کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری حکومت کو قانون سازی کرنی پڑے گی کیونکہ فضائی حادثے میں جہاز کے تباہ ہونے یا ٹرینوں کے ٹکرانے کے بعد تباہ ہونے کی صورت میں سزا کیا ہوگی کیونکہ انسانوں کے لیئے تو کہا جاتا ہے کہ سزا خودکشی میں ناکام ہونے والے کو ملتی ہے۔تباہ ہونے کے بعد کسے سزا دی جائے گی۔ہاں ٹکرانے میں ناکامی کی بات اور ہوگی۔

یہاں ہم ان بدخواہوں کا بھی ذکر کریں گے جو ٹرینوں کی بندش پر کہہ رہے ہیں کہ یہ بسوں کے مالکان کو فائدہ

پہنچانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔پہلے ٹرینوں کا ٹائم ٹیبل ایسا بناتے تھے کہ لوگ بس پر جانے پر مجبور ہو جاتے تھے ۔سروس اتنی بری دیتے تھے کہ لوگ بسوں کو بہتر سمجھنے لگے۔اب ٹرینیں ہی بند کی جا رہی ہیں۔ہمیں اس سے اختلاف ہے کیونکہ ہماری ریلوے کے کرتا دھرتا اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتے کہ سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کو ہی ذبح کر دیں۔۔

۳۰ جولائی ۲۰۱۰ء

بلیک باکس

ہماری زندگی میں ۶۵ بہاریں اور اتنی ہی خزائیں آئیں لیکن ہم نے محسوس اس تعداد سے کہیں کم کی ہیں کیونکہ زندگی کی شروعات میں ہم ناسمجھ تھے۔ہم نے اس دوران کئی فضائی حادثات کی خبریں بھی سنیں لیکن جہاز کے بلیک باکس کے ملنے کی کبھی کوئی خبر نہیں سنی۔ہوسکتا ہے کبھی ملا بھی ہو لیکن خبر نہیں ملی۔ہم جب یہ کہہ رہے ہیں تو ہمارا روئے سخن غیر فوجی واقعات کی طرف ہے۔یہاں یہ واضع کرنا ضروری ہے کہ جنرل ضیا الحق کے حادثے کو ہم غیر فوجی ہی سمجھتے ہیں۔سنا ہے کہ طیاروں کی تباہی کے بعد اس کے پر، دم اور دم میں موجود بلیک باکس محفوظ رہتے ہیں۔ واللہ عالم!! اب 'استثنا' بھی ایک حقیقت ہے جسے انگریزی میں ایکسپشنز آر آلویز دیر (Exceptions are always there) کہتے ہیں اور اس بات کو 9/11 پر پینٹاگون سے ٹکرانے والے طیارے کے پروں، دُم اور پورے ملبے نے ہوا میں تحلیل ہوکر ثابت کردیا۔خیر 9/11 کی تو ہر بات میں ہی ' exception ' نمایاں تھے اس لیئے ان کا ذکر فضول ہے لیکن یہ سچ ہے کہ پاکستان میں گرنے والے کسی بھی جہاز کے بلیک باکس کے ملنے کی اطلاع کم از کم ہمیں تو نہیں ملی۔

ہاں یہ دعوے ضرور رہے کہ بلیک باکس کے ملتے ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔سب معلوم ہو جائیگا کہ حادثہ کیوں کر ہوا، کیسے ہوا، غلطی کس کی تھی؟ لیکن۔نہ کبھی بلیک باکس ملا نہ راز کھلا۔رکارڈ درست رکھنے کے لیئے ہم کہہ سکتے ہیں ہوسکتا ہے بلیک باکس ملا بھی ہو لیکن تحقیقات کے نتائج سامنے نہیں آئے۔بلیک باکس نہ ملنے پر جتنے مونہہ اتنی باتیں۔کوئی کہتا ہے کہ خود غائب کردیتے ہیں تاکہ پردہ نشیں بے پردہ نہ ہوں۔کچھ سمجھتے ہیں کہ انہیں جو معلوم کرنا ہوتا ہے کر لیتے ہیں۔عوام سے کیا مطلب؟ اس لیئے عوام کے لیئے بلیک باکس گمشدہ ہی رہتا ہے۔کچھ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ انشورنس کے چکر ہیں۔اکثر و بیشتر امریکی کہانیوں میں ہم نے بھی پڑھا ہے کہ شوہر نے اپنی بیوی کی زندگی کا بیمہ کروایا اور پھر کچھ ہی عرصے بعد بیوی کسی حادثے کا شکار ہوگئی۔شوہر نے بیمے کی رقم وصول کی لیکن خرچ کرنے کی نوبت نہ آئی کیونکہ سراغ رسانوں نے معلوم کرلیا کہ

بیوی کی موت کا سبب قدرتی حادثہ نہیں بلکہ قتل عمد تھا۔حالانکہ بیوی کے ساتھ کوئی بلیک باکس بھی نہیں لگا ہوتا۔ہوسکتا ہے یہ ہی وجہ ہوتی ہو۔سراغرساں بلیک باکس کے چکر میں پڑنے کے بجائے اپنی توجہ تحقیقات پر رکھتے ہوں۔جہاز کے حادثے کی طرح نہیں کہ بلیک باکس پر انحصار کیئے بیٹھے رہتے ہیں۔پہلے کی بات اور تھی۔لوگوں کو بلیک باکس کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہ تھا۔میڈیا بلکہ الیکٹرک میڈیا اتنا فعال نہ تھا کہ ایک ہی خبر کے کلپس اتنی بار دکھاتا ہے کہ حفظ ہو جاتے ہیں۔کبھی کبھی تو اکتاہٹ ہونے لگتی۔میڈیا کے ارباب اختیار شائد دکھاتے ہیں خود نہیں دیکھتے کیونکہ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ ناظرین پر کیا گزرتی ہے، جب خبریں چل رہی ہوتی ہیں اور ایک حاشیے میں 'دوسری طرف ' کے عنوان سے کسی کی پریس کانفرنس کی گونگی فلم چل رہی ہوتی ہے۔سونے پر سہاگہ کہ نیچے ایک پٹی بھی چل رہی ہوتی ہے جس پر کسی خبر کا ٹوٹا مسلسل ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا ہوتا ہے۔اس ٹوٹے سے اصل خبر کا پتہ ہی نہیں چلتا۔مثلاً پچھلے دنوں یہ سلائڈ تیس سے چالیس بار پڑھی کہ ''جاوید ہاشمی کو وزیر اعلیٰ کے ہیلی کاپٹر میں لاہور لے جایا گیا'' لیکن یہ پتہ نہیں چلا کہ کیوں؟۔اللہ اللہ کر کے کافی دیر بعد بقیہ خبر ریلیز ہوئی تو معلوم ہوا کہ برین ہیمریج ہوا ہے۔خیر میڈیا کا رونا پھر کبھی! اس وقت تو یہ بتانا مقصود ہے کہ مارگلہ سے ٹکرانے والے جہاز کے بلیک باکس کے ساتھ بھی یہ ہوا کہ مختلف خبریں آتی رہیں۔کبھی کہا کہ بلیک باکس مل گیا تو کبھی اطلاع ملی کہ نہیں ملا۔پھر خبر آئی کہ مل گیا اور بڑی حفاظت کے ساتھ لے جایا گیا۔ابھی اس برآمدگی پر خوش ہونے بھی نہ پائے تھے کہ وزرا کے بیانات آئے کہ ابھی نہیں ملا۔سوال پیدا ہوا کہ پھر وہ کیا چیز تھی جو بحفاظت تمام لے جائی گئی تھی۔اس ملنے نہ ملنے کی وجہ ہماری جو سمجھ میں آتی ہے وہ اس بلیک باکس کا رنگ ہوسکتا۔جس پر کسی نے توجہ نہیں دی۔تلاش کرنے والے کسی سیاہ ڈبے کے متلاشی ہوتے ہیں اور ڈھونڈھ نہیں پاتے۔یہ ہم اس لیئے کہہ رہے ہیں کہ پچھلے دنوں ہمارا واسطہ ایسے پندرہ سوالوں سے پڑا جن کے بارے میں دعویٰ تھا کہ کوئی بھی چار صحیح جواب نہیں دے سکتا۔واقعی سوالات ایسے ہی تھے۔مثلاً مشہور سو سالہ جنگ کتنے سال چلی تھیں (جواب سو سال نہیں ہے) یا پنامہ ہیٹ کہاں بنتے ہیں (جواب پنامہ نہیں) یا کیٹ گٹس کس سے بنتے ہیں (اب یہاں بھی جواب بلی "CAT " نہیں) تو ظاہر ہے اس سوال کا کہ بلیک باکس کس رنگ کا ہوتا ہے جواب 'بلیک' تو ہو نہیں سکتا۔اس ہی لیئے یار لوگ بلیک ڈبہ ڈھونڈھتے رہ

جاتے ہیں اور ہم تحقیقات کے نتائج سے محروم رہتے ہیں۔قاہرہ میں گرنے والا پی آئی اے کا جمبو ہو یا پاکستان میں گرنے والے فوکر یا ضیا الحق کا C-130۔آج تک ان کے گرنے کی وجوہات سامنے نہیں آئیں۔ہمارا مشورہ ہے کہ بلیک باکس کے رنگ کے بارے میں کنفیوژن دور ہونا چاہیئے۔شاید اس سے تلاش میں آسانی ہو جائے اور لوگ اندھیرے میں سیاہ بکس کی بجائے رنگین بکس کو ڈھونڈھنے میں کامیاب ہو سکیں۔قارئین ہم یہاں تک ہی لکھ پائے تھے کہ انہونی ہوگئی۔ابھی ابھی اطلاع ملی کہ بلیک باکس مل گیا ہے۔ساتھ میں یہ مژدہ بھی کہ بلیک باکس فرانس جائے گا اور تحقیقات وہیں ہونگی اور یہ پیش بندی بھی کر دی گئی کہ بلیک باکس کو کوئی نقصان نہ پہنچا ہوگا تو اس ہی صورت میں اس سے استفادہ کیا جا سکے گا۔ورنہ۔۔ایسا تو ہوتا ہی ہے۔قارئین اگر واقعی باکس مل گیا ہے تو استدعا ہے کہ اس کالم کو نظر انداز کرتے ہوئے نذرِ آتش کر دیا جائے۔۔۔شکریہ

۳۱ جولائی ۲۰۱۰ء

ادارے کا اس کالم سے متفق ہونا ضروری نہیں

ہم شاید ساتویں یا آٹھویں کلاس میں پڑھتے تھے۔ یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔دور وہ تھا جسے آج کے دور کے لوگ یاد کرتے ہیں کہ بھئی' کیا دور تھا'۔یعنی اچھا دور تھا۔ہم اسکول سے لوٹ رہے تھے۔ایک بھرے پرے بازار سے گزرتے ہوئے ہمارے کانوں میں بچاؤ بچاؤ کی چیخیں گونجیں۔چیخوں کی سمت نظریں اٹھیں تو دیکھا ایک اسکول کی طالبہ کو تین چار لوگ ایک کار میں دھکیل رہے ہیں۔لڑکی اچھل کود رہی تھی۔ہم اس وقت ویسے نہیں تھے جیسے تین چار سال بعد ہو گئے تھے۔کاش ہم اس وقت ویسے ہو چکے ہوتے۔اگر ہو گئے ہوتے تو یہ واقعہ سنانے کی نوبت ہی نہ آتی یا ہم سنانے کے لیئے زندہ ہی نہ ہوتے۔قصہ مختصر یہ کہ لڑکی کو کار میں ڈال کر وہ لوگ فرار ہو گئے۔دکاندار دیکھتے رہے۔مکانوں کی بالکنیوں اور کھڑکیوں میں خواتین اور بچوں کے سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ہم معاملے کی سنگینی سے واقف نہ تھے اس لیئے گھر چلے گئے۔دوسرے دن اخبارات کے ذریعے معلوم ہوا کہ برابر کے ایک محلے سے ایک ''خوبرو دوشیزہ اپنے آشنا'' کے ساتھ فرار ہو گئی۔ہمارے لیئے یہ تینوں الفاظ (خوبرو، دوشیزہ اور آشنا) سمجھ سے بالا تو تھے ہی لیکن یہ بات بالاتر تھی کہ سمجھنے کے لیئے جب والد صاحب سے رجوع کیا تو ڈانٹ کیوں پڑی؟ خیر! تیسرے دن ایک اور خبر سنی کہ لڑکی کے والد نے اس خبر کے پڑھنے کے بعد خودکشی کر لی۔بات ختم ہو گئی۔ہم بھی بھول گئے لیکن کئی سال بعد جب ہم کالج میں پڑھتے تھے اور ویسے نہیں رہے تھے، تب یہ واقعہ ہمیں اکثر پریشان کرتا تھا۔

اس کے بعد بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے بہہ گیا اور ہم کالج، یونیورسٹی، ملازمت، شادی وگھرداری سے ہوتے ہوئے رٹائر ہو گئے۔اب ظاہر ہے یہ ''نصف صدی سے زیادہ کا قصہ ہے'' اس لیئے انگنت واقعات نے جنم تو لیا ہی ہوگا لیکن ہم اگر سارے دہرانے بیٹھ گئے تو کالم ہی نہیں ہمارا اپنا کام تمام ہو جائے گا۔اس لیئے

معدودے چند واقعات پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور وہ بھی اس بات کا خیال کرتے ہوئے کہ موضوع میڈیا تک ہی رہے کیونکہ اس دوران اخبارات، پھر شام کے اخبارات کے ساتھ ساتھ ریڈیو اور ٹیلی وژن نے بھی اپنا جادو جگانا شروع کر دیا اور ایک نئے نام سے کان آشنا ہوئے۔ ''میڈیا''۔ پھر کچھ عرصے تک میڈیا (ٹی وی کے علاوہ کیونکہ ٹی وی صرف سرکاری تھا) پر پابندی، سینسر شپ اور اخبارات ہی کی نہیں مالکان اور مدیران کی بندش بھی گل کھلاتی رہی۔ لیکن کب تک؟ آخر سائنس کی ترقی اور پھر کمپیوٹر، موبائل فون اور پرائیوٹ چینلوں کی بھر مار نے میڈیا کو آزادی دلا دی مگر اتفاق دیکھئے، اب بھی اکثر و بیشتر، لڑکی کا اغوا، کسی نہ کسی صورت میں، ''خوبرو دوشیزہ کا آشنا کے ساتھ فرار'' ہی ٹھہرتا ہے۔ اس دوران عدلیہ پر لگائی گئی قدغن نے میڈیا کے لیئے نئی نئی راہیں کھولدیں اور کم خرچ بالانشیں کے تحت ٹاک شوز مقبول ہونا شروع ہوئے۔ بس ایک اینکر پرسن اور تین چار مہمان۔ ایک جیسا فارمیٹ۔ اتنے ٹاک شوز کے یاد ہی نہیں رہتا کہ کس چینل سے کونسا شو آتا ہے۔ چینلز کی بہتات بھی یادداشت کو متاثر کرتی ہے۔ اس بہتات کی وجہ سے ہماری دانست میں چینلز کو قابل انکر پرسن نہیں ملتے۔ جب مہمان ایک ساتھ بولنا شروع کرتے ہیں تو بجائے کو اور ڈی نیٹ (coordinate) کرنے کے، یہ بھی اپنی آواز، ان کی آوازوں میں ملا کر ڈوئٹ (دوگانوں) کو قوالی یا کورس میں بدلنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کوشش اس لیئے کہ قوالی اور کورس میں الفاظ ایک ہی ہوتے ہیں اس لیے سمجھ میں آتے ہیں جب کہ یہاں اپنی دفلی اپنا راگ، میزبان بے بس اور سماں ''کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی'' والا ہوتا ہے۔ یہاں ایک بات اور کہ ہر پروگرام میں سوالات بھی تقریباً ایک سے ہوتے ہیں۔ بس ایسا لگتا ہے سوال نہیں تکیہ کلام ہے۔ مثلاً۔ ''اس کو آپ کیسا دیکھتے ہیں'' یا ''کیا کہیں گے آپ'' ہم نے تو یہ بھی نوٹس کیا ہے کہ میزبان اپنے الفاظ مہمان کے مونہہ میں ڈالنے کی کوشش سے بھی باز نہیں آتا۔ اگر جواب حسب منشا نہیں تو جواب پورا ہونے سے پہلے دوسرے مہمان سے سوال ورنہ شارٹ بریک تو ہے ہی۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مہمان کی آدھی بات مثلاً ''مت جاؤ نماز کی طرف'' کو قطع کلامی کر کے اسکا حتمی بیان بنا دیا جاتا ہے۔ ہم نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر کوئی لیڈر جائے وقوعہ پر نہیں گیا تو پوچھتے ہیں آپ وہاں کیوں نہیں گئے۔ ایرکنڈیشنڈ میں بیٹھے رہے۔ اور بد قسمتی سے چلا گیا تو سوال ہوتا ہے آپ کیوں گئے؟ کیا بہتر نہیں ہوتا کہ آپ کنٹرول روم میں موجود

رہتے۔ آپ کی موومنٹ کی وجہ سے خرچہ بھی ہوتا ہے اور انتظامیہ کو بھی پریشانی ہو جاتی ہے۔ بس، کیا تو کیوں کیا اور نہیں کیا تو کیوں نہیں کیا، والی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ سب سے پہلے خبر کے نشر کرنے کے چکر میں پڑ کر صحیح اور غلط کی تصدیق بھی نہیں کرتے۔ حال ہی میں ایئر بلو کے حادثے کے بعد پانچ لوگوں کے بچنے کی خبر نشر کر دی بعد میں یہ تعداد نو ہو گئی اور پھر کوئی نہیں بچا۔ اگر اس بھاگم بھاگ خبروں کا تدارک ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ مزے کی بات یہ کہ کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ 5/9 کے بچنے اور پھر کسی کے نہ بچنے کی تشریح ہی کر دیتے یا کم از کم معذرت ہی کر دیتے۔ یہ اعلان تو روز کا معمول ہے کہ ہم نے سب سے پہلے نیوز بریک کی۔ (اب غلط ہو یا صحیح یہ آپ کی قسمت)۔

سیالکوٹ کے واقعے کے بارے میں رانا ثنا اللہ نے بجا طور پر نشاندہی کی کہ اب ہمارا کلچر یہ ہی ہو گیا ہے کہ ڈاکوؤں کو مارو اور پھر لاشوں کو گھسیٹو، پولس کے حق میں نعرے لگواؤ اور پولس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کرو۔ اس میں وہاں کے ایک بڑے پولس افسر کا ہاتھ ہے جو ایسے اقدام کو بڑھاوا دیتا ہے۔ اس سے تو یہ ہی ہوا کہ لوگ اسے کار ثواب سمجھ کر کرنے لگے ہیں۔ پولس بھی تماشائی بن جاتی ہے کہ آخر میں ہمارے لیئے انعام و اکرام کی بارش تو ہو گی ہی!!! یہاں ہم یہ اضافہ ضرور کریں گے کہ ایسی ہی ایک حماقت چینلز کی بھی ہے جس نے تصاویر حاصل کرنے کہ لیئے نوجوانوں کو اکسانا شروع کر دیا ہے کہ آپ تصاویر بھیجیں ہم آپ کا نام شائع کریں گے اور آپ چینل کے دوست کے طور پر جانے جائیں گے۔ چلیئے چھٹی ہوئی۔ ہر نوجوان اپنا موبائل فون اٹھائے پھر رہا ہے کہ تصویر کھینچ کر چینل کا دوست ہونے کا شرف حاصل کر لوں۔ اب ایسے میں وہ بیچارے تصویر کھینچیں یا ظلم کو روکیں۔ ہم سے تو وہ تصویر ذہن سے نہیں بھلائی جاتی جس میں ایک بچے کو نیم مردہ حالت میں دکھایا گیا ہے جو بھوک اور پانی نہ ملنے سے اس حالت کو پہنچ گیا ہے۔ ستم یہ کہ ایک گدھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے اور فوٹو گرافر گدھ کو بھگانے اور بچے کے مونہہ میں پانی کی بوند ڈالنے کی بجائے تصویر بنانے میں محو تھا اور کیوں نہ ہوتا کیونکہ اس کی تصویر کو پورے سال کی چھ بہترین تصاویر میں سے ایک قرار پانا تھا۔ یہ مقابلہ ایک بین الاقوامی ادارے کی طرف سے تھا۔ ظاہر ہے جب ان سنی، ان دیکھی اور انہونی پر انعامات ہونگے تو بچے کو گدھ سے بچانے کون آئے گا۔ جب سیالکوٹ میں بیدردی سے ڈنڈے چل رہے ہوں تو ظلم کی تصویر بنائیں یا

مظلوم کو بچائیں۔ پولس کو انعام کی امید ہو تو کیا عقلمندی کا تقاضہ یہ نہیں کہ مظلوم کو مرنے دیا جائے۔ آخر آزادی بھی کوئی چیز ہے۔ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ ہمارا روئے سخن کسی خاص میزبان کی طرف نہیں ہے بلکہ یہ بلا استثنا سارے میزبانوں (ٹی وی کے) کے لیئے ہے۔ بحثیت ایک کالم نگار کے تو ہم یہ ہی کہہ سکتے ہیں لیکن ہم ایک قاری بھی ہیں ایک ناظر بھی ہیں اور ہماری عوامی حیثیت کا تقاضہ ہے کہ ہم کچھ اور بھی کہیں۔ مثلاً یہ میزبان حضرات ایسے سوالات کیوں نہیں کرتے جس سے کنفیوژن دور ہو جائے۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ سوالات کرتے ہیں پھر جواب سننے کی بجائے دوسرے سوال کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ مہمان جواب دیتا ہے۔ لگتا ہے معاملہ ختم ہو گیا لیکن پھر کسی دن اس ہی پارٹی کے کسی اور رکن سے وہی سوال کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال دور مشرفی یا دور پرویزی سے دیکھتے آرہے ہیں کہ پوچھا جاتا ہے آپ کی پارٹی نے بھی تو سپریم کورٹ پر حملہ کیا تھا۔ جواب میں کئی بار وضاحت کر دی گئی مگر سوال اب بھی ہوتا ہے۔ کچھ لوگ الزام لگاتے ہیں سارے سیاستداں مارشل لاء کی پیداوار ہیں جواب میں کوئی نہیں بتاتا کہ آپ کے قائد بھی تو مادر ملت، محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں ڈکٹیٹر کے ہمنوا تھے۔ محترمہ کو ہروانے کے گناہ میں کون کون شامل نہیں تھا۔ ایک کھری بات کرنے کے دعویدار میزبان نے حال ہی میں مشرف کا انٹرویو کیا مگر مشرف کے اس دعوے پر کہ وہ ہوتا تو سیالکوٹ کے واقعے پر مقتولین کے گھر ضرور جاتا، یہ کھرے صاحب پوچھنے کی ہمت نہ کر سکے کہ کیا وہ مدرسے کے ان 80 بچوں کے گھر گیا تھا جو باجوڑ میں ڈروں حملے میں شہید ہوئے تھے۔ کیا وہ ان طالبات کے لواحقین سے ملا تھا جو لال مسجد میں نذرِ فاسفورس ہو گئی تھیں۔ کیا امریکی جنرل کے اس اعتراف کے بعد کہ ڈرون حملوں میں 700 مرنے والوں میں 14 کے علاوہ باقی سب بے گناہ تھے، اس نے بقایا 686 شہیدوں کی دادرسائی کی تھی۔

ان صاحب میں اتنا بھی مورل کرج (moral courrage) نہیں کہ پوچھ سکتے کہ پاکستان آنے میں کیا چیز مانع ہے کہ دوبئ تک آکر بھی اپنے گھر نہیں آتے۔ ہوائی کمپنیوں تک کا اصول ہے کہ دوران سفر اپنے ملک کی سرزمین کو ٹچ کیئے بغیر کوئی طیارہ اپنا سفر جاری نہیں رکھتا۔ اگر آپ امریکہ سے بھی آرہے ہوں تو ٹرکش ایر لائین استنبول پر، اور امارات کا جہاز دبئ پر ضرور اترے گا۔ اس ہی طرح ہر طیارہ اپنے ملک ضرور جاتا ہے لیکن

ہمارا رٹائرڈ جنرل عرف غاصب صدر لندن سے دبئ اور وہیں سے واپس ہو جاتا ہے اور جاتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ میں کسی کے کہنے پر تو نہیں آؤنگا۔ اپنی مرضی سے آؤں گا۔ اب ہماری قوم کو چاہیے کہ اس سے کہنا چھوڑ دیں تا کہ وہ اپنی مرضی سے آسکے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔ بیچارے نے اتنے ڈکٹیشن لیئے ہیں کہ اب درخواست بھی اسے ڈکٹیشن لگتی ہے۔

۲۴ اگست ۲۰۱۰ء

بڑا آدمی

آدمی کو کیا چیز بڑا بناتی ہے؟ دولت، اقتدار، رعونت یا علم، تقویٰ، عجز و انکساری۔ اس پر کوئی حتمی فیصلہ دینے کی بجائے کیوں نہ آپ کو اپنے ساتھ گذرے ہوئے دو تین واقعات میں شامل کر لیا جائے۔ ہم اکثر اپنے شاگردوں کو لیکچرز کے دوران، تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں 'جج۔ ڈونٹ گیو ججمنٹ' (judge, Don't give Judgment). اس ہی لیئے بجائے فیصلہ دینے کے، ان واقعات پر غور کرتے ہیں۔ نتیجہ آپ خود اخذ کر لیجئے گا۔

☆ یہ ان دنوں کی بات ہے جب محسن پاکستان ڈاکٹر اے۔ کیو۔ خان باہر نکلتے تھے تو بڑے رینک کا کوئی افسر ان کا بریف کیس اٹھانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ ہم اسلام آباد سے آ رہے تھے۔ کراچی ائیر پورٹ پر ہم جہاز کی اکانومی کلاس سے نکل رہے تھے کہ ہمارا سامنا ڈاکٹر خان صاحب سے ہوا جو فرسٹ کلاس سے نکل رہے تھے۔ پیچھے ایک فوجی افسر بھی تھا۔

ہم نے اضطراری طور پر سلام کے لیئے ہاتھ اٹھا دیا اور ایک طرف ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے سلام کا جواب ہی نہیں دیا بلکہ ہماری طرف بڑھے اور مصافحے کے لیئے ہاتھ بڑھا دیا۔

☆ ہمیں یہ معلوم کرنے کی جستجو ہے کہ کیا وجہ تھی کہ قائد کو لینے وزیر اعظم یا کوئی اہم شخصیت موجود نہ تھی اور کیا وجہ تھی قائد کی گاڑی خراب ہوئی یا اسکا پٹرول ختم ہو گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ بات اگر کوئی بتا سکتا ہے تو وہ سید ہاشم رضا ہی ہو سکتے ہیں جو اس زمانے میں شائد کراچی کے کمشنر یا میئر تھے (ٹھیک سے یاد نہیں)۔ ان سے توقع رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ سید صاحب ہماری کمپنی کی ڈسٹری بیوشن کے 'M.D.' تھے۔ ہم ملنے کا سوچتے ہی رہ گئے اور وہ رٹائر ہو گئے۔ ظاہر ہے ۸۰ برس سے زیادہ کے ہو چکے تھے۔ اب اسے اتفاق کہئے کہ کڈنی سیٹر (Kidney Centre) کی ایک تقریب میں چائے کے وقفے میں ہاشم صاحب نظر آئے جو کسی خاتون سے محو گفتگو تھے۔ ہم نے دوسرے لوازمات کی قربانی دیتے ہوئے فقط چائے کی پیالی سنبھالی اور قریب پہنچ کر سلام

کیا۔ انہوں نے ہماری طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور پھر مصروف گفتگو ہو گئے۔ ہم نے چند لمحے ان کے متوجہ ہونے کا انتظار کیا لیکن انہوں نے اپنے مخصوص اسٹائل میں آنکھیں بند کر لیں اور ان کا مونولاگ (Monologue) جاری رہا۔ خاتون کی پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی لیکن گلو خاصی مشکل تھی۔ ہم بھی آخر سمجھدار ہیں اس لیئے علم کی پیاس بجھائے بغیر بھوک مٹانے اس میز پر دوبارہ پہنچ گئے جہاں چند پیسٹریاں اب بھی محو انتظار تھیں۔ اگر ہاشم صاحب اس دن ہمیں دو منٹ دیدیتے تو ہمیں اپنے سوال کا جواب مل جاتا جو، اب شائد کبھی نہ ملے۔ بہر حال ہاشم صاحب نے ہمیں اس قابل نہیں سمجھا کہ سلام کا جواب ہی دیدیتے۔

☆ ہم نے جب کچھ مضامین انگریزی میں اور کچھ اردو میں لکھ لیئے تو شوق ہوا کہ ان کو اپنے لیئے وجہ شہرت بنائیں۔ ہم نے اخبارات سے کالم نویسوں اور اڈیٹروں کے ای میل اڈریس لیئے اور اپنے مضامین ارسال کر دیئے۔ نام لکھنا مقصود نہیں لیکن سارے ہی نامی گرامی کالم نویس اپنے کالموں میں لکھتے رہتے ہیں کہ ''فلاں نے ای میل لکھا ہے۔۔ یا یہ بتایا ہے۔ یا ایک صاحب رقم طراز ہیں۔'' لیکن افسوس کسی نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اکثر و بیشتر تو ای میل ڈیلور ہی نہیں ہوئی۔ اللہ جانے یہ لوگ اپنا ای میل اڈریس ہر کالم کے ساتھ کیوں چھپواتے ہیں۔ ان میں سے کئی تو اب اینکر پرسن بھی ہیں اور وہاں بھی خطوں، ای میلوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے یہ ساری چیزیں پڑھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ کالم نویس بڑے آدمی ہوں اور چھوٹوں کو مونہہ لگانا پسند نہ کرتے ہوں یا ہوسکتا ہے عدیم الفرصت ہوں۔

☆ ہم نے اپنے تین چار مضامین نوائے وقت کے جناب مجید نظامی صاحب کو بھجوائے۔ تیسرے ہی دن انہوں نے جواب دیا تعریف بھی کی اور مضامین اپنے ریزیڈنٹ اڈیٹر کو بھجوا دیئے تا کہ شائع ے جا سکیں۔ شائد کئی اخبارات کے چیف کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔

☆ ہماری جب پہلی کتاب شائع ہوئی تو کئی دوستوں اور کرمفرماؤں کو بھجوادی۔ کتاب بھیجنے کے تین چار دن بعد ڈاکٹر اے کیو خان صاحب نے بذریعہ 'SMS' کتاب کا شکریہ ادا کیا جب کہ کئی دوستوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ کتاب مل گئی ہے۔ چند ایک ہم عصروں سے خود ہی پوچھا تو جواب تھا 'یار فرصت ہی نہیں ملتی'

☆ ہم نے اپنی دوسری کتاب کی تیاری شروع کی تو ڈاکٹر صاحب کا ای میل اخبار سے لیا اور ڈرتے ڈرتے اپنے چند کالم اس درخواست کے ساتھ بھجوا دیئے کہ ان پر اپنا تبصرہ مرحمت فرمادیں۔ جواب نہ ملا تو ایس ایم ایس کیا۔ ایک منٹ بعد جواب میں اپنا ای میل اڈریس بھجوادیا۔ اس اڈریس پر بھجوانے کے کچھ دیر بعد جواب آیا کہ آپ کے مضامین مل گئے ہیں انشااللہ جلد جواب دونگا۔ جب کافی وقت ہوگیا تو ہم نے یاددہانی کے لیئے ایک ایس ایم ایس کیا جس کا جواب فوراً ہی آ گیا کہ ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے تاخیر ہوئی انشااللہ دو ایک دن میں بھجوادونگا۔ طبیعت کا سن کر ہمیں بے چینی ہوئی اور ہم نے پہلی بار (حالانکہ ایک سال سے ان کا نمبر ہمارے پاس ہے) انہیں فون کیا۔ معلوم ہوا اللہ کے فضل سے اب بہتر ہیں اور انکے معالج بھی وہیں بیٹھے ہیں۔ پھر فرمایا کہ جلد ہی تبصرہ بھجوادونگا۔ یقین جانیئے کہ ان سے بات کر کے جو خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔

رٹائر ہونے سے پہلے ہم اکثر اپنے ساتھیوں سے اور اب اپنے شاگردوں سے کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ عدیم الفرصت وہ ہوتا ہے جسے کوئی کام نہ ہو۔ واقعی ایسا ہے بھی کیونکہ جب ہم رٹائر نہیں ہوئے تھے تو اپنا کام بھی کرتے تھے اور دوسروں کا بھی ہاتھ بٹاتے تھے۔ اکثر لوگ کبھی کوئی پرابلم لیکر آجاتے۔ اب ہم چاہے کتنا ہی اہم کام کیوں نہ کر رہے ہوں انکار نہیں کرتے۔ انگریزی میں ہم اندھوں میں کانے راجہ تھے اس لیئے اکثر اصحاب اپنے ڈرافٹس کے لیئے ہم سے ضرور رجوع کرتے تھے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ بعد رٹائرمنٹ کی زندگی کے دوران ہم اتنے عدیم الفرصت ہوئے کہ کوئی کام ہی نہیں کرتے تھے سوائے سونے کے۔ اخبار پڑھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ وہ تو بھلا ہو کہ یونیورسٹی نے کچھ پیریڈز لینے کے لیئے بلوالیا تو کام شروع ہوا اور پھر اخبار ہی نہیں دوسرے مشاغل کی بھی فرصت مل گئی۔ لوگ جب وقت کی کمی کا رونا روتے ہیں تو ہمارا کہنا ہوتا کہ ہر ایک کے پاس 24 گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہوتے۔ لیکن بڑے لوگ وہ وہ کام کر جاتے ہیں جو ہم اس سے دگنے وقت میں بھی نہیں کر سکتے۔ مولانا مودودی کو ہم نے اپنے ایک دوست کے گھر دیکھا تھا کسی جلسے کے لیئے حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ جلسہ اٹینڈ کیا۔ پارٹی میٹنگ کی صدارت کی۔ نمازیں بھی پڑھتے رہے۔ رات کو دیکھا تو لکھنے پڑھنے میں مشغول تھے۔ نہ جانے کتنی کتابیں لکھی۔

'تفہم القران' کے چھ جلدیں بھی دیں۔ مجرد بھی نہیں تھے۔ بیوی بچوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ گھنٹے چوبیس ہی تھے۔ اور کتابوں کا ذکر چھوڑیئے۔ قرآن کی تفسیر کوئی آسان کام نہیں۔ نہ جانے کتنے علماء کو پڑھا ہوگا۔ نہ جانے کتنی ریسرچ کی ہوگی۔ تو کیا دوسرے کام چھوڑ دیئے تھے۔ مولانا کی مثال ہم نے اس لیئے دی کہ ہم ان کی قابلیت سے تو متاثر ہیں لیکن سیاسی اختلاف ہمیشہ سے ہی رہا ہے۔ اس لیئے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ جماعتی ہونے کی وجہ سے مولانا کی تعریف کر رہے ہیں۔ ہم نے چند مثالیں پیش کردی ہیں۔ ویسے آپ کے اردگرد چھوٹے بڑے دونوں طرح کے لوگ موجود ہیں بس پرکھنے کی بات ہے۔ ہماری نظر میں بڑا وہ ہے جس کے پاس علم، عمل، اخلاق، انکساری ہے۔ چھوٹا ہونے کے لیئے اخلاق کا فقدان، رعونت کی بھرمار، علم کی کمی اور عمل سے دوری کافی ہے۔

۱۰ اگست ۲۰۱۰ء

ان ٹولرنس

کل رات ہم اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ ایک صاحب نے نہ جانے کیوں ایک عجیب سوال کر دیا۔ ہمیں ایسے کسی سوال کا قطعی گمان نہ تھا۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ یہ سوال اٹھانے والے صاحب نہایت سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں اور اختلافی مسائل میں الجھنے سے پرہیز کرتے ہیں جبکہ ہم ہر مسئلے پر گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم گفتگو کو علم تک محدود رکھتے ہیں۔ جذباتی نہیں ہوتے۔ اس لیئے غصے میں بھی نہیں آتے۔ دلائل دینا اور سننا پسند کرتے ہیں۔ مذہب پر بات ہو رہی ہوتی ہے تو اللہ کے حکم کو جو اس نے قرآن میں فرما دیا ہے، اولیت دیتے ہیں۔ وہاں سے اگر کچھ سمجھ نہیں آتی تو احادیث کا سہارا لیتے ہیں لیکن کسوٹی قرآن کو ہی رکھتے ہیں کوئی بھی چیز قران کے منافی نہیں ہونی چاہیئے۔

اگر کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جسے علماء نے الجھا دیا ہو تو ہم وہ حل قبول کرتے ہیں جس میں انسانیت کی بھلائی ہو اور جو اللہ کی وحدانیت اور رسول ﷺ کی عظمت سے متصادم نہ ہو۔ اپنے اس مختصر سے تعارف کے بعد اس سوال کی طرف آتے ہیں جو ہمارے دوست نے کل پوچھا تھا کہ آپ کا کس مسلک سے تعلق ہے۔ ہم نے فوراً جواب دیا کسی سے بھی نہیں پھر قائداعظم کا وہ جواب دہرا دیا جو انہوں نے ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں کسی صحافی کو دیا تھا کہ میں ویسا ہی مسلمان ہوں جیسے خلفء راشدین کے زمانے میں ہوتے تھے۔ سن کر کہنے لگے میں تو فلاں مدرسے کا حامی ہوں۔ آپ دیوبندی ہیں یا بریلوی؟ ہمارا جواب تھا ہم نہ دیوبند میں پڑھے ہیں نہ بریلی میں۔ ہم ایک کونوینٹ اسکول 'سینٹ بوناونچر' میں پڑھے ہیں اس لیئے آپ کے حساب سے تو بونا ونچرین ہوئے۔ بحث آگے بڑھی تو ہم نے محسوس کیا دوسرے حضرات کا، جو کسی نہ کسی مسلک کے حامی تھے، برداشت کا لیول کم ہو رہا ہے۔ اس لیئے ہم نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ آپ کو علم ہے کہ ہم کیوں ایسے مباحثوں سے ناراض نہیں ہوتے؟ وجہ یہ ہے کہ اتفاق سے ہمارے کلاس فیلوز میں مسلم، ہندو، عیسائی تو تھے ہی لیکن ایک پارسی ایک قادیانی کے علاوہ دو یہودی بھی تھے۔ مسلمانوں کے تقریباً سارے ہی مسلک کے لڑکے تھے۔ شیعہ، سنی، بوہری، آغا خانی، اسماعیلی خوجوں کے علاوہ، عیسائیوں کے دو بڑے فرقے، پروٹسٹنٹ

اور رومن کیتھولک بھی تھے۔ ایک ہندو برہمن تھا اور ایک کمتر ذات کا۔ یہ اتفاق تھا پارسی اور یہودیوں کے فقط ایک ایک ہی فرقے سے واسطہ رہا۔ جبکہ یہ بھی فرقوں کے معاملے میں خود کفیل ہیں۔ قادیانیوں کا ہمیں علم نہیں کہ وہ ہم سے کتراتے تھے اور ایسے مباحثوں سے بھاگتے تھے۔ جب کہ دوسرے تمام لوگ ہم سے الجھتے اور مونہہ کی کھاتے رہے۔ ہم گرچہ نہ روزہ نماز کے پابند تھے نہ کوئی خاص مذہبی لیکن مباحثوں میں سب کو زچ کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چونکہ عیسائی ہمارا خاص نشانہ تھے اس لیئے آئے دن اسکول کے پرنسپل کے سامنے پیشی رہتی جو خود رومن کیتھولک تھے۔ اس لیئے سزا بھگتتے رہتے۔ ان مباحثوں سے ہماری دیگر مذاہب کے بارے میں معلومات میں گراں قدر اضافہ تو ہوا ہی لیکن قوت برداشت میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ ہم کبھی غصے میں نہیں آئے لیکن مخالف کو اتنا زچ کرتے کہ وہ نیم دیوانے ہو جاتے اور وہی ہماری جیت ہوتی۔

ہمیں یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ ہمارے کلاس فیلوز میں پاکستان کی تقریباً ہر زبان بولنے والا موجود تھا۔ اردو، سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتو، گجراتی، انگریزی، کاٹھیاواڑی وغیرہ لیکن کبھی بھی زبان کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ اسکول میں کوئی بنگالی نہ تھا لیکن یونیورسٹی میں ان کا بھی ساتھ رہا۔ بھائی چارے کی جو فضا ہم نے اسکول میں دیکھی وہ پھر ہمیں نصیب نہ ہوئی کہ کالج اور یونیورسٹی میں لسانیت اہم ٹھہری۔ وہاں دوستیاں اور الیکشن زبان کی بنیاد پر ہوتے۔ کالج اور یونیورسٹی میں مذہب کی اہمیت گھٹ گئی وہاں ہم زبان غیر مذہب کا بندہ زیادہ قریبی تھا۔ اس لیئے وہ نوک جھونک جو ہم اسکول میں کرتے آئے تھے اب عنقا ہوئی۔ اسکول میں عیسائیوں سے یہ بحث رہتی کہ مسلمان جلد طیش میں آجاتے ہیں جبکہ ہم یہ ثابت کر دیتے تھے کہ ہم تو کبھی بھی طیش میں نہیں آئے جب کہ آئے دن وہی لوگ شکایت لے کر پادری کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ خاص کر اس وقت ان لوگوں کی حالت دیدنی ہوتی جب ہم سوال اٹھاتے کہ وہ کوئی ایک واقعہ ایسا بتا دیں جس میں کسی مسلمان نے کسی عیسائی یا ہندوؤں کے خلاف کوئی سازش کی ہو، جیسا کہ لارنس آف عربیا نے کیا تھا یا ان دو یہودیوں کی طرح حضور ﷺ کے روضہ مبارک تک پہنچنے کی کوشش کی تھی یا اس ہندو کی طرح حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کی تھی جسے علم دین نے قتل کر دیا تھا۔ کیا کبھی کسی مسلمان نے پوپ کی بے عزتی کی کوشش کی؟ کیا کبھی کسی ہندوؤں کے اوتار کا کارٹون بنایا۔ کیا کبھی کسی کے بزرگ کے خلاف کوئی کتاب لکھی۔ جبکہ یہ کام عیسائی ہندو اور یہودی

کرتے رہتے ہیں۔ جب مسلمان ری ایکشن میں کچھ کرتے ہیں تو انہیں ان ٹولرنس کا طعنہ سہنا پڑتا ہے۔ گالی دینے والے کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ گالی دینے والے کو برا کہنا جرم ٹھہرتا ہے۔ مارنے والے کو آزادی ہے لیکن ہاتھ پکڑنے والا خطاوار۔۔

افسوس تو اس وقت ہوتا ہے جب ہمارے نام نہاد دانشور حضرات بھی یہ ہی راگ الاپتے ہیں۔ ان کی دانشوری کسی تحقیق پر نہیں بلکہ غیروں کی ہاں میں ہاں ملانے میں ہے۔ اگر سب کو چھوڑ کر صرف بھارت پر ہی تحقیق کر لیں تو پتا چل جائے گا ہندوؤں نے کتنے منظّم حملے مسلمانوں پر کیئے، کتنے سکھوں پر اور کتنے عیسائیوں کے علاوہ کتنے نچلی ذات کے ہندوؤں پر کیے۔ جبکہ پاکستان میں ایک بھی ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا، جس میں کسی نے کسی چرچ یا مندر پر بلا وجہ کوئی حملہ کیا ہو۔ ہاں کسی اشتعال کے ری ایکشن میں ضرور ایسا ہوا ہے لیکن وہاں بھی حکومت نے حفاظت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جبکہ بھارت میں بھارتی وزیروں کے اشتعال انگیز بیانات گواہی دیں گے کہ وہاں سب کچھ حکومت کی ناک کے نیچے ہی ہوتا ہے۔ مثال کے لیئے بابری مسجد کے علاوہ گجرات کے واقعات کافی ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے بنارس میں مسلمانوں کے قتل عام پر اگر گاندھی کا کوئی مذمتی بیان کسی نام نہاد دانشور کے رکارڈ میں ہو تو اسے پہلی فرصت میں شائع کروا کر ثواب دارین حاصل کر لے ورنہ گاندھی کی منافقت کا بھانڈا پھوڑ کر اپنے گناہوں کا کفارہ تو ادا کر ہی دے۔۔۔۔

۴ ستمبر ۲۰۱۰ء

کوئیک (QUACK)

کہتے ہیں بات سے بات نکلتی ہے۔ شروع کہیں سے ہوتی ہے اور اختتام پذیر کہیں اور ہوتی ہے۔ درمیان میں کئی شگوفے کھلتے ہیں اور ان تمام باتوں کا تجزیہ کیا جائے تو عموماً ان باتوں میں کوئی ربط نہیں ملے گا۔ سنی سنائی پر یقین کرنے کا دل نہیں مانتا اس لیئے ہم نے سوچا کہ کیوں نہ تجربہ کر لیا جائے اور اگر کہیں اس کو غلط ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ایک مقالہ لکھ لیں گے اور داؤ لگ گیا تو پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لیں گے پھر حقیقتاً ''ڈاکٹر کیفی'' کہلوانے میں کیا چیز مانع ہو سکے گی۔ ابھی کچھ لوگ ہمارے فارماسیوٹیکل کیریئر (دوائیں کی کمپنی میں ملازمت) کی وجہ سے ہمیں ڈاکٹر کہہ کر پکارتے ہیں تو ہمیں غصے کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی ہوتی ہے کہ ناحق یہ اعزاز گلے پڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے کوئی وزیر مشیر تو ہیں نہیں کہ شرمندگی بھی محسوس نہ کر سکیں اور غصہ اس لیے آتا ہے کہ اس نقلی ڈاکٹری کے القاب میں ہماری اصلی ڈگری (جو ڈاکٹری سے کسی طور کم نہیں) گہنا جاتی ہے۔

خیر ہم نے تجربے کے لیئے قدرت اللہ شہاب کی 'شہاب نامہ' سے ایک واقعہ لیا اور پھر واقعی بات سے بات نکلتی گئی اور اختتام تک پہنچتے پہنچتے ہم اس کالم کے عنوان تک پہنچ گئے۔ درمیان میں جو کچھ (بقول ہمارے) شگوفے کھلے وہ تو آپ پڑھ ہی لیں گے۔ منتخب واقعہ شہاب صاحب کی جوانی کا ہے جب وہ محترم حسین شہید سہروردی مرحوم سے اپنے ایک کام کے سلسلے میں ملے تھے۔ پاکستان ابھی بنا نہیں تھا۔ انگریز کی عملداری میں خواجہ ناظم الدین وزیر اعلیٰ اور سہروردی صوبائی وزیر تھے۔ پاکستان بننے کے بعد دونوں وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز رہے۔ ناظم الدین صاحب سازش کا شکار ہو کر برطرف اور سہروردی صاحب مستعفی ہوئے۔ سہروردی کے مستعفی ہونے کی کہانی بھی خوب تھی۔ کہتے ہیں حیدرآباد کے دورے پر آئے تھے۔ تقریر کے دوران عوام نے مخالفانہ نعرے بازی کی۔ واپسی میں ایک جگہ بھینسوں کا ریوڑ سڑک سے گذر رہا تھا (اس زمانے میں ایسے یوڑ عام تھے)۔ وزیر اعظم کے کارواں کو رکنا پڑا۔ کچھ منچلوں کو موقع ملا اور انہوں نے گاڑی کو

گھیر کر نعرے بازی شروع کردی۔ وزیراعظم نے غیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شائد دوسرے دن ہی استعفا پیش کردیا۔ اب شکر ہے ایسا نہیں ہوتا۔ شہاب صاحب کے واقعے سے پہلے سہروردی کے کردار کا بتانا ضروری سمجھتے ہوئے ایک اور بات بتادیں۔ ایک دفعہ سہروردی بیمار تھے ان کی پارٹی کے ایک نوجوان کارکن، شیخ مجیب الرحمٰن، جو بعد میں بنگلہ دیش کی علیحدگی میں ایک موثر کردار بنا، سہروردی کے پاؤں دبا رہا تھا۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کی بات کر بیٹھا۔ بیمار سہروردی نے یہ سنتے ہی ایسی لات جمائی کہ مجیب نیچے گر گیا۔ افسوس ایسے محبِ وطنوں کی پاکستانیوں نے قدر نہیں کی۔ ہمارے نئی پود تو ان ناموں سے ہی واقف نہیں۔ لطف یہ کہ اکثر ٹی وی پر سنتے ہیں کہ آج مینا کماری کو ہم سے بچھڑے اڑتیس سال ہو گئے ہیں یا فلاں بھارتی اداکار کو گذرے اتنے سال ہو گئے ہیں لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ خان عبدالقیوم خان کو بچھڑے کتنے برس ہو چکے ہیں یا مولانا اشرف تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، فیروز خان نون، یا محترمہ مریم (رتی) جناح کو گذرے کتنے سال ہو چکے ہیں۔ نام تو بہت ہیں لیکن کالم کو ہم کالم ہی رکھنا چاہتے ہیں، جواب مضمون نہیں، اس لیئے اس مختصر جائزے کے بعد بتاتے چلیں کہ جب شہاب صاحب سہروردی سے ملنے پہنچے تو انہوں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے شہاب صاحب سے نام پوچھا۔ شہاب صاحب نے بتایا تو فرمایا بھئی ایسے نہیں ہجّے کر کے بتاؤ۔ شہاب صاحب نے انگریزی میں بولنا شروع کیا Q,U,D,R,A,T ۔قدرت۔۔سن کر لکھنا چھوڑ کر کہا غلط۔ کیو (Q) کے بعد ہمیشہ دو حروف علت (VOWEL) آنا ضروری ہیں۔ تم کیو (Q) کی بجائے کے (K) سے لکھا کرو۔ ہم نے یہ پڑھا تو ہماری انگریزی دانی کو جھٹکا لگا اور ہم نے ڈکشنری نکال لی۔ پوری کیو (Q) کی فہرست دیکھی تو معلوم ہوا واقعی ایک بھی لفظ ایسا نہ تھا جس میں 'کیو' کے بعد دو حروف علت نہ آتے ہوں۔ مزید غور کیا تو معلوم ہوا 'کیو' کسی بھی طور 'ق' کا نعم البدل نہیں۔ مثلاً کوئین 'کیو' سے لکھا جاتا ہے لیکن آواز 'ک' کی ہی نکلتی ہے۔ مزید چھان پھٹک میں ایک اور لفظ ''کوئیک'' (QUACK) سے ہوئی جس کے معنی ہیں نیم حکیم یا عطائی یعنی جعلی ڈاکٹر۔ یعنی وہ لوگ جن کے پاس ایم بی بی ایس کی ڈگری نہیں ہوتی لیکن وہ مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ یہاں ایک اور سوال ذہن میں اٹھ رہا ہے کہ جعلی ڈاکٹر کو کوئیک کہا جاتا ہے تو کیا جعلی پی ایچ ڈی کو بھی کوئیک کہہ سکتے ہیں۔ اس کا صحیح جواب تو کوئی M.B.B.S یا Ph.D ہی

دے سکتا ہے۔ اس کے لیئے میڈیا کو چاہیئے ایک مناظرے کا انتظام کرے۔ شرکاء کے لیئے ہم چند نام گنوا دیتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ شرکت سے پہلے ان کی ڈگریوں کی تصدیق ہائیر ایجوکیشن سے کروالی جائے تاکہ دوران گفتگو کوئی بھی کسی کو جعلی ڈگری ہولڈر کا طعنہ دے کر محفل کو بدمزہ نہ کر سکے۔ ایسا ہم صرف حفظ ماتقدم کے لیئے کہہ رہے ہیں ورنہ ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر عامر لیاقتِ ڈاکٹر بابر اعوان کی پی ایچ ڈی اور ڈاکٹر شیر افگن وڈاکٹر فردوس اعوان کی ایم بی بی ایس پر کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ نام تو اور بھی ہیں لیکن ہم ان پانچ کو اس لیئے پیش کر رہے کہ ان سب کو دلائل کو اپنے حق میں کرنے کا فن خوب آتا ہے۔ اگر یہ مناظرہ کامیاب ہوا تو یہ طے ہو جائے گا کہ جعلی پی ایچ ڈی کو کوئیک کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔ پھر انشااللہ ہم بھی ڈاکٹر آف فلاسفی ہو جائیں گے

۶ ستمبر ۲۰۱۰ء

زیرِحکمرانی سے زیرِتعلیم تک

ہمارے کالموں کا مجموعہ، کتاب کی شکل میں ڈھلنے کے لیے پریس میں ہے۔ہم نے سوچا اب مزید کالم نہ لکھے جائیں کیونکہ جب کالم لکھ لیتے ہیں تو خواہش ہوتی ہے کہ اسے بھی کتاب میں شامل کر لیا جائے۔ارادہ تھا کہ سو کالم شامل کریں گے لیکن اب سو سے اوپر ہو چکے ہیں اس لیئے تہیہ کرلیا کہ اب کچھ دن کے لیئے وقفہ!! لیکن برا ہو کہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے جو لکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔آج بھی ایسا ہی ہوا۔آج لکھنے کی محرک دو خبریں ہیں۔پہلی خبر ریاست فلوریڈا کی انتظامیہ سے متعلق ہے جس نے ملعون پادری کی شیطانی حرکت پر پابندی لگادی ہے۔امریکی صدر نے بھی پادری نما شیطان ٹیری جونز کے ارادوں کی مذمت کی ہے۔بظاہر یہ مستحسن قدم ہے اور ہمیں، ایک کمزور حکومت کے زیرِ حکمرانی قوم ہونے کے ناطے فلوریڈا کی انتظامیہ کا ہی نہیں امریکی صدر کا بھی مشکور ہونا چاہیئے کہ انہوں نے پادری نما شیطان کو مقدس کتاب کے نسخوں کو جلانے سے روک دیا۔اگر ہماری حکومت مضبوط ہوتی تو ہم امریکہ کی ناک میں نکیل ڈال کر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے بالکل اس طرح جیسے ایک چھوٹے سے ملک نے اپنے ایک بے گناہ شہری کو ٹرین میں گولی مارنے پر برطانیہ کو معافی مانگنے پر مجبور کر دیا تھا۔جبکہ ہم، امریکی جنرل کے اس اعتراف کے بعد کہ ڈرون حملوں کے نتیجے میں مرنے والے ۷۰۰ افراد میں سے فقط ۱۴ دہشت گرد تھے، امریکہ کو اب تک معافی مانگنے پر مجبور نہ کر سکے۔امریکی صدر اور فلوریڈا کی انتظامیہ کے ان اقدامات پر ہمارے مجبوراً مشکور ہونے کی وجہ نہایت واضح ہے۔فلوریڈا کی انتظامیہ نے شیطان پادری کے قران پاک کے مقدس نسخوں کو جلانے کے ناپاک منصوبے پر پابندی اس لیئے لگائی ہے کہ وہاں فائر آرڈیننس کے تحت کسی بھی عام مقام پر آگ جلانے کی ممانعت ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسے کسی آرڈننس کی غیر موجودگی میں شیطان پادری کے منصوبے کی تکمیل میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔فلوریڈا کی ریاست نے مسلمانوں کے جذبات کا نہیں اپنے آرڈیننس کا احترام کیا امریکی صدر نے بھی اپنے بیان میں قران کی حرمت اور مسلمانوں کے جذبات کا احترام

نہیں کیا بلکہ اس مذمتی بیان کی وجہ یہ خوف بتایا کہ ایسے کسی واقعے کے بعد القائدہ کے لیئے بھرتیوں میں آسانی پیدا ہو جائے گی جس سے خودکش حملوں میں شدت پیدا ہو سکتی ہے۔اگر ایسا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو شائد امریکی صدر شیطان پادری کی پیٹھ تھپ تھپاتے ہوئے کہتا۔ع

'ہم شیطان کے چیلے ہیں، کرو مشق سخن اور'

دوسری خبر زیرِ حکمرانی سے متعلق تو نہیں لیکن آدابِ حکمرانی سے ضرور ہے۔یہ خبر ہماری توجہ مبذول نہ کراتی لیکن یہ ہمارے ایک کلاس فیلو طارق لغاری کے چھوٹے بھائی جاوید لغاری چیرمین، ہائیر ایجوکشن کمیشن سے متعلق ہے اس لیئے چونکنا پڑا۔اس خبر کے بموجب چیرمین اور وفاقی وزیرِ تعلیم کے درمیان اختیارات کی جنگ مزید شدت اختیار کر گئی۔تعجب ہوا!! جاوید اور جنگ!! جاوید تو بہت ہی پڑھا لکھا ہے۔قانون سے بھی واقف ہے۔والد جج تھے۔والدہ نے تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔تین بھائی اور ایک بہن، سب اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی بات خلاف قانون کر جائے۔پوری خبر پڑھی تو فریقین کا موقف سامنے آیا۔وزیر تعلیم بضد کہ انہیں بریفنگ ملنی چاہیئے کیونکہ ماضی میں ایسا ہوتا آیا ہے جبکہ چیرمین کا کہنا ہے کہ وہ بریفنگ دینے کے پابند نہیں اور نہ ہی دیں گے۔چیرمین کا کہنا ہے

وہ وزیراعظم کو جوابدہ ہیں جبکہ وزیرِ تعلیم کہتے ہیں ہائیر ایجوکیشن وزارت تعلیم کے تحت ہے۔اب اس میں جھگڑا کیا ہے۔اگر آئین وضاحت نہیں کرتا تو وزیراعظم کو چاہیئے کہ طے کر دیں۔قانونی بات کرنے کی بجائے وزیر تعلیم ماضی کے حوالے دے رہے ہیں تو کیا ماضی میں کی گئی تمام باتوں کو پری سی ڈینٹ (precedent) بنایا جا سکتا ہے۔

کیا ماضی میں سب کچھ قانون کے تحت ہوتا تھا۔اگر ہوتا تو آج یہ مسئلہ پیدا ہی کیوں ہوتا؟ برا ہو جعلی ڈگریوں کا، جن کو تحفظ دینے میں عزت سادات بھی جا رہی ہے لیکن کوئی پرواہ نہیں کر رہا۔وزیرِ تعلیم کو جمشید دستی کے علاوہ چند اور جعلی ڈگری ہولڈروں کے طشت از بام ہونے کے بعد اختیارات کیوں یاد آئے۔بریفنگ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔جعلی ڈگریوں کے معاملے میں مسلم لیگ نون نے صحیح راہ اختیار کی کہ

''گرتی ہوئی دیواروں کو ایک دھکا اور دو''

TALKH.jpg not found.

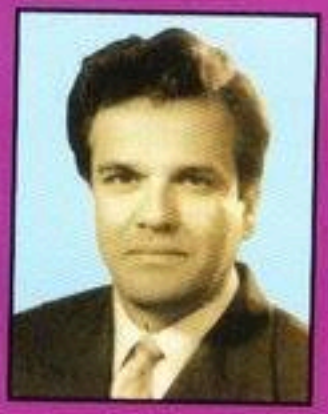
جبکہ وزیرِ تعلیم ان دیواروں کے ساتھ چمٹ کر وزیرِ تعلیم کی بجائے اپنے زیرِ تعلیم ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ دیوار تو گرنے سے بچے گی نہیں لیکن زیرِ دیوار جو بھی ہوگا اس کا حشر سب کو معلوم ہونا چاہیئے۔

۱۰ ستمبر ۲۰۱۰ء



جناب ڈاکٹر عبدالقدیر خان، محسن پاکستان

جب جناب فخرالدین کیفی کے چند کالم پڑھے تو میں ان سے بہت متاثر ہوا۔ یہ نہایت سلیس، سادہ اور شستہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ کوزہ میں دریا بند کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں پاکستان اور پاکستانی عوام سے بے انتہا محبت کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ زہر ہلاہل کو کسی قیمت پر بھی قند نہیں کہتے اور اپنا ضمیر صاف رکھتے ہیں۔ عموماً کالم نگار کسی چھوٹی بات کو دُم چھلے لگا کر پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔ فخرالدین کیفی صاحب بڑی بات کو مختصر الفاظ میں بیان کر کے آپ کی توجہ کو اس طرح مبذول کر لیتے ہیں کہ کالم ختم کیے بغیر آپ کی تسکین نہیں ہوتی۔



مصنف کا تعارف

(غیر معروف کے لیے ضروری ہے)

نام	فخرالدین صدیقی
قلمی نام	فخرالدین کیفی
جائے پیدائش	بمبئی، برٹش انڈیا
تاریخ پیدائش	۱۵ جون ۱۹۴۴
تصدیق شدہ تعلیم	بی ایس سی (آنرز)۔ ایم ایس سی۔ ڈی بی اے (حلفیہ اصلی ڈگریاں)
کیفیت	ریٹائرڈ
سروسٹ	بحیثیت وزٹنگ فیکلٹی یونیورسٹی میں لیکچرر شپ
مشاغل	پڑھنا۔ لکھنا اور پڑھانا
پہلی کتاب	ایک غیر مطبوعہ کتاب
زیر نظر کتاب	۱۔ تلخ نوائی (مطبوعہ و غیر مطبوعہ کالموں کا مجموعہ)
منتظر اشاعت	۲۔ تحریر ممنوعہ (ہلکے پھلکے مضامین اور بیتے ہوئے لمحات کی یادیں)

RAJAB PRINTING PRES
Bhai Khan Chari Hyd. Cell: 0333-2